خوشبو
سعیدہ خاتون عظیمی
www.azeemisoul.blogspot.com
www.facebook.com/azeemisoul

سعیدہ خاتون عظیمی

الکتاب پبلیکیشنز A-645، بلاک H، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔
فون: 021-6039157

اشاعت .... مئی 2009ء

تعداد .... 1000۔

قیمت 200/

ڈیزائننگ/کمپوزنگ .... اقبال لیزر کمپوزنگ۔ کراچی
فون : 7763165

پرنٹر .... العین پرنٹرز، ناظم آباد نمبر 2 کراچی

الکتاب پبلیکیشنز A-645، بلاک H، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

فون: 021-6039157

عنوانات

عنوانات

پیش لفظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

"ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ والدین اور متعلقین اسے عیسائی، یہودی بنا دیتے ہیں۔"

دنیا کا ہر باسی جانتا ہے کہ پیدائش کے بعد سب سے پہلا شعوری نقش بچہ کے اوپر صفائی اور ستر پوشی کا قائم ہوتا ہے۔ بچہ کو نہلا دھلا کر اسے صاف ستھرے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ بچہ کے شعور پر دوسرا نقش یہ رقم ہوتا ہے کہ اس کے کان میں بھجن گایا جاتا ہے۔ گھنٹی اور مزمور کی آواز سنائی جاتی ہے اور بپتسمہ دیا جاتا ہے۔ اسلام میں بچہ کے دونوں کانوں میں اذان اور تکبیر پڑھی جاتی ہے۔ شعور پر تیسرا نقش جو گہرا ہوتا ہے وہ ماں، باپ، دادا، دادی، نانا اور نانی کا ذہن ہے۔ ذہن کا مطلب ہے طرز فکر اور کردار۔ پھر بتدریج والدین، خاندان، کنبہ، برادری اور ماحول کے اثرات مرتب ہوتے

ہیں۔ یہ ساری کارروائی بارہ سال کی عمر تک تقریباً" پوری ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچے کو انفرادی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ خاندان' ماحول اور والدین کی افتاد طبیعت کے امتزاج کے ساتھ اپنے لئے ایک راستہ اور منزل متعین کرنے کے لئے پیش قدمی کرتا ہے۔ اگر بچہ کو ماحول اچھا ملتا ہے تو بچہ اچھے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس مظاہرے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ماحول کے اثرات کبھی والدین کے اوصاف سے متصادم ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ بچہ آخری عمر میں خاندان اور والدین کی روایات کا امین بن جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب "خوشبو" میں سعیدہ خاتون عظیمی نے کہانی کے مرکزی کردار شامہ کی زندگی کے حوالے سے وہ تمام کردار بیان کئے ہیں جو اچھے خاندان' بہترین اوصاف کے حامل والدین میں ہوتے ہیں۔ بات نہایت خوبصورتی سے آگے بڑھتے بڑھتے ظاہر و باطن زندگی پر پہنچ گئی اور اس لڑکی کے کردار میں نور جھلملانے لگا۔ حیات و ممات کا فلسفہ اس انداز سے بیان ہوا کہ قاری پڑھ کر خوش ہوتا ہے اور اس کے ذہن پر کسی قسم کا بار بھی نہیں پڑتا۔

یہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے کہ ہم انتقال کر کے امریکہ جانے سے تو خوش ہوتے ہیں مگر مالک حقیقی' اپنے محبوب اللہ کے پاس جانے سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں عالم ناسوت اور ناسوت کے بعد کے

عالم کا صحیح ادراک نہیں ہے۔ اس دنیا کی طرح مرنے کے بعد کے عالم میں کھانا پینا' سونا جاگنا' رہائش کے لئے گھر اور عمدہ آرام دہ کمرے ہوتے ہیں۔ وہاں سوشل سیکورٹی کا پورا ایک نظام ہے۔ اس دنیا میں کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر شخص آزاد ہے۔ عالم اعراف کا قانون غیر فطری پابندیوں سے آزاد قانون ہے۔

"خوشبو" کی کہانی روحانی ڈائجسٹ پاکستان اور روحانی ڈائجسٹ انٹرنیشنل برطانیہ میں قسط وار شائع ہوچکی ہے۔ سعیدہ خاتون عظیمی کے شوہر جناب عبدالحفیظ عظیمی نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ اس کو مدون کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حیات و ممات کا فلسفہ اور روحانی و جسمانی زندگی کے کردار ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں۔ ہم ریڈیو یا ٹی وی پر قسط وار ڈرامے دیکھتے ہیں۔ اس میں انتظار و تجسس کی کیفیت رہتی ہے' اتنی مصروف زندگی میں کئی مرتبہ ہم الگ الگ قسطیں دیکھ بھی نہیں پاتے اور اس صورت میں ڈرامہ کا پوری طرح تاثر قائم نہیں ہوتا۔ کتابی صورت میں یا فلم میں تاثر زیادہ ہوتا ہے اور نقوش گہرے ہوتے ہیں۔

"خوشبو" کہانی نہیں لگتی۔ الفاظ کے جس جامہ میں اس کہانی کو ملبوس کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی نویس نے خود اپنی کہانی "آپ بیتی" قلمبند کی ہے۔ روحانی واردات و کیفیات اور عشق مجازی سے گزر کر

عشق حقیقی کے سمندر کی طغیانی نے کتاب "خوشبو" کو مردوں اور خواتین کے لئے مشعل راہ بنا دیا ہے۔

روح مرد یا عورت نہیں ہوتی .... روح کے لباس کا نام مرد یا عورت ہے۔ لباس اگر تعفن ہے تو روح خوشبو ہے .... خوشبو روشنی ہے تو روح نور ہے .... روح نور ہے تو تجلی اس کا مخزن ہے .... اور تجلی اللہ کا پرتو ہے .... ہرشے کو اللہ نے احاطہ کیا ہوا ہے۔

دعاگو

خواجہ شمس الدین عظیمی

مرکزی مراقبہ ہال

سرجانی ٹاؤن، کراچی

قدرت نے مجھے سادات گھرانے میں پیدا ہونے کا شرف بخشا۔ مجھ سے پہلے میرے ماں باپ کے ہاں دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ لڑکے سب لڑکیوں سے بڑے تھے۔ پھر لڑکیوں میں میرا چوتھا نمبر ہوا۔ میرے ماں باپ نے میرا نام "شامہ" رکھا۔ میرے نام سے متعلق اکثر میری ماں کہا کرتی تھیں کہ تیری پیدائش شب قدر میں سحری کے وقت ہوئی۔ جس وقت تو پیدا ہوئی میں نے ایک نور دیکھا یہ نہایت ہی روشن تھا۔ اس کے ساتھ خوشبو کی مہک بھی تھی۔ اس جمال اور خوشبو میں ولادت کی ساری تکلیف بھول گئی وہ کہتی تھیں کہ اس نور کی خوشبو میرے اندر بس گئی۔ میری والدہ نے اسی وقت سوچا تھا کہ میں اس بچے کا نام خوشبو رکھوں گی۔ جب امی نے میرے ابا سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا شامہ رکھ لیتے ہیں۔ شامہ کا مطلب خوشبو ہے۔ مجھے اپنے نام سے منسوب یہ واقعہ بہت اچھا لگتا تھا۔ اس مناسبت سے مجھے اپنا نام بہت پیارا لگتا تھا۔ بچپن ہی سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مجھے ایسا ہونا چاہئے جیسا میرا نام ہے۔ اگر میرا کردار ایسا نہ ہوا تو پھر میں بن خوشبو

کا پھول بن جاؤں گی۔ ماں نے میرا نام شمامہ رکھ کر اس نور کو میرے قالب
میں ڈھالنا چاہا۔ میں اپنے ماں باپ کی امیدوں کو کبھی نظرانداز نہیں کروں
گی۔ اندر ہی اندر میں نے اپنے ماں باپ سے عہد کرلیا تھا کہ دنیا و آخرت
میں ان کے نام کو روشن کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گی اور اپنی ذات
سے ان کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔

میری پیدائش کے بعد میری تین بہنیں اور پیدا ہوئیں۔ دو بہنیں قیام
پاکستان سے قبل اور ایک پاکستان آکر پیدا ہوئی۔ جب ہم پاکستان آئے تو
میری عمر تقریباً نو سال تھی۔ بڑی عجیب بات ہے۔ پاکستان آکر مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے میں یہاں ہی پیدا ہوئی ہوں۔ مجھے انڈیا کی کوئی بات یاد نہیں
تھی۔ مجھ سے بڑی بہن کا نام سکینہ ہے۔ یہ مجھ سے عمر میں تقریباً تین سال
بڑی ہیں۔ کبھی کبھی وہ انڈیا کی بات کرتیں تو اپنے گھر کی بات کرتیں۔ میں
بڑے اشتیاق سے سنتی۔ ایک خواہش سی پیدا ہوتی کہ کاش مجھے بھی وہاں
انڈیا کے شب و روز یاد آجائیں۔ میں اپنے ذہن پر بہت زور دیتی مگر ذہن کا
اسکرین بالکل صاف نظر آتا۔ میں اپنی امی پر گئی تھی۔ وہ بہت کم بات کرتی
تھیں۔ میں بھی بہت کم بات کرتی تھی۔ زیادہ دوستی سکینہ سے تھی۔ میری امی
کا بہت رعب تھا۔ ہم سب بچے ان سے ڈرتے تھے اور بے انتہا محبت بھی اور
ان کا ادب بھی کرتے تھے۔ میں اکثر انڈیا میں گزاری ہوئی زندگی کو یاد کرنے
کی کوشش کرتی۔ مگر بس ایک ہی سین میرے تصور کے پردے پر آکر ٹھہر جاتا

جیسے پردے کے باہر میں ہوں اور پردے کے اندر اللہ تعالیٰ موجود ہیں۔ پردہ
موٹی ململ جیسا ہے کہ اس میں ایک دم صاف شفاف دکھائی نہیں دیتا مگر پھر
بھی خاصی اچھی طرح دکھائی دیتا ہے۔

میری ماں اکثر کہتیں بیٹی اللہ ہمیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ وہ ہم سب
سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے ان دنوں میں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا کہ
مجھے کیا نظر آتا ہے۔ نہ ہی مجھے یہ بات قابل ذکر لگی۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ
سب میری طرح محسوس کرتے ہیں اور ہر ایک کے ذہن کے پردے پر اسی
طرح کی فلم چلتی رہتی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرا دل و دماغ تو ہر وقت
اللہ کی محبت میں مشغول رہتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرا دوست ہے۔
میں اس سے اپنی عمر کے لحاظ سے باتیں کرتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ مجھے
ان باتوں کا جواب بھی مل رہا ہے۔ اس کی محبت کا تصور ہر خیال پر غالب
رہتا۔ کوئی بھی دوسرا خیال چند لمحوں سے زیادہ ذہن میں نہ ٹھہرتا۔

اللہ کے خیال میں گزرا ہوا ہر لمحہ میرے ذہن میں ہوتا۔ ہر وقت
طبیعت پر خوشی اور محبت کا غلبہ رہتا۔ دنیا میں میری محبتوں کا محور میرے ماں
باپ اور بہن بھائی تھے۔ ماں ہمیشہ خوش اخلاقی اور محبت کا درس دیتی اور یہ
درس زبانی کم اور عملی زیادہ ہوتا تھا۔

ہم ایک دوسرے کے سروں میں تیل سے مالش کرتے۔ ہمارے یہاں
ناریل کا تیل استعمال ہوتا تھا۔ خصوصاً بھائیوں کے سر میں مالش کرنے کے

لئے ہم بہنیں آپس میں لڑا کرتی تھیں۔ میں کہتی میں کروں گی۔ سکینہ کہتی میں
کروں گی۔ بڑی بہن کہتی میں کروں گی۔ ہم بھائیوں کے جوتوں پر پالش
کرتے۔ ان کے کپڑوں پر استری کرتے۔ مجھے پینٹ پر استری کرنا نہیں آتا تھا
تو میں پاجامہ پر استری کرتی اور شرٹ اور پینٹ پر سکینہ استری کرتی۔ بڑی
بہنیں کھانا پکانے اور سلائی وغیرہ کے کام کرتیں۔ ہماری امی کی یہ ہدایت تھی
کہ بڑی بہنیں چھوٹی بہنوں کو کام سکھائیں۔ لہٰذا ہر کام سب ہی مل جل کر
کرتے تھے۔

انڈیا سے آنے کے بعد ہم دو کمروں کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہاں ہم
نے تقریباً سات سال گزارے۔ وہ میری عمر کا ایک بہت خوبصورت زمانہ تھا۔
ہماری بلڈنگ میں سب سے اوپر ہماری ہم عمر دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ میں اور
سکینہ اوپر چلے جاتے اور پھر سب مل کر گٹے کھیلتے یا پھر اسکول سے آکر شام
کے وقت نیچے فٹ پاتھ پر رسی کودا کرتے۔ اسکول کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ
یہی ہمارا روز کا معمول تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں چڑیا کی طرح آزاد ہوں۔ خوشی میرے
اندر ہر وقت پھوٹتی رہتی۔ مگر آزادی کے تصور کے غلبے کے ساتھ ساتھ میں
ہر وقت عملی طور پر پابند تھی۔ اتنی پابند کہ ماں یا بڑی بہن یا بھائی کے پوچھے
بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ باتھ روم بھی جانا ہوتا تو بغیر
اجازت ہرگز نہیں جاتی۔ مجھے یاد ہے ایک دن مجھے باتھ روم جانا تھا۔ امی کسی

دوست سے باتوں میں مصروف تھیں۔ آپا جان بھی نہیں تھیں۔ اس وقت
شاید سب ہی باہر گئے ہوئے تھے۔ بڑا کوئی گھر پر نہیں تھا امی کے سوا۔ میں نے
آہستہ سے امی سے ایک دفعہ پوچھا۔ امی ٹائیلٹ چلی جاؤں۔ امی نے شاید سنا
نہیں۔ باتوں میں مصروف رہیں۔ مجھ پر امی کا رعب اور ادب بہت تھا۔
تھوڑی دیر بعد پھر میں نے کہا پھر انہیں پتہ نہیں لگا۔ بالآخر مجھے انہیں ہلا کر
مخاطب کرنا پڑا۔ امی جلدی سے یہ کہتی ہوئی حیرت سے ہنس پڑیں۔ ارے اتنی
بڑی ہوگئی ہو اور ابھی تک ذرا سی بھی عقل نہیں ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔ اس
دن میں سوچنے لگی واقعی میں کتنی بدھو ہوں۔ مگر اس کے ساتھ اندر سے آواز
آئی۔ یہ میں خود تھی۔ میں شروع ہی سے اندر سے باتیں کرنے کی عادی تھی۔
میں نے کہا ماں تم میرے لئے اتنی عظیم ہو کہ میں تمہارے حکم اور اجازت
کے بغیر کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتی۔ خواہ کوئی مجھے بدھو سمجھے یا کچھ بھی سمجھے۔
میں نے ہمیشہ اپنے اندر گہرائی سے نکلنے والی آواز کو اور اس کے فیصلہ کو مانا
ہے۔ اس دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ بھی
یہی چاہتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اللہ کے چاہنے کو مقدم رکھا ہے۔

کراچی آنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال پرائمری اسکول میں گزرا اور پھر
اس کے بعد ہائی اسکول میں چلی گئی۔ پرائمری اسکول میں میری ٹیچر کی حیثیت
ماں جیسی ہی تھی۔ میں اپنی استانی سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور ان کی ہر
بات پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتی۔ محبت کے اظہار کے بغیر میں انہیں پھول

پیش کرتی۔ کبھی بڑی بہن سے کروشیا کی بیل دوپٹہ پر بنوا کر دیتی۔ اس کے ساتھ محنت سے پڑھتی تاکہ میڈم بھی مجھ سے اسی طرح محبت کریں۔ میرا جی چاہتا مجھ سے سب خوش رہیں سب مجھ سے محبت کریں۔ جس طرح میں سب سے محبت کرتی ہوں۔ میں اور کسی احساس سے واقف ہی نہ تھی۔ سوائے محبت اور خوشی کے۔ مجھے رونے سے سخت چڑ تھی لیکن میری چھوٹی بہنوں کی پلکوں پر جیسے آنسو دھرے ہوئے تھے۔ جب وہ کسی بات پر روتیں میں فوراً ان کے بال نوچ لیتی کہ تم کیوں روتی ہو۔ میں آنسو بہانے کو سخت کمزوری سمجھتی تھی۔ خصوصاً کسی کے سامنے رونا تو میرے نزدیک سخت ہتک کی بات تھی۔ یہی بات میری بڑی بہن سکینہ میں بھی تھی۔ وہ بھی کبھی نہ روتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری خوب بنتی تھی۔ تین سال بڑی ہونے کے باوجود اس کے ساتھ میرا رویہ برابری کا اور دوستانہ تھا اور میں اسے اس کے نام سے ہی پکارتی تھی۔

ہمارے فلیٹ کے برابر میں ایک عیسائی گھرانہ رہتا تھا۔ ان کے ساتھ ہماری بڑی دوستی تھی۔ اس گھر کی خاتون کو ہم بھابھی کہا کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہمارا ایک ہی خاندان اور ایک ہی گھر ہے۔ ہمارے ہاں جو کچھ پکتا اکثر ہم انہیں بھیجتے۔ اسی طرح وہ بھی کرتیں۔ کبھی دن میں ہمیں یا بھائی کو کوئی کھانے کی چیز پسند نہ آتی تو وہ بھابھی کے یہاں جا کر کھا لیتے۔ ہماری امی ہمیشہ کہا کرتیں کہ پڑوسیوں کا بے حد حق ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک

سے پیش آنا چاہئے۔ ان تعلقات کے درمیان مذہب کے فرق کا کوئی تذکرہ ہمارے یہاں نہیں تھا۔ بس ہم انہیں اپنی طرح انسان سمجھتے تھے اور وہ بھی ہمیں اسی اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق سمجھتی تھیں جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔

ہمیں یاد ہے کبھی بھی کسی کے یہاں سے کوئی کھانے کی چیز بلڈنگ میں آتی۔ اگر ہمارے یہاں اس کے بدلے کوئی شے نہیں ہوتی تو امی برتن میں چینی ڈال کر واپس کرنے کو کہتیں۔ یہ سب کام وہ ہم بہنوں سے کرواتیں۔ خود دیکھا کرتیں تاکہ ہمیں اس کی عادت پڑ جائے۔

ہم 1947 سے لے کر 1954 تک اس فلیٹ میں رہے۔ برابر والوں کے ساتھ ہمارے تعلقات اتنے اچھے رہے کہ جب ہم فلیٹ چھوڑ رہے تھے تو وہ بھی سخت رنجیدہ تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمارا یہاں اب کون ہے۔ عید پر ہم اکٹھے مل کر خوشیاں مناتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے اور خوب دعوت کرتے۔ کرسمس آتا تو ان کی خوشیوں میں ہم بھی شریک ہوتے۔ تحفے دیتے۔ ان کے بچوں کے ساتھ جو ہماری عمروں کے تھے بالکل سگوں جیسی محبت تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ ہم انڈیا سے پاکستان پارٹیشن سے پندرہ دن پہلے ہی آگئے تھے کیونکہ میرے بڑے بھائی کا تبادلہ کراچی ہوگیا تھا۔ امی ابا اور چھوٹی بہنیں پارٹیشن کے ایک ماہ بعد آئے۔ جب ہم پہلے دن اس بلڈنگ میں آئے تو

یہاں چند ہندو خاندان پہلے سے رہائش پذیر تھے۔ ابھی وہ جانے والے تھے۔ یہ سب لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ نیچے ایک فلیٹ میں ایک ہندو عورت اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میرے بھائی نے اس سے بات کی کہ ہم فلیٹ ڈھونڈھ رہے ہیں اس عورت نے ہمیں فوراً" اندر بلا لیا۔ سب ہی محبت کے ساتھ پیش آئے۔ ہمیں دو دن اپنے گھر رکھا۔ گرم گرم پراٹھے پکا کر کھلاتیں بالکل ماں کی طرح ہمارا خیال رکھا کہ دو دن میں ہم بلڈنگ خالی کردیں گے۔ پھر چابی تم کو دے جائیں گے۔ وہ بے چاری بڑی خوفزدہ تھیں۔ سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے رکھتی کہ کوئی دیکھ نہ لے کہ مسلمان ہندو کے گھر میں ہے ورنہ قتل کردیں گے۔ میرے بھائی اگرچہ جوان تھے بی ایس سی پاس تھے اور برسرروزگار تھے مگر اس کے باوجود ہمارے اندر مذہبی تعصب ذرا بھی نہ تھا۔ محبت کا درس ماں نے اس قدر سکھایا تھا کہ ہم نے ان دو دن میں اس ہندو عورت کو بالکل اپنی ماں کی طرح چاہا۔ وہ بھی ہمیں چاروں طرف بٹھا لیتی۔ ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ توے سے گرم گرم پراٹھے تل کر کھلاتی۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حالات کی وجہ سے بھائی نے بھی کام جوائن نہ کیا تھا۔ جاتے وقت وہ ہمیں پوری بلڈنگ دے رہی تھی۔ میرے بھائیوں نے کہا نہیں نہیں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ابھی ہمارے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ بس ایک فلیٹ دے دیں۔ اس میں سے بھی الماری نکلوا دی کہ کمرے میں جگہ نہیں ہے۔ صرف دو کمرے خالی کرلئے تھے۔ اس میں

سات سال ہم سب نے بڑی خوشیوں بھرے دن گزارے۔ وہ ہندو عورت ہمیشہ میرے ذہن پر نقش رہتی۔ جب بھی مجھے اس کی یاد آتی میں سوچنے لگتی محبت بھی کیا چیز ہے جو انسان کو روح کے تاروں سے باندھ لیتی ہے۔

ان کے جانے کے بعد چند دن کے اندر ہی اندر ہر روز بلڈنگ میں فلیٹوں کے تالے ٹوٹنے لگے لوگ لالچ میں دو چار فلیٹ پر قبضہ کرلیتے۔ برابر والے عیسائی بھی چند روز پہلے آئے تھے۔ ان کا مزاج ہماری طرح کا تھا وہ بھی ذرا لالچی نہ تھے۔ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلیٹوں پر قبضہ کرنے کی ہوس کو دیکھ کر ہم حیران ہوئے اور سوچنے لگے کہ یہ کس قدر خودغرض اور بے حس لوگ ہیں جنہیں اپنے پیچھے ہندوستان سے بے یارومددگار اور بے گھر ہو کر آنے والے اپنے حقیقی بھائیوں کا ذرا خیال نہیں ہے۔ صرف اپنی ذات کی فکر ہے۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ انڈیا سے آنے والے دوسرے لوگوں کو بھی سر چھپانے کے لئے جگہ کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے بھی کچھ چھوڑ دیں مگر اس وقت تو بہت ہی کم لوگ ایسے تھے جو اس طرح سوچتے تھے۔ تقسیم کے وقت کی ہنگامہ آرائی اور افراتفری کو ٹھیک ہونے میں کم از کم دو سال لگے تھے۔ دو سال کے اندر کافی سکون ہوگیا تھا۔

میں تقریباً گیارہ سال کی تھی۔ میں نے کبھی برتن نہیں دھوئے تھے بڑی بہنیں جو موجود تھیں۔ ایک دن امی نے کہا برتن دھوؤ۔ جب میں برتن دھونے بیٹھی تو میرے اندر رنج کی ایک لہر اٹھی میرا احساس بہت گہرا تھا۔ مجھے

یوں لگا کہ جیسے یہ میرا کام نہیں ہے۔ دل نے کہا میں کنیز نہیں ہوں۔ اسی لمحے محسوس ہوا جیسے پردے کے پیچھے اللہ آگیا ہے۔ میں اندر ہی اندر انتہائی رنج کے عالم میں اس سے شکایت کرتی رہی۔ میں کنیز نہیں ہوں۔ برتن دھونا میرا کام نہیں ہے۔ مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا جا رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ میں دل میں رنج لئے برتن دھوتی رہی۔ میرا احساس گہرا اور بہت گہرا ہوتا گیا۔ برتن دھوچکی تو چپ چاپ دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ پھر دوسرے دن برتن دھونے کو کہا گیا۔ تعمیل حکم پر میں برتن دھونے لگی۔ پھر وہی رنج کا احساس، میری روح تلملائی کہ میں کنیز نہیں ہوں۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں اندر ہی اندر کبھی اللہ سے کہتی کبھی ماں سے کہتی۔ ماں میں لونڈی نہیں ہوں۔ یہ میرا کام نہیں ہے مگر میں جانتی تھی کہ ادب کا تقاضہ تعمیل حکم سے پورا ہوتا ہے۔ میں شروع سے اس معاملہ میں سب سے عقلمند اور ہوشیار تھی اور اپنے اندر روح کے جذبات اور احساس کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ اللہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور آج مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اگر وہ چاہتا تو ماں مجھے برتن دھونے کو نہ کہتی، کسی اور بہن سے کہہ دیتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ میں برتن دھوؤں۔ مگر اس وقت میری چھوٹی سی عقل اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھی کہ جب میں کنیز نہیں ہوں تو پھر مجھ سے کنیزوں کا کام کیوں لیا جا رہا ہے۔ ہاں میں جانتی تھی کہ میں کنیز نہیں ہوں جب ہی تو میری روح

تلملا رہی تھی۔ آج بھی مجھے اس کرب کا احساس ہے۔ جس سے گیارہ سال کی عمر میں واقف ہوگئی تھی مگر یہ معاملہ میرا اور اللہ کا تھا۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں بے حد کم بولتی تھی۔ بس اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی۔ اتنی خوش رہتی کہ میرے لبوں پر ہر وقت گانے رہتے۔ میں ہمیشہ گنگناتی رہتی۔ ہنستی رہتی۔ اکثر یہ گانا جھوم جھوم کر گاتی۔

مست رام بن کے زندگی کے دن گزارے۔

بار بار برتن دھونے کے بعد میرے ذہن میں یہ بات آگئی کہ میرے اندر احساس کی گہرائی پیدا کی جا رہی ہے۔ میں اکثر اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرتی مگر میں کبھی کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ سب کے اندر ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب کو اللہ دیکھتا ہے۔ سب اسی طرح محسوس کرتے اور سوچتے ہیں۔ میرے اندر ہر لمحے مرنے کے بعد کی زندگی کو جاننے کا شوق بڑھتا جاتا تھا۔ اکثر سوچتی کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔ کیوں آئی ہوں۔ کہاں جانا ہے۔ اللہ مجھ سے محبت کرتا ہے تو مجھے بھی اپنے آپ کو اس کے قابل بنانا ہے۔ ہر وقت اچھائی کا خیال آتا۔ کبھی برائی کا نہ آتا۔

مذہبی لحاظ سے ہمارا گھرانہ کئی دوسروں سے مختلف تھا کہ ہمارے یہاں مذہبی احکامات کی پاسداری کسی جبر اور خوف کے تحت نہیں بلکہ اطاعت بالرضا کے احساس سے ہوتی تھی۔ مجھے دینی احکامات پر عمل کر کے ایسی خوشی

حاصل ہوتی تھی جیسی کسی کو بھی اپنی محبوب ترین ہستی کی کوئی بات مان کر ہوسکتی ہے۔ امی کہا کرتی تھیں کہ یہ کام لگن اور شوق سے ہوتا ہے۔ جبر سے نہیں۔ ہم سب کے اندر تعمیل حکم کا جذبہ اس قدر تھا کہ ادھر امی کے منہ سے بات نکلی ادھر ہم سب فوراً" مان لیتے تھے۔

امی ابا کو پڑھائی کا بڑا شوق تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں میرے ابا یورپ اور برطانیہ میں پانچ سال رہے۔ ان دنوں میں نے اسکول جانا شروع کیا تھا۔ جب انہیں میری اسکول جانے کی خبر ملی تو انہوں نے میرے نام لاہور سے دو رسالے جاری کئے۔ ایک "پھول" دوسرا "تہذیب نسواں"۔ یہ رسالے پاکستان بھی ہم لے کر آئے اور یہاں میں نے پڑھے۔ ہر ایک کے پوسٹل ایڈرس پر میرا نام لکھا ہوتا تھا۔ میں بڑا خوش ہوا کرتی تھی کہ ابا کو میرا کتنا خیال ہے کہ میں پڑھ لکھ جاؤں۔ تین سال تک یہ رسالے میرے نام سے آتے رہے۔ امی ابا پڑھائی پر بڑا زور دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب بہن بھائی اچھی تعلیم حاصل کریں۔ امی ابا نے ہمیں مطالعہ سے کبھی نہیں روکا۔ مجھے کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ سکینہ اور میں ہر ہفتہ آنے والی کہانی کی کتاب خریدا کرتی تھیں۔ پھر یہ شوق اتنا بڑھا کہ ہم اپنی سہیلیوں سے بھی مانگ مانگ کر پڑھتی تھیں۔ امی نے ہمیں کبھی منع نہیں کیا۔ نہ ہی ہم نے کبھی ان سے چھپ کر پڑھا۔ ہر کام کا ٹائم مقرر تھا۔ اسکول کی پڑھائی کے وقت اسکول کی پڑھائی کرتے تھے۔ مجھے شہزادیوں کی کہانیاں بڑی پسند تھیں۔ اس

کے ساتھ ہی ایسے کردار پسند تھے جو بہت بہادر ہوں اور بہت خوددار اور بے پناہ محبت اور ایثار والے ہوں۔ کہانیاں پڑھتے پڑھتے یہ کردار زندہ ہوجاتے۔ شہزادی کی جگہ میں آجاتی اور نئی کہانی پڑھنے تک یہ کردار زندہ رہتے۔ میرے اندر کی شہزادی اپنے شہزادے کے ساتھ کہانی کی دنیا میں گھومتی رہتی مجھے یوں محسوس ہوتا یہ سب کہانیاں حقیقت ہیں۔ یہ سب کہانیاں میری ہیں۔ دھیرے دھیرے اندر کے اس تصور سے میری محبت بڑھتی چلی گئی۔

بارہ تیرہ سال کی عمر میں میرا یہ عالم تھا' سجدوں میں گر گر کر مرنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی تاکہ غیب کی حقیقت سے ہمکنار ہوجاؤں۔ مگر ساتھ ہی ماں اور دوسرے گھر والوں کی محبت کا خیال آتا کہ وہ روئیں گے۔ پھر کہتی کہ مجھے مار کے غیب کی دنیا میں داخل کر کے پھر واپس اس دنیا میں لوٹا دو تاکہ میں وہاں کی خبریں ان لوگوں کو دے سکوں۔ ایک دن گیلری کے لوہے کے جنگلے پر پاؤں رکھ کر میں اوپر چڑھ گئی۔ اس لمحے میرے اندر غیب میں داخل ہونے اور اپنے اللہ سے ملنے کا ایسا شوق ہوا کہ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ تین منزلہ گیلری سے آدھا دھڑ نکال کر نیچے جھانکنے لگی۔ نیچے سڑک نہیں تھی۔ میں نے دیکھا میری نظر بڑی گہرائی میں دیکھ رہی ہے۔ وہاں پورا عالم بسا ہوا ہے۔ میری نظر اللہ کی اس تصویر کو ڈھونڈنے لگی جو میرے تصور پر نقش تھی۔ میں نے دیکھا وہ وہاں موجود ہے اور بہت سے لوگ بھی ہیں۔ میں بس اسے دیکھتی رہی۔ میرے اوپر مکمل استغراقی کیفیت طاری تھی کون

جانتا ہے کہ کب تک اس نظارے میں ڈوبی رہی۔ امی کی زور دار جھاڑ نے مجھے چونکا دیا اور میں گیلری کے جنگلے سے نیچے اتر آئی۔ اس دم مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا ہے۔ میرے اندر کی شمامہ انتہائی دکھ کے ساتھ ماں سے کہنے لگی۔ ماں مجھے چھوڑ دے۔ مجھے اپنی محبت کی زنجیروں سے آزاد کردے کہ میں اپنے رب سے مل سکوں مگر باہر والی شمامہ نے چپ چاپ خالی نظروں سے ماں کو دیکھا اور جلدی سے اپنے کمرے میں گھس کر کسی کام میں اپنے آپ کو مشغول کردیا۔

ضمیر

میں تو اس دہری زندگی کی اب عادی ہو چلی تھی۔ کتنی بار مجھ سے ایسی ہی حرکتیں سرزد ہوئیں۔ میں بار بار گیلری میں آن کھڑی ہوتی۔ آسمان کی جانب دیکھتی رہتی۔ کبھی نیچے گھورتی اور اگلے ہی لمحے میں حواس بدل جاتے۔ میں گہرائیوں میں کھو جاتی۔ اس حقیقت کو پانے کے لئے میری روح مچلتی رہتی۔ اکثر و بیشتر مجھ پر استغراق طاری ہو جاتا۔ میں تصوراتی عالم میں گم رہتی مگر میں نے اللہ تعالیٰ سے کہہ دیا تھا کہ میں تماشا بننا نہیں چاہتی۔ نہ ہی اپنی امی کو کوئی دکھ دینا چاہتی ہوں۔ اس لئے میری اس قسم کی کیفیات کو پردے میں رکھنا۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ میں ہر وقت اپنے مرنے کی دعا کرتی رہتی تھی کیونکہ میرے اندر یہ یقین بیٹھ گیا تھا کہ مرنے سے پہلے میں اپنے اللہ سے نہیں مل سکتی۔ میں اکثر و بیشتر مشاہدہ کرتی کہ وہ مجھ سے ماں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ میرا دل میری روح اس کی طرف کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے کا شوق کسی طرح دل سے کم نہ ہوتا اور کبھی کبھی یہی غلبہ مجھے اس عالم میں پہنچا دیتا۔ ویسے میں بے حد خوش باش لڑکی تھی۔ جس

کے لبوں پر ہر دم خوشی کے نغمے ہوتے اور جو ہر وقت ہنستی کھیلتی رہتی۔ میں
اور سکینہ اکثر اسکول سے آتے ہوئے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے کہانیوں کی
کتابیں بیچنے والے کے پاس سے ایک نظر دیکھتے ہوئے آتے۔ ایک دن اس
کے پاس ڈھیر ساری فلمی گانوں کی کتابیں رکھی تھیں۔ ہم دونوں کو گانوں سے
بڑی دلچسپی تھی۔ ان دنوں فلیٹ میں رہتے ہوئے کبھی ہمیں ریڈیو کی کمی
محسوس نہ ہوئی۔ دن بھر ہر طرف سے گانوں کی آوازیں آتی رہتیں اور میں
اور سکینہ اس کے ساتھ ساتھ گنگناتے رہتے۔ فوراً ہی ہمیں گانے یاد
ہوجاتے مگر اب جو گانوں کی کتابیں دیکھیں تو اتنی پسند آئیں کہ اب ہم نے
گانے کی کتابیں خریدنی شروع کردیں۔ ہم کیا کرتے کہ جب کوئی کام کرتے
مثلاً سکینہ کی جب باری ہوتی روٹی پکانے کی تو میں بھی اس کے ساتھ چھوٹے
سے کچن میں گھس جاتی اور پیڑے بناتی جاتی وہ بیل کر روٹی بناتی۔ ہم دونوں
مل کر بڑی خوشی خوشی کام کرتیں۔ ساتھ ہی ساتھ گانے کی کتاب رکھ لیتے۔
اس میں سے دو گانے تلاش کرتے اور میں لتا یا شمشاد بنتی اور وہ مکیش یا
رفیع بن جاتی۔ ہم دونوں خوب مزے سے گاتے ہوئے کام کرتے۔ اس طرح
ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ امی ہنستیں سارا ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ ابا جب بھی
کوئی بات کہتے اس سے متعلق اشعار ضرور کہتے۔ وہ اکثر امیر خسرو کے شعر
پڑھتے اور ان کا مطلب بھی بتاتے۔ امی کے ہر جملے میں ایک محاورہ اور ضرب
المثل ہوتی۔ میرا ذہن گانوں میں بھی شاعری کی طرف جاتا اور مجھے کبھی بھی

پھکڑ قسم کے گانے پسند نہیں آتے بلکہ وہی پسند آتے جن میں الفاظ اچھے ہوں
اور معنی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ امی ابا نے ہمیں کبھی منع نہیں کیا۔

ہمارے یہاں فاتحہ کا خاصا رواج تھا۔ اکثر ہفتے میں ایک دفعہ ضرور کچھ
نہ کچھ کھانا پکا کر ابا اس پر فاتحہ دیتے اور پھر اس کو بانٹ دیا جاتا اور گھر میں
بھی کھالیتے۔ فاتحہ کا کھانا بڑے اہتمام سے پکاتے۔ بادام وغیرہ چھیلنے ہوں تو
ہم بچوں کو خاص تاکید کی جاتی کہ خبردار جو منہ میں ڈالا۔ بغیر فاتحہ کے ذرا بھی
نہ چکھنا۔ فاتحہ مغرب کے وقت دی جاتی۔ فاتحہ کے کھانے کے ساتھ دودھ کا
گلاس ضرور ہوتا۔ فاتحہ کے بعد ہم سارے گھر والے اس دودھ میں سے
گھونٹ گھونٹ پی لیا کرتے۔ امی مغرب کے وقت کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی اور
کہتیں کہ کوئی دروازہ بند نہ کرو۔ مغرب کے وقت روحیں زمین پر اترتی ہیں
اور اپنے رشتہ داروں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ ہم سب مغرب کے وقت
ایک ساتھ نماز پڑھتے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی چپ چاپ رہ کر
اللہ کی جانب دھیان رکھتے۔ اس وقت کوئی اور کام نہ کرتے۔ مغرب کے بعد
ہم سب اکھٹے مل کر کھانا کھاتے اگر کسی کو ذرا بھی دیر ہوجاتی تو اس کا انتظار
کیا جاتا۔ اگر بھائی کی ڈیوٹی ہوتی تو پہلے ان کے لئے الگ برتن میں سالن نکال
کر رکھ دیا جاتا۔ پھر سارے گھر والے کھاتے۔ دونوں بھائیوں کی شفٹ ڈیوٹی
ہوا کرتی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے کہ خود اپنے کو
بھول جاتے تھے۔ بہنیں ایک دوسرے کے کپڑے پہنتیں۔ ایک دوسرے کو گھر

کے کام کاج سکھاتیں۔ پڑھاتیں۔ بڑا خوبصورت زمانہ تھا۔ جہاں محبت اور خوشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کراچی آنے کے تین سال بعد بڑی بہن کی شادی ہو گئی۔

بچپن ہی سے مجھے جھولا جھولنے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر عید کے موقع پر گلیوں میں جھولا لگتا۔ میں ضرور جھولنے جاتی۔ ہر روز رسی بھی ضرور کودا کرتی۔ ہائی اسکول میں پانچویں سے پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ میں اور میری سہیلی ہم دونوں اکٹھے جاتے تھے۔ اسکول دو تین اسٹاپ دور تھا مگر ہم پیدل ہی جاتے تھے۔ ہماری باتیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ اکثر ہم بڑی سڑک پر پڑی کسی ماچس کی ڈبیہ کو پاؤں سے ٹھوکریں مارتے مارتے اسکول پہنچ جاتے تھے۔

میرا اور میری سہیلی ریحانہ کا اسکول کا ساتھ چار سال کا رہا۔ آٹھویں جماعت پاس کر کے اس کے والد نے اس کی شادی کروا دی۔ میں نے اسی اسکول سے گیارہ جماعتیں پاس کیں۔ اسکول کے زمانے کا ایک معصوم واقعہ یاد آیا ہے۔ میں ان دنوں ساتویں میں تھی۔ ہم دونوں اسکول گئے۔ کسی لڑکی نے ایک بہت لمبا کاغذ دیا جو بہت ساری تہہ میں تھا۔ سب سے اوپر چھپا ہوا تھا ''اسے مت کھولنا'' تجسّس نے کہا اسے ضرور کھولو۔ دوسری تہہ میں لکھا تھا۔ ''میں نے کہا تھا اسے مت کھولئے'' تجسّس اور چوکنا ہو کر بولا فوراً کھولو۔ تیسری تہہ میں لکھا تھا ''آپ باز نہیں آئیں گے'' تجسّس بھی اڑ گیا۔ ہم ڈرنے والے نہیں تھے۔ چوتھی تہہ میں لکھا تھا۔ ''خبردار جو اسے کھولا''

تجسّس نے کہا کرلو جو کرنا ہے ہم تو اسے کھول کر دم لیں گے۔ لکھا تھا ''آپ بات نہیں مانتے'' تجسّس بولا تمہاری بات تو ہرگز نہیں مانیں گے۔ لکھا تھا '' آپ کی مرضی ہم کون ہوتے ہیں منع کرنے والے'' تجسّس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اب آئے نہ ٹھکانے پر۔ لکھا تھا ''مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔'' تجسّس پھر بھڑک اٹھا۔ تم کون ہوتے ہو فائدہ نقصان بتانے والے۔ اگلی تہہ میں لکھا تھا۔

''ارے بابا آپ سے کون جیت سکتا ہے مگر حاصل کچھ نہ ہو گا'' تجسّس نے کہا دیکھتے ہیں۔ اگلی تہہ میں لکھا تھا ''برائے مہربانی اب مجھے ایسے ہی تہہ کر دیجئے۔''

یہ پڑھ کر ہم دونوں خوب ہنسے۔ ہم نے صلاح کی کہ راستے میں جو لڑکا بنیان بیچتا ہے اس کو دیں گے۔ وہ کوئی سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا۔ ہم راستے میں جاتی تھیں تو روز ہی کہتا تھا کہ بنیان لے لو۔ ہم کہتے بھائی کیا تم کو ہم لڑکا نظر آتے ہیں۔ لڑکوں کی بنیان لے کر ہم کیا کریں گے اور وہ بھی اسکول کے وقت میں۔ ہم نے بڑی سنجیدگی سے اس کے ہاتھوں میں یہ پیپر دیتے ہوئے کہا کیا اس پر تمہاری بنیانوں کے متعلق لکھا ہوا ہے تم کو فائدہ ہو گا۔ یہ کہہ کر ہم وہاں سے تیز تیز چل دیں۔ تھوڑے آگے چلے تو پتہ چلا وہ چیختا ہوا ہماری طرف آرہا ہے۔ اے لڑکیو! تم نے مجھے بدھو بنایا۔ بس کچھ نہ پوچھئے ہم دونوں بچیاں تو تھیں۔ ایسی ڈریں کہ یہ اب ہمیں پکڑ کر مارے گا۔ دونوں سر پر پاؤں

رکھ کر بھاگ لیں۔ گلی میں آکر وہ کسی اور بلڈنگ میں گھس گئی اور میں کسی اور میں۔ وہاں سے پچھلی سائیڈ سے نکل کر اپنے گھر آگئی۔ ہنسی نہ رکتی تھی۔ دوسرے دن ملے تو ریحانہ ناراض ہوئی کہ بدتمیز مجھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ وہ مجھے پکڑ کر مار دیتا تو کیا کرتی۔ پھر ہم دونوں بڑا ہنسیں اور ہم نے کہا کہ آئندہ ایسا مذاق کسی لڑکے سے نہیں کریں گے۔ بری بات ہے اب ہم بڑی ہو رہی ہیں۔ ہم دونوں اس بات پر بڑی حیران ہوئیں کہ ہم اس قدر کیوں ڈریں اور یہ خیال کیوں آیا کہ وہ مارے گا۔ ہمیں اس طرح لوگوں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ کافی دیر تک ہم دونوں اسی واقعہ پر باتیں کرتے رہے کہ ہم تو بالکل بدھو ہیں۔ ہمیں ذرا ذرا سی بات پر ڈرنا نہیں چاہئے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اب ہم بڑی ہو رہی ہیں ہمیں لڑکوں سے بھی واسطہ پڑے گا۔ ہمیں لڑکوں سے بھی ڈیل کرنا آنا چاہئے اور لڑکیوں میں تو شرارت ٹھیک ہے مگر لڑکوں میں درست نہیں ہے۔ گویا کہ یہ واقعہ ہمارے لئے ایک تجرباتی نصیحت تھی۔ ویسے میں طبعتاً شرارتی ذرا بھی نہیں تھی بلکہ بہت ہی سنجیدہ اور بہت ہی خوش باش لڑکی تھی۔

چھٹی ساتویں جماعت کا ایک اور واقعہ ہے۔ ہمارا فری پریڈ تھا۔ میں اور ریحانہ کلاس روم سے باہر آئے۔ اسکول کے گراؤنڈ میں بہت بڑا درخت تھا۔ کچھ کرنے کو تھا نہیں۔ ہم کھیل کود بھی نہیں کرسکتے تھے۔ زیادہ گھومتے پھرتے تو نظر میں آجاتے۔ پھر کلاس روم میں بھیج دیئے جاتے۔ ہم نے سوچا

کیا کریں۔ ریحانہ کہنے لگی کہ چلو اسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔ پریڈ فری تھا۔ ہمیں درخت پر چڑھتے ہوئے کلاس کی اور لڑکیوں نے بھی دیکھا۔ سب خوش ہوکر شور مچانے لگیں اور ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں شور سن کر ہیڈ مسٹریس آگئیں۔ ہم دونوں درخت پر ٹنگی بیٹھی تھیں۔ چپ چاپ دم سادھے وہیں بیٹھی رہیں۔ ہیڈ مسٹریس نے لڑکیوں کو ڈانٹا اور اندر جانے کو کہا۔ کچھ لڑکیاں بار بار درخت کی جانب دیکھنے لگیں۔ شاید وہ اس ڈانٹ میں ہمیں بھی شریک کرنا چاہتی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس نے درخت کی جانب دیکھا۔ بھلا دو پلی پلائی لڑکیاں کہیں درخت کے پتوں میں چھپ سکتی تھیں۔ فوراً بولیں بیگمات نیچے تشریف لے آیئے۔ ہمارے تو اوسان خطا ہوگئے کہ اب مارے گئے۔ کہیں یہ ہمیں ساری کلاس کے سامنے بینچ پر کھڑا نہ کردیں۔ بہرحال جلدی سے نیچے اترے۔ ہیڈ مسٹریس کہتی ہوئی چل دیں کہ آفس میں آجائیں۔ ہم دونوں قتل کے مجرم کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ میں نے اندر ہی اندر اللہ میاں سے کہا کہ اللہ میاں آپ کو تو پتہ ہے کہ میں شرارت کتنا کم کرتی ہوں۔ ریحانہ بھی نہیں کرتی۔ بس غلطی ہوگئی معاف کردینا اور ہمیں سب کے سامنے شرمندگی سے بچالینا ورنہ ساری کلاس ہمارا مذاق اڑائے گی۔ آفس پہنچے تو ہم دونوں سر نیچا کئے چپ چاپ کھڑے ہوگئے۔ ہیڈ مسٹریس بولیں۔ آپ انسان ہیں آپ کو لنگوروں کی طرح درختوں پر چڑھنا اچھا لگتا ہے۔ ہم نے فوراً ایک زبان ہوکر کہا میڈم غلطی

ہوگئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کہنے لگیں۔ فری پیریڈ ہے تو ہوم ورک لے کر بیٹھ جایا کریں یا کتاب پڑھ لیا کریں۔ آئندہ میں آپ کو باہر نہ دیکھوں۔ ہم نے اچھے بچوں کی طرح سرہلایا۔ میڈم ایسا ہی ہوگا۔ انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم کلاس روم میں آئے تو ساری لڑکیاں پوچھنے لگیں کیا ہوا ہیڈ مسٹریس نے کیا سزا دی۔ خوب ڈانٹ پڑی ہوگی۔ ہم نے کہا ہم نے سوری کہہ دیا۔ انہوں نے مان لیا۔ لڑکیوں کو یقین نہیں آیا۔ ریحانہ بولی۔ ارے ہیڈ مسٹریس نے تو ہمیں بیگمات کا خطاب دیا ہے۔ آج سے ہم دونوں بیگمات ہیں۔ ہماری عزت کیا کرو۔ ویسے ہم نے لڑکیوں سے لنگور والا خطاب چھپا لیا تھا۔ اب میں سوچتی ہوں یہی چھوٹے چھوٹے واقعات اور شرارتانہ تجربات زندگی کی کہانیوں کو رنگین بناتے ہیں۔ ورنہ روکھی پھیکی زندگی کی اپنی کتاب کو خود ہی پڑھنے کو جی نہ چاہے۔

ریحانہ کے سوا میری اور کسی سے دوستی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ میری اس قدر ذہنی ہم آہنگی تھی کہ جو بات اس کے دل میں ہوتی وہ میری زبان سے ادا ہوجاتی۔ وہ اکثر چونک پڑتی مگر میں اندر ہی اندر اس سے مخاطب ہوتی کہ پگلی یہ سب محبت کے کھیل ہیں۔ محبت کی روشنی دل تک پہنچتی ہے۔ اسی روشنی میں دلوں کی تحریر پڑھی جاتی ہے مگر میں زبان سے اسے کچھ نہ کہتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری ہربات سمجھ نہ سکے گی۔ ویسے بھی ان دنوں مجھے اپنے اندر کے جذبات کا اظہار کرنا نہیں آتا تھا۔ مجھے جو کچھ اندر ہی اندر

معلوم ہوتا تھا وہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان کردیتی تھی اور میرا ضمیر اور میری عقل بالکل مطمئن ہوجاتی تھی۔ جس کی وجہ سے میں ظاہری طور پر اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ زیادہ تر خاموش رہتی۔ ان دنوں ہم نے ساتویں جماعت کا امتحان دیا تھا۔ ان دنوں گیارہ کلاس کی میٹرک تھی۔ میٹرک میں ایک لڑکی تھی جو بہت ہونہار تھی۔ اسکول کی اسمبلی، اسپورٹس اور جانے کن کن چیزوں میں حصہ لیتی رہتی تھی۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔ میرے ساتھ بچپن سے ایک عجیب بات تھی۔ مرا دل عام طور پر کسی کی جانب مائل نہیں ہوتا تھا۔ بس سرسری طور پر مجھے سب اچھے لگتے تھے مگر شروع ہی سے کسی ایک شخص کے ساتھ قلبی لگاؤ ہوجاتا اور وہ میرے حواس پر چھا جاتا۔ جیسے پرائمری چوتھی جماعت ہی میں میری کلاس ٹیچر مجھے بہت چاہتی تھیں کیونکہ میں فرسٹ آتی تھی اور پڑھائی لکھائی میں لگی رہتی تھی۔ وہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوگئیں اور دو ہفتے تک نہ آئیں۔ ایک دن مجھے بہت یاد آئیں میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ انہیں جلدی بھیج دے۔ ہماری پڑھائی کا حرج ہورہا ہے اور میں انہیں دیکھنا بھی چاہتی ہوں۔ مجھے ان کی بہت یاد بھی آتی ہے۔ اس رات خواب میں دیکھا کہ وہ سڑک پر جارہی ہیں۔ بارش ہورہی ہے۔ چھتری لگائے ہوئے ہیں۔ میں سڑک کے کنارے کھڑی ہوں جیسے ہی ان پر میری نظر پڑی میں بھی ان کے ساتھ ساتھ اسی رفتار سے دوڑتی ہوں۔ اور پوچھتی ہوں کہ آپ کب اسکول

آئیں گی وہ دوڑتی دوڑتی کہتی ہیں کل آؤں گی۔

صبح اٹھتے ہی مجھے یقین تھا کہ مس آج ضرور اسکول آجائیں گی۔

اسکول پہنچی تو وہ وہاں موجود تھیں۔ اسی طرح امی کے ساتھ میری بہت محبت اور قلبی لگاؤ تھا۔ میں ان کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ہر وقت ان کو خوش رکھنے کی ترکیبیں سوچتی رہتی۔ ہائی اسکول میں ریحانہ کے ساتھ قلبی اور ذہنی لگاؤ تھا۔ دنیاوی طور پر نگاہ کی مرکزیت ہمیشہ سے کوئی ایک فرد رہا۔ نگاہ کی مرکزیتیں بدلتی رہیں مگر جب بھی بدلی بہت دنوں تک میں سخت بے چینی کا شکار رہی۔ پرائمری اسکول چھوڑنے پر بہت دنوں تک میری آنکھیں میری مس کو تلاش کرتی رہیں۔ پھر ریحانہ نے ان کی جگہ لے لی مگر ذہن و دل کی مرکزیت ہمیشہ سے ایک رہی۔

اللہ کی ہستی جو میرے ذہن کے پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ جب بھی کبھی میری نگاہ اپنی من پسند ہستی کو باہر دیکھنے سے محروم رہتی میں اپنے دل کا درد اپنے رب سے بیان کردیتی۔ وہ میری محرومیوں پر مسکراتا، مجھے تسلی دیتا میری لگن نگاہ کے اس عکس کو دل کی تختی پر اتار کر اندر ہی اندر اسے دیکھتی رہتی اور اپنی آگ بجھاتی رہتی۔ میں ہمیشہ اللہ کے ساتھ پوری طرح Honest رہی۔ ایسی صورت میں جب مجھے اپنی ٹیچر بہت یاد آتی ان کی محبت جوش مارتی تو میں اللہ سے یہی کہتی کہ آپ ذرا بھی خیال نہ کریں۔ مجھے آپ سے سب سے زیادہ محبت ہے۔ میں آپ ہی کے پاس جانا چاہتی ہوں مگر دنیا میں رہتے

ہوئے کسی کی طرف تو نگاہ پڑتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی محبت میں کمی ہوگئی ہے۔

مجھے ہر وقت یوں لگتا جیسے اللہ مجھ سے بے پناہ پیار کرتا ہے۔ اگر میں نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو وہ مجھ سے روٹھ جائے گا۔ پھر میں اسے دیکھ نہ سکوں گی اور میں کسی بھی قیمت پر ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت مجھے یہی خیال رہتا کہ اللہ کیا چیز پسند کرتا ہے۔ مجھے کیسا نظر آنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ ماں کی خوشی، باپ کی خوشی، بھائی بہنوں کی خوشی کا خیال بھی مجھے اسی لئے رہتا کہ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر دور میں دنیا ہی سے مجھے کوئی ایک فرد بہت زیادہ اچھا لگتا۔ مگر میں نے کبھی اپنی دلی کیفیات کا ڈھنڈورا پیٹنا پسند نہیں کیا۔ بس خود ہی اپنے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتی اور اللہ سے کہتی اور اس کی باتوں پر عمل کرتی۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میٹرک کا امتحان ہوچکا تھا اور اب وہ لڑکیاں اسکول چھوڑ رہی تھیں۔ ریحانہ میرے پاس آئی۔ شامہ صفیہ باجی آج اسکول چھوڑ رہی ہیں۔ اس کا چہرہ دلی کرب سے سفید ہو رہا تھا میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور اس کے دل کے رنج کو دیکھ لیا۔ میرے دل نے فوراً" ہی کہا۔ ریحانہ کو اس لڑکی سے بے حد محبت ہے۔ اس کے اسکول چھوڑنے کا اسے بہت رنج ہے مجھے اپنی سہیلی کے رنج میں شریک ہونا چاہئے۔ ریحانہ

بولی۔ چلو ان سے ملتے ہیں۔ ان کو خدا حافظ کہہ کر آتے ہیں۔ میں نے کہا
ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی صفیہ باجی کی طرف نظر بھر
کے دیکھا بھی نہ تھا۔ مجھے ان میں کسی قسم کی ذرا بھی دلچسپی نہ تھی مگر اس
وقت ذہن میں یہی بات گھوم رہی تھی۔ ریحانہ کو ان کے جانے کا رنج ہے۔
مجھے بھی رنج کا اظہار کرنا ہوگا تاکہ ریحانہ مجھے دوست سمجھے۔ کیونکہ دوستی کا
تقاضہ یہی ہے کہ دوست کے غم اور خوشی میں برابر کا شریک رہے۔ ہم دونوں
ایک روم میں پہنچے۔ ریحانہ صفیہ باجی کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
میں تو ویسے بھی رونے دھونے کی قائل نہیں تھی میرا تو یہ نظریہ تھا کہ کسی
کے مرنے پر ہی رونا چاہئے۔ وہی اصلی غم ہے ورنہ باقی موقعوں پر رونا آ ہی
نہیں سکتا اور واقعی مجھے تو رونا آتا ہی نہیں تھا۔ اب کیا کروں۔ یہ میرے لئے
بہت ہی مشکل وقت تھا۔ دل اندر اندر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا کہ اللہ
کے سوا ایسی محبت بھی کسی بندے سے ہوسکتی ہے کہ جس کی محبت میں رونا
آجائے۔

دراصل اس وقت تک مجھے کسی فرد سے ایسی محبت تھی ہی نہیں کہ
میں اس کی جدائی میں آپے سے باہر ہوجاؤں اور رو کر اپنی کمزوری دنیا کو
دکھاؤں۔ میں نے حیرانی سے ایک نظر ریحانہ کو دیکھا جو صفیہ باجی کر
کے خوب رو رہی تھی۔ میں نے اندر اندر اللہ میاں سے کہا کہ اللہ میاں اب

کیا کروں۔ میرے اندر تو دور دور تک غم کا نام ونشان اس وقت نہیں ہے بلکہ
میرے اندر تو اس بات کی خوشی کی لہریں اٹھ رہی ہیں کہ اچھا ہوا میں اس
مصیبت میں گرفتار نہ ہوئی ورنہ آج میرا بھی یہی حشر ہوگا۔ مگر دوستی کا تقاضہ تو
یہی ہے کہ میں بھی دوست جیسی بن جاؤں۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے سنجیدہ
اور رنجیدہ کردیجئے۔ میرے ذہن میں ترکیب آئی۔ میں زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا
منہ گھٹنوں میں چھپا لیا تاکہ کوئی چہرہ نہ دیکھے اور لوگ یہ سمجھیں کہ میں رو
رہی ہوں۔ وہاں صفیہ باجی کی تین چار سیلیاں اور تھیں وہ صفیہ سے کہنے
لگیں بے چاری بچیاں آپ سے کتنی عقیدت رکھتی ہیں۔ میرا دل ان کے
جواب میں کہہ رہا تھا میں بچی نہیں ہوں۔ مجھے ان سے قطعی عقیدت و محبت
نہیں ہے میں تو انہیں جانتی بھی نہیں۔ یہ سارا ناٹک تو میں اپنی سہیلی کو خوش
کرنے کے لئے کھیل رہی ہوں۔ اصل میں اس وقت ان لڑکیوں کی بات سن
کر مجھے ایسا لگا جیسے مجھ پر ایسا الزام لگادیا گیا ہے کہ جس میں میری توقیر نہیں
بلکہ بے عزتی ہے۔ تقریباً دس منٹ تک جب تک ریحانہ صفیہ باجی کے ساتھ
مشغول رہی میں اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے رہی اور وقتاً فوقتاً آنکھیں
زور زور سے ملتی رہی کہ لال ہوجائیں۔ تاکہ رونی صورت بن جائے اور
سہیلی کو گلہ نہ رہے۔ جیسے ہی ہم اس کمرے سے باہر آئے میں نے اطمینان کا
سانس لیا۔

ان دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اللہ میاں مجھے بڑے غور سے دیکھ

رہے ہیں۔ میرے ہر فعل پر ان کی نظر ہے۔ مجھے یوں لگتا جیسے اللہ میاں کے اور میرے درمیان ایک پردہ ہے۔ میں اپنے ہر فعل کے بعد اللہ میاں کو اس کی وجہ بتاتی اور کام شروع کرنے سے پہلے اپنے ارادے سے آگاہ کرتی۔ مجھے لگتا کہ اس پردے کے پیچھے سے اللہ میاں مجھے شاید اچھی طرح نہ دیکھ سکیں۔ میرے دل کا حال نہ جان سکیں۔ کہیں وہ مجھے بری لڑکی نہ سمجھ لیں۔ آج مجھے اپنے اس خیال پر سخت ہنسی آتی ہے۔ شعور ہر بات کو الٹا ہی سمجھتا ہے۔ اس لمحے جس بات کو میں نے اللہ پاک سے منسوب کردیا وہ تو دراصل میری اپنی کمزوری تھی۔ میری نظر دل کے آئینہ میں خود اپنے ہی نفس پر تھی۔ میں نے اپنے نفس کو لامحدودیت کا جز سمجھ کر اس کی کمزوری کو بھی لامحدودیت سے وابستہ کردیا تھا اور جتنی دیر تک میں اسکول میں رہی اندر ہی اندر اللہ پاک کو تفصیل سے بتاتی رہی کہ میں نے صفیہ باجی سے جھوٹ موٹ کی محبت کا ڈھونگ کیوں رچایا۔ میں نے صفیہ باجی سے زبان سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ ان دنوں میں ہر کسی سے بات کرتی بھی نہیں تھی۔ بہت خاموش رہتی تھی۔ میں بار بار اللہ میاں سے کہتی کہ میں نے زبان سے تو محبت کا اقرار نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ میں جھوٹی محبت کا اظہار کررہی ہوں۔ اسی لئے میں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بس سہیلی کا دل رکھنے کے لئے ایکٹنگ کرلی۔ اگر اسے یہ پتہ چلتا کہ میں اس لڑکی سے محبت نہیں کرتی جس سے میری سہیلی کرتی ہے تو یہ جان کر اسے کتنا دکھ ہوتا۔ پھر وہ میری محبت کا بھی اعتبار نہ کرتی۔ میں

بار بار اللہ میاں سے کہتی دل توڑنا تو اچھی بات نہیں ہے نا اللہ میاں۔ بس اس کے لئے مجھے اگر تھوڑی سی بھی جھوٹ موٹ ایکٹنگ کرنی پڑتی تو کیا برائی ہے۔ میں اتنی دیر تک یہ باتیں اپنے دل میں دہراتی رہی۔ جب تک کہ پردے کے پیچھے سے مجھے حق کی رضا کا احساس نہیں ہوگیا۔ اپنے ہر عمل پر میرے نزدیک اللہ میاں کو اپنے دل کی کیفیات اور نیت و ارادے کی تفصیل بتانا اس لئے ضروری تھا تاکہ اللہ میاں مجھے اچھی طرح جان جائیں کہ میں کیسی لڑکی ہوں اور یہ میں اس لئے ضروری سمجھتی تھی کیونکہ میرے اور اللہ میاں کے درمیان محبت کا رشتہ تھا۔

میں اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ محبت کرنے والوں کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہونا چاہئے۔ میں اسے بتاتی جاتی میں ایسی ہوں میں ویسی ہوں۔ میں یہ کرسکتی ہوں میں یہ نہیں کرسکتی وغیرہ وغیرہ۔ میں اندر ہی اندر اپنی پسند اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اس سے کرتی رہتی۔ مجھے معلوم تھا کہ اللہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ میری پسند اور ناپسند کا ضرور خیال رکھے گا۔ میں ہر وقت گنگناتی جھومتی رہتی۔ خوشیاں میرے اندر سے چشمے کی مانند ابلتی رہتی۔ صفیہ باجی والے واقعہ کے بعد خود مجھے پتہ چل گیا کہ میرے دل میں ریحانہ کی کتنی محبت ہے۔ میرا جی چاہتا ہم زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ رہیں۔ ذہن میں زیادہ سے زیادہ اس کا خیال آتا۔ اس کی غیر موجودگی کے لمحات میرے لئے اذیت ناک بننے لگے۔ مگر میں نے کبھی نہ ریحانہ سے نہ ہی کسی اور کے سامنے

اس کا ذکر کیا۔ میں اس قدر نارمل طریقے سے ظاہر میں رہتی تھی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ اندر ہی اندر میرا کیا حال ہے۔ بس میں اللہ میاں سے کہتی رہتی کہ یہ محبت میرے بس سے باہر ہے مگر آپ یہ نہ سمجھنا کہ میں سہیلی کی محبت میں آپ کو بھول جاؤں گی۔ میں اللہ میاں کو اندر ہی اندر وضاحت کرتی رہتی۔ اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔ دنیا میں آپ نے مجھے رکھا ہے تو مجھے اس دنیا میں ماں کی بھی ضرورت ہے۔ بہن بھائیوں کی بھی ضرورت ہے۔ ان سب کی محبت کے ساتھ ساتھ اب مجھے سہیلی کی محبت کی بھی ضرورت ہے۔ یہ تو میری دنیاوی ضرورتیں ہیں۔ اصل محبت تو میں آپ ہی سے کرتی ہوں۔ مجھے ہر وقت اس بات کا احساس رہتا ہے کہ اللہ پاک یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اللہ کے بجائے دنیا کی محبت میں مشغول ہوگئی ہوں۔ اس لئے کوئی بھی فرد مجھے اچھا لگتا ہے تو میں ہر وقت دل میں اللہ کی محبت کا اظہار کرتی اور اس فرد سے محبت کرنے کی وجہ بتاتی۔ اپنے اندر اٹھنے والے بشری تقاضوں کو اللہ کے سامنے بیان کرتی اور اسکے حوالے سے اس فرد کی یا شے کی محبت کا کوئی نہ کوئی مثبت پہلو ڈھونڈ لیتی پھر مجھے لگتا کہ اللہ کی طرف سے مجھے اس کی اجازت مل گئی ہے اور وہ مجھ سے راضی ہے۔

استغراق

مجھے بچپن سے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے میں اپنے آپ کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں اپنے اندر اٹھنے والے تقاضوں سے واقف ہوں۔ میں محسوس کرتی کہ دل کے پردے میں چھپے ہوئے اللہ کو میرے تقاضوں کا حل چاہئے۔ مجھے یوں لگتا جیسے یہ سب تقاضے فطری ہیں۔ مجھے اندر اٹھنے والے تقاضوں کے متعلق کبھی منفی احساس نہ ہوا۔ میرے ذہن میں کبھی منفی خیالات نہیں آئے۔ میرے اوپر ہر وقت محبت کا غلبہ رہتا۔ اس کا محور اللہ کی ذات تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ظاہر میں محبت کے تقاضے پورا کرنے کے لئے ماں باپ بہن کے علاوہ ایک سہیلی ریحانہ تھی۔ یہی میری کل کائنات تھی اور میں اپنی کائنات میں مگن تھی۔ ان کرداروں کے علاوہ مجھے کسی اور سے نہ ملنے کی خواہش تھی نہ بات کرنے کی۔ میں اپنے اندر بے حد مطمئن تھی۔

یوں تو بچپن ہی سے کبھی کبھی اپنے خیالوں میں گم ہوجاتی تھی مگر آٹھویں کلاس میں آتے ہی مجھ پر استغراق کی کیفیات ہونے لگیں۔ اسکول میں جب فری پریڈ ہوتا یا وقفہ ہوتا کبھی کھڑی ہوتی یا باہر گراؤنڈ میں ہوتی مجھے

یوں لگتا جیسے اسکول میرے سامنے سے بالکل غائب ہوگیا ہے۔ میں اس وقت
کسی اور ہی عالم میں داخل ہوجاتی۔ مجھے اچھی طرح پتہ بھی نہ لگتا کہ میں کیا
دیکھ رہی ہوں۔ ایک دفعہ میں گراؤنڈ میں تھی دور میری نظریں پہنچیں۔ ایک
دم سے مجھ پر استغراق چھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا کنواں ہے اور
اس کنوئیں کے پاس ایک مرد اور عورت کھڑی ہے۔ میں انہیں دور سے دیکھ
رہی ہوں۔ وہ میری جانب دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کرتے ہیں جیسے میرے
متعلق باتیں کر رہے ہوں۔ پھر مجھ سے بھی گفتگو کرتے ہیں۔ بہت دیر میں ان
سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اس عورت نے مرد سے کہا۔ اب اسے اس کی جگہ
پر چھوڑ آؤ ورنہ اس کی تلاش شروع ہوجائے گی۔ اسی وقت مجھے ہوش آگیا۔
میں نے اپنے آپ کو گراؤنڈ کی طرف گھومتے ہوئے پایا۔ ایک لمحے کو میں سمجھ
نہ پائی کہ میں کہاں ہوں۔ وہ کنواں کہاں چلا گیا۔ وہ لوگ کہاں غائب ہوگئے۔
پھر دوسرے ہی لمحے لڑکیوں کی آوازوں سے میں پوری طرح سمجھ گئی کہ میں
اسکول میں تھی۔ میں نے اسی وقت اللہ سے کہا۔ کہ یا اللہ میاں میری ایسی
حالت کی کسی کو خبر نہ دینا۔ دل کی اتھاہ گہرائی میں کوئی خیال موجود تھا کہ ایسی
بات کسی کو بتانے کی نہیں ہے۔

ایک مرتبہ میں کئی سہیلیوں کے ساتھ کلاس روم کے دروازے میں
کھڑی تھی۔ لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور میں تھوڑی تھوڑی دیر
میں استغراق کی حالت میں پہنچ جاتی۔ یہ اتنی بار ہوا کہ میں گھبرا گئی کہ کہیں گر

نہ پڑوں۔ پھر لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ کا سہارا
لے لیا۔ میرا ذہن مستقل کسی اور خیال میں گم تھا۔ مجھے ان لڑکیوں کی باتوں
کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بس ایک لمحے کو جیسے غلبہ کم ہوتا مجھے
پتہ لگتا کہ میں اسکول میں ہوں پھر غلبہ چھا جاتا۔ اسی کیفیت میں ایک لڑکی مجھ
سے میرے خاندان کی میرے رشتہ داروں کی باتیں کرنے لگی۔ وہ کچھ نہ جانتی
تھی۔ میں اسی نیم بے ہوشی میں استغراقی کیفیت میں اسے جواب دیتی رہی اور
پھر فوراً ہی میں پوری طرح لاشعور میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں شعور
میں آئی تو وہ لڑکی جو مجھ سے عمر میں اور کلاس میں بڑی تھی کہنے لگی ارے
اس لڑکی کی تو کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کو اس طرح نہیں چھوڑنا
چاہئے۔ میں نے جلدی سے کہا کہ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں اور پھر کلاس میں
چلی گئی۔ اس دن کے بعد سے مجھے کچھ فکر بھی ہوگئی کہ ایسی حالت لوگوں کے
سامنے ٹھیک نہیں ہے۔ میں دعا کرتی رہی کہ سب کے سامنے ایسی حالت نہ ہو
تنہائی میں ہو۔ مگر ان دنوں زیادہ تر پڑھائی کے دوران نہیں بلکہ خالی پریڈ میں
ہوتا تھا اور میں خالی بیٹھی ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں کبھی تو میں بالکل ہی گم
ہوجاتی اور ہوش آنے پر کچھ یاد نہ رہتا اور کبھی دیکھی ہوئی چیزیں یا لوگ یاد
رہتے۔ میرے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ یہ بیماری ہے یا کوئی ایسی
تشویشناک بات ہے جس کا ذکر کسی سے کرنا چاہئے۔ بلکہ مجھے معلوم تھا اور
یقین تھا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ میاں مجھے کچھ دکھانا

چاہتے ہیں۔ اس کی تیاری ہے۔ ان دنوں میں بڑی سنجیدہ سی رہتی مگر پھر بھی خوشی اندر سے پھوٹتی رہتی۔ کچھ دیکھنے کا اس قدر شوق تھا کہ اس کے لئے سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھی۔ میں اپنے اندر رونما ہونے والی ہر حالت پر غور کرتی اور ساتھ ساتھ سوچتی رہتی۔ استغراق کے متعلق مجھے تجربہ ہوا کہ اکثر تنہائی میں کھڑے کھڑے مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوجاتی اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں گر جاؤں یا مجھے چوٹ لگی ہو۔ جب یہ کیفیت ہٹتی تو میں اپنے آپ کو اسی طرح پاتی۔ اس تجربے سے میرے اندر اور زیادہ اس بات کا یقین بیٹھ گیا تھا کہ اللہ پاک مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور وہ میری پوری طرح حفاظت کر رہے ہیں۔

دن بدن میرا جی چاہتا کہ میں کوئی بہت اچھا سا کام کروں جس سے اللہ پاک مجھ سے خوش ہوجائیں۔ میرے ماں باپ بھی خوش ہوجائیں۔ میرے دل میں اکثر خیال آتا۔ اللہ نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے۔ میں کیا ہوں میرا وجود کیا ہے۔ اللہ سے میرا رشتہ کیا ہے۔ اکثر تنہائی میں چپ چاپ بیٹھی ان خیالوں پر سوچتی رہتی۔ کبھی کبھی بند آنکھوں کے سامنے رنگین روشنیوں کے دائرے آجاتے۔ میں ان میں معنی پہنانے کی کوشش کرتی۔ مجھے اپنے اندر کی یہ دنیا بڑی دلچسپ دکھائی دیتی۔ میرا ہر وقت یہ جی چاہتا کہ اس دنیا میں داخل ہوکر اسے دیکھ لوں اور اس کے حالات دوسروں کو بھی بتاؤں۔

آٹھویں کلاس میں ہی پڑھ رہی تھی کہ ایک رات خواب دیکھا۔ مجھے

یوں لگا جیسے میں ساری رات ہی خواب دیکھتی رہی ہوں۔ یہ خواب رنگین تھا۔ صبح اٹھی تو اس قدر اچھی کیفیت تھی ایک سرور تھا کہ ذہن و دل پر چھایا ہوا تھا۔ دل بار بار اس خواب کو دہراتا اور میرے اوپر اس کا نشہ چھا جاتا۔ مجھے یوں لگتا کہ جب جب ذہن اس خواب کو دہراتا جاتا ہے ویسے ویسے اس خواب کی رنگینی میرے اندر جذب ہوتی جاتی ہے۔ میں نے ریحانہ سے اس خواب کو بیان کیا۔ وہ کہنے لگی کہ یہ خواب ہے یا افسانہ۔ ایسے اچھے خواب تجھے کیسے نظر آجاتے ہیں مجھے تو نہیں آتے۔ وہ خواب آج بھی مجھے یاد ہے مگر آج بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ خواب سنانے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس رات میں بستر پر لیٹتے ہی سو گئی اور سوتے ہی خواب کے عالم میں پہنچ گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میں ایک آبشار کے کنارے بیٹھی ہوں سامنے پہاڑ سے چاندی کی طرح چمکتے ہوئے پانی کا آبشار گر رہا ہے۔ اس پانی کی ایک نہر بہہ رہی ہے۔ شفاف پانی کے نیچے سے ریت کے رنگ جھلک رہے ہیں۔ اس نہر کے دونوں طرف پہاڑ ہیں۔ پانی جب اپنی روانی میں پہاڑوں سے ٹکراتا ہے تو اس کے اندر کے رنگ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پانی کبھی نیلگوں کبھی سبز کبھی فیروزی دکھائی دیتا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہے۔ میں یہ بتا نہیں سکتی کہ کیسا خوبصورت سماں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا میں چودہ پندرہ سال کی ایک حسین لڑکی تھی جس کا رنگ روپ اس دنیا سے بالکل ہٹ

کر تھا۔ خواب میں میں ایک شہزادی تھی جو خوبصورت گلابی رنگ کے ریشم کے لباس کو سمیٹے ہوئے پانی میں اپنی ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ لباس کو گھٹنوں تک سمیٹ رکھا تھا کہ بھیگے نہیں۔ پاؤں میں نہایت نازک سی زنجیریں تھیں جو پازیب کی طرح بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ میں اکیلے ہی اس نہر کی سیر کو نکلی تھی۔ پاؤں ہلا ہلا کے پانی کے چھینٹے مارنے میں بڑا ہی لطف آرہا تھا۔ فضا کی رنگینی نغمہ بن کر زبان پر آگئی۔ فطرت کی معصومیت غزال بن کر سامنے آگئی۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا وہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے قلانچیں بھرتا ہوا بیچ نہر میں جا کھڑا ہوا۔ میں اس کی شوخی پر ہنستے ہوئے اٹھی اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ہرن گردن ہلا کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں ہنس دی۔ اچھا میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلو گے۔ یہ کہہ کر میں کچھ اور بھی پانی میں گہرائی کی طرف چلی گئی۔ میں نے جھک کر پاس کھڑے ہرن کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ جانے نظر کیسے ساحل پر پہنچ گئی بالکل کہانی کے شہزادے کی طرح ایک شہزادہ عجیب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ حیا کی لہروں میں بدن کا ساغر ڈولنے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اسے آواز دی۔ کون ہو تم۔ یہاں کیوں آئے ہو۔ اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔ حیا کے رنگ میرے چہرے سے چھلکنے لگے۔ ہم دونوں ساحل پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ ہواؤں نے ہماری خوشبو سونگھ کر محبت کا ایک نہ ختم ہونے والا افسانہ چھیڑ دیا۔ وفا کے

عہد و پیمان ہوئے۔ عشق کے نغموں نے خوابیدہ فطرت کو میٹھی نیند سے جگا دیا۔ زندگی کے معنی بدل گئے۔ میری زندگی کے معنی بدل گئے۔

ریحانہ نے خواب سن کر یہ کہا کہ یہ خواب ہے یا افسانہ۔ تو میرا دل اندر سے کہہ اٹھا تم اسے نہیں سمجھ سکتی' یہی تو حقیقت ہے۔ کتنے دن تک دل اس خواب کو دہراتا رہا۔ دن نہیں بلکہ مہینوں تک۔ ہر بار خوشی کی ایک لہر میرے سر سے پاؤں تک دوڑ جاتی۔ خواب کا لمحہ حواس پر چھا جاتا۔

ایک دن امی کے آس پاس ہم سب بہنیں بیٹھی تھیں۔ ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی دوران شادی کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ امی پوچھنے لگیں شادی کرنا پسند ہے۔ سب بہنوں نے کہا کہ ہاں پسند ہے۔ امی بولیں کیوں۔ ایک چھوٹی بہن بولی۔ اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملتے ہیں۔ دوسری بولی مجھے زیورات کا بہت شوق ہے۔ شادی کے بعد میں خوب اچھے اچھے زیور پہنوں گی۔ تیسری بولی مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ میں شادی کے بعد ساری دنیا کی سیر کروں گی۔ امی نے میری جانب دیکھا۔ شامہ تو شادی کے بعد کیا کرے گی۔ اس وقت امی صوفے پر بیٹھیں تھیں اور ہم سب نیچے زمین پر تھیں۔ میں ان کے بالکل پاؤں کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بہت گہرائی سے ایک آواز گونجتی ہوئی مگر نرم لہجے میں میرے اندر آئی۔ شامہ تو شادی کے بعد کیا کرے گی۔ میرے دماغ کے پردے سے فلیش کی طرح خواب گزر گیا۔ میں نے ماں کے دونوں گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے

اور خلا میں اپنے خواب کا عکس دیکھتے ہوئے گہری آواز میں بولی۔ ماں میں اپنے شوہر سے بہت محبت کروں گی۔ اتنی محبت کہ پھر اسے کسی کی محبت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ماں مسکرائی۔ تو کیا تو ہر وقت اس کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہے گی۔ میرے لب بند رہے مگر دل بول اٹھا۔ ہاں ماں میں ہر دم اس کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہوں گی۔ کیا محبت کے سوا اور بھی کوئی ضرورت ہے انسان کی۔ اب ماں نے خلاؤں میں گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ نہیں بیٹی ایسی محبت آدمی سے نہیں کی جاتی۔

میرا رجحان شروع ہی سے شاعری کی جانب تھا۔ مجھے اچھے اچھے اشعار پسند تھے۔ خصوصاً ہمارے ابا اکثر باتوں باتوں میں کبھی کبیرداس کے دوہے اور کبھی امیر خسرو کے اشعار کبھی غالب اور اقبال کے اشعار موقع محل کی مناسبت سے دہرایا کرتے تھے۔ اب میرا جی چاہا کہ میں ایک ڈائری بناؤں جس میں اچھے اچھے اشعار لکھا کروں۔ میں اب نویں جماعت میں پہنچ چکی تھی۔ کہانیوں کے بجائے اب اے آر خاتون اور زبیدہ خاتون کے ناول اچھے لگتے تھے۔ میں نے بھائی سے ڈائری منگوائی۔ انہوں نے پوچھا کیا کرو گی۔ میں نے کہا اشعار لکھوں گی۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی ڈائری لادی۔ مجھے جہاں سے بھی کوئی اچھا سا شعر ملتا میں نوٹ کر لیتی۔ مجھے کبھی مزاحیہ اور عامیانہ قسم کے اشعار پسند نہیں آئے۔ میں صرف وہی اشعار ڈائری میں نوٹ کرتی جو میرے دل کو چھو لیتے تھے۔

انہی دنوں ایک دن میں اور ریحانہ حسب معمول ہنستے کھیلتے سیدھے راستہ کے بجائے لمبے لمبے راستوں سے اسکول کی جانب جا رہے تھے ہمارا اسکول گھر سے تقریباً تین چار اسٹاپ دور تھا مگر ہم پیدل بھی سیدھے راستہ سے آتے جاتے نہیں تھے کیونکہ وہ راستہ ہمیں چھوٹا لگتا تھا۔ ہم پیچھے پیچھے کی گلیوں سے لمبے لمبے راستوں سے آتے جاتے۔ ہماری باتیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ اسکول کی باتیں، ٹیچرز کی باتیں، فلمی گانوں کی باتیں، فلمی ایکٹریس اور ایکٹروں کی باتیں، ناول اور افسانوں کی باتیں۔ کبھی کبھی تو ہم سارا راستہ اپنے پڑھے ہوئے کسی ناول کی پوری اسٹوری دوسرے کو سناتے جاتے یا فلم کی اسٹوری سناتے جاتے۔ بس یوں لگتا جیسے زندگی کا سفر بس ایک لمحہ ہے۔ یہ خوشیوں بھرا لمحہ اتنا مختصر ہو جاتا کہ ہم دوسرے دن اور لمبے راستہ کو تلاش کرنے کا عہد کرتے۔

ہمارے ساتھ ساتھ گلی کے اب سارے لڑکے بھی جوان ہو چکے تھے اور معاشرتی ماحول کے مطابق اب ہم نے ان کے ساتھ کھیلنا بھی بند کر دیا تھا اب ہمارے درمیان عورت اور مرد کی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھار گلی کا کوئی لڑکا ہمارا پیچھا کرتا یا فلیٹوں میں آمنے سامنے گھر ہونے کی وجہ سے تاکنا جھانکنا لگا رہتا۔

اس دن ریحانہ راستے میں کہنے لگی یار تیری بلڈنگ سے چوتھی بلڈنگ میں ایک لڑکا رہتا ہے۔ پہلے تو میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا مگر اب مجھے پتا

چلا ہے کہ وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اسکول آتے جاتے تو چونکہ ہم دونوں ہوتے ہیں اس لئے کسی کو جرأت نہیں ہوتی مگر اکیلے میں میں کئی بار اسے دیکھ چکی ہوں۔ میں ہنس پڑی اور اسے چھیڑنے کے انداز میں بولی۔ بچ کر رہنا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ گھر آکر جب تنہائی میں مجھے یہ بات یاد آئی تو دل نے کہا۔ مرد محبت کے قابل نہیں ہوسکتا۔ محبت کا حق تو صرف اللہ ہی کو پہنچتا ہے۔ محبت تو بہت ہی اعلیٰ جذبہ ہے۔ اس عظیم جذبے کا اظہار اللہ کے سوا کسی اور سے کیسے کیا جاسکتا ہے۔ میں نے سوچا مرد سے محبت کرنا محبت کی توہین ہے۔ میرے نزدیک محبت کا دوسرا نام بندگی تھا۔ میں نے اندر اندر ہی عزم کرلیا کہ میں مرد سے محبت نہیں کروں گی اور کسی مرد کی محبت میں گرفتار نہ ہوں گی۔ عقل نے کہا مگر شادی تو کرنا ہی ہوگی۔ میں بہت دیر تک اس بات کو سوچتی رہی کہ شادی کس طرح کے آدمی سے کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک شادی کا مقصد انسانیت کی خدمت تھا۔ ایسی خدمت جس سے اللہ پاک بہت خوش ہوجائے اور اس شخص کو فائدہ پہنچے اور میرے ماں باپ کا نام بھی روشن ہوجائے۔ مجھے اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کی خوشی کا بے حد خیال تھا اور اس وجہ سے تھا کہ اللہ چاہتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ محبت اور ادب کا سلوک کیا جائے۔ میرے اندر ادب اور فرمانبرداری بہت تھی۔ شروع ہی سے میرے اندر یہ خواہش تھی کہ ایسا کام کروں جس سے مرنے کے بعد بھی لوگ مجھے یاد رکھیں۔ اس خیال سے جو بات بھی ذہن میں آتی وہ یہ ہوتی کہ میرا جی

چاہتا کہ میں مر کے پھر زندہ ہوجاؤں اور مرنے کے بعد کے حالات کو جان کر پھر اس دنیا میں آکر اپنے گھر والوں کو بتاؤں۔ بچپن ہی سے دل کا یہ تقاضہ دن بدن بڑھتا ہی جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ میری مجبوری بن جاتا اور میں مرنے کے طریقے سوچنے لگتی۔ گیلری سے چھلانگ لگادوں۔ موٹر کے نیچے آجاؤں۔ اگر کوئی چیز اس خیال پر عمل کرنے میں مانع تھی تو وہ ماں کی محبت اور اس بات کا خوف تھا کہ اگر مرنے کے بعد غیب میں داخل ہوکر واپس دنیا میں نہ آئی تو میرا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ پھر جب بھی میرے دل میں ایسا تقاضہ اٹھتا تو صرف دعا مانگنے پر اکتفا کرتی۔ اس طرح بچپن ہی سے میں تقریباً ہر روز دن میں کئی کئی بار موت کی دعا کرنے کی عادی تھی۔ مگر یہ محض عادت نہیں تھی بلکہ بچپن ہی سے میرے اندر بڑی شدت سے مرنے کا تقاضہ پیدا ہوتا رہا۔ جب بھی مرنے کا تقاضہ پیدا ہوتا پہلے تو دل اس تقاضہ پر خود اپنے آپ کو تسلی دیتا مگر لمحہ بہ لمحہ غیب میں داخل ہونے کا شوق بڑھتا ہی جاتا اور اتنی شدت ہوجاتی کہ میں مرنے کی دعا کرنے پر مجبور ہوجاتی۔ اس لمحے پردے کے اندر مجھے اللہ دکھائی دیتا اور اللہ سے ملنے کا اشتیاق مجھے مرنے پر اکساتا رہتا۔ میرے ذہن میں یہ بات آتی کہ کوئی اچھا کام کر کے اللہ کے پاس جانا چاہئے تاکہ اللہ کی قربت حاصل ہوسکے۔ اگر میں نے کوئی بڑا کام نہ کیا تو اللہ مجھے اپنے سے دور کردے گا اور میں اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکوں گی۔ پھر کیا ہوگا اس کے ساتھ ہی میرا یہ خیال بچپن ہی سے تھا کہ اللہ مجھ سے بہت

محبت کرتا ہے۔ امی کہا کرتی تھیں کہ اللہ میاں صرف اچھے لوگوں سے ہی
محبت کیا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر وقت میرے ذہن میں اچھا انسان بننے
کی تمنا تھی کہ اچھا بننے کے لئے کون سا عمل کروں۔ شادی کے خیال سے
ذہن میں یہ بات آئی کہ ایک لڑکی کے لئے شادی کے بعد کی زندگی زیادہ لمبا
اور زیادہ باشعور وقفہ ہوتا ہے۔ جس میں وہ کوئی اچھا کام کرسکتی ہے۔ میں نے
سوچا۔ شادی ایسے شخص سے کرنی چاہئے جو میری زندگی کے مقصد کو پورا
کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ میرے ذہن میں خیال آیا میں کسی لنگڑے سے
شادی کروں گی۔ پھر اس سے بہت محبت کروں گی اور اس کی خوب خدمت
کروں گی کہ وہ اپنے لنگڑے پن کو بھول جائے گا۔ پھر سوچا نہیں لنگڑا پن تو
اتنی زیادہ معذوری نہیں ہے۔ ایک لنگڑا آدمی بیساکھی کی مدد سے بھی چل پھر
سکتا ہے۔ سوچا گونگا بہرہ ہونا چاہئے۔ بہت دیر سوچتی رہی کہ اس کی ایسی
خدمت کروں گی یوں کروں گی وہ کروں گی سب کام چھوڑ کر اس کا دل بہلاؤں
گی وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کئی دن میں اسی خیال پر غور و فکر کرتی رہی۔ ہر مرتبہ ذہن
میں انسان کی کوئی نہ کوئی معذوری آجاتی اور میں اس معذور آدمی کو اپنے
شوہر کے تصور میں دیکھتی اور اس سے بے پناہ محبت کے ساتھ اس کی خدمت
کا تصور کرتی۔ پھر مجھے اس بات کا اطمینان ہوجاتا کہ میرے ماں باپ اور
میرے بہن بھائی اور میرا رب مجھ سے اس بات پر خوش ہے مگر پھر چند دن بعد

ذہن اس خیال کو رد کردیتا۔ میں اس سے زیادہ معذور اور بے بس آدمی
تلاش کرتی۔ ایک مرتبہ مجھے خیال آیا کہ کسی اندھے آدمی کے ساتھ شادی
کرلوں۔ اس خیال کے آتے ہی دل کے اندر جیسے چھن سے آواز آئی۔ یوں
لگا جیسے ہاتھوں سے شیشے کی کوئی چیز چھن سے فرش پر گر کر ٹوٹ گئی ہے۔ دل
کی یاس بھری آواز آئی۔ پھر وہ میری صورت کیسے دیکھ سکے گا بغیر دیکھے محبت
کیسے ہوسکتی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا وہ مجھ سے محبت کرے نہ کرے
میں تو اس سے محبت کرتی رہوں گی۔ اس کی خدمت اس طرح کروں گی کہ
میں اس کی ضرورت بن جاؤں گی۔ پھر وہ مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہوجائے
گا۔ غرض کہ بالآخر بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد دل نے یہی فیصلہ کیا کہ
ایک اندھے کو سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت کم لوگ
اسے سہارا دے سکتے ہیں جو اس کی محرومیوں کے احساس کو ختم کردیتا ہے۔
میں نے سوچا میں اسے ایسا ہی سہارا دوں گی جو اس کے احساس محرومی کو ختم
کر کے ابدی خوشیوں سے ہمکنار کردے۔ میں اس خیال سے بہت خوش
ہوگئی کہ پھر مجھے اللہ میاں کو خوش کرنے کے بہت سے مواقع حاصل ہوجائیں
گے۔ اس وقت میری عمر کوئی پندرہ سال کی تھی۔ اب مجھے یہ بھی خدشہ ہوا
کہ اگر امی میرا فیصلہ سنیں گی تو انہیں بہت رنج ہوگا۔ بھلا کوئی بھی ماں اپنی
بیٹی کی شادی کسی اندھے شخص کے ساتھ کرنے پر کیسے راضی ہوسکتی ہے۔
اندر ہی اندر میں نے انہیں منانے کے بہت سے طریقے سوچ لئے کہ اس

طرح کہوں گی کہ آپ نے ہی تو سکھایا ہے کہ مخلوق خدا سے محبت اور سلوک کرنا چاہئے۔ اللہ نیکی سے خوش ہوتا ہے۔ کوئی ایسی نیکی کرنی چاہئے جس سے اللہ راضی رہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے امید تھی کہ امی مان جائیں گی اور اگر نہ مانیں تو شادی تو مجھے کرنی ہے۔ شادی کا فیصلہ میرا ہی ہونا چاہئے۔ میں اپنا ارادہ استعمال کروں گی اس طرح بہت دنوں کے بعد کہیں جاکر دماغ سے یہ خیال ہٹا اور میں مطمئن ہوگئی۔

میں نے ایک دن اسکول کے راستہ میں یہ بات ریحانہ سے کہی۔ اس نے کہا۔ نہ بابا یہ تو بہت ہی مشکل کام ہے تو کیسے کرے گی۔ میں نے کہا مگر اس سے اللہ تو خوش ہوجائے گا نہ۔ بس مجھے یہی چاہئے۔ وہ بولی چلو دیکھتے ہیں تقدیر کہاں ٹکراتی ہے۔ پھر بولی۔ میں نے جو اس دن ایک لڑکے کا ذکر کیا تھا نا۔ میں نے کہا۔ کون سا لڑکا۔ کہنے لگی وہی جو تیری بلڈنگ سے چوتھی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا اسے۔ بولی وہ مجھے ملا تھا۔ میرے منہ سے ایک دم نکلا چلو چھٹی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔ وہ بولی۔ نہیں یار وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ بڑے اچھے خاندان سے ہے۔ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ بہن شادی شدہ ہے۔ میں نے کہا۔ ہائیں۔ اس کا سارا شجرہ نسب تو نے ایک ہی ملاقات میں پوچھ لیا۔ وہ ہنسی بولی "نہیں" میں اس سے کئی بار مل چکی ہوں۔ چند لمحے کو آتے جاتے ہماری ملاقات ہوجاتی ہے۔ میں نے کہا۔ سوچ سمجھ کر کام کرنا۔ تمہارے ابا سخت ہیں۔ خیر میں اس کی

ہمراز بن گئی۔ کوشش تو میں نے بہت کی کہ وہ اس چکر بنتے کرتے
اسے سیریس دکھ کر میں بھی چپکی ہو رہی۔ اس نے مجھ
ملوادیا۔ وہ اچھا لڑکا تھا اور شاید میڈیکل کے تیسرے
کبھی کبھی اسکول کے راستے میں مل لیتا۔ ریحانہ کے ساتھ میری دوستی اسی وجہ سے بہت عرصے سے ساتھ قائم تھی کہ ہم نے کبھی مذاق میں بھی بے ہودہ اور اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کی۔ ہمارا وہ ذہن ہی نہیں تھا۔ مجھے ان دونوں کی محبت میں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ نہ ہی ریحانہ نے مجھ سے کوئی ایسی بات کی۔ بھلا میں اسے کیا روکتی میں تو خود کتنے ہی دنوں سے ایک عجیب پریشانی میں مبتلا تھی۔

چھ سات مہینے ہوچکے تھے۔ میرے دل میں رہ رہ کر بڑی شدت سے یہ تقاضہ اٹھتا۔ کہیں سے اللہ مجھے مل جائے تو میں اس سے باتیں کروں۔ اسے خط لکھوں۔ مجھے یوں لگتا جیسے اللہ بھی میری طرح کے جذبات رکھتا ہے۔ ہر روز اتنی شدت سے مجھے اللہ کی یاد آتی کہ میری جان نکلنے لگتی۔ بس میرا جی چاہتا میں اسے خط لکھوں اور اس کے لئے میرے دل میں جو عشق کی آگ جلی ہوئی ہے اس کا سارا حال لکھ دوں اور پھر میرا جی چاہتا وہ بھی میرے خط کا جواب دے۔ عجیب پاگلوں جیسا تقاضہ تھا۔ نہ میں اپنا حال کسی کو دکھا سکتی تھی نہ ہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ کہتی بھی تو کوئی کیا کرلیتا۔ الٹا مجھے دیوانہ ہی سمجھتا۔ کیا کروں کہاں جاؤں۔ دل اندر اندر جلتا تھا۔ لب اوپر اوپر ہنستے تھے۔

ذرا تنہائی ملتی تو میں اس خیال کی گہرائی میں ڈوب جاتی۔ کبھی سوچتی خط لکھ کر دریا میں ڈال دوں۔ دل کہتا اگر وہ میرا خط وصول بھی کرے تو مجھے اس کا جواب کہاں سے ملے گا۔ دل خود ہی جواب دیتا۔ اللہ کے لئے کیا مشکل ہے۔ ہوا کے دوش پر مجھے اس کا جواب مل جائے گا۔ کبھی سوچتی خط لکھ کر کسی پتھر کے نیچے دبادوں۔ پھر دل بیٹھ سا جاتا جانے اللہ میرا خط پڑھنا پسند بھی کرے گا یا نہیں۔ جب تک اس کا جواب نہیں ملے گا مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ اسے میرا خط پسند آیا ہے۔ پھر سوچتی وہ کیسے خط لکھے گا۔ کیا وہ کسی کاغذ پر ہوگا کیا وہ اپنا نام آخر میں اللہ لکھے گا۔ میرا جی چاہتا اللہ مجھ سے بہت پیار کرے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر کے والہانہ جذبات کا سارا بہاؤ اللہ کی جانب تھا۔ کسی مرد سے محبت کرنا میرے نزدیک محض جذبات کی تسکین تھی۔ میں اسے بہت گھٹیا سمجھتی تھی۔ اندر کی یہ باتیں میں کسی سے نہیں کرسکتی تھی۔ حتیٰ کہ کبھی ریحانہ سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ مجھے معلوم تھا وہ بھی نہیں سمجھے گی۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔ مگر میں اس کے دل کا حال خوب اچھی طرح پہچانتی تھی۔ مجھے اس سے اس قدر محبت تھی کہ میری نظر اس کے اندر دیکھ لیتی تھی۔ مجھے اس کے کہنے سے پہلے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ وہ اب کیا بولنے والی ہے۔ جب میں اپنے منہ سے وہی الفاظ نکالتی تو وہ چونک پڑتی۔ تجھے کیسا پتہ میں یہی کہنے لگی تھی۔ میں ہنس پڑتی۔ ان دنوں مجھے بھی بھلا کیا پتہ تھا۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ میرے اندر یہ صلاحیت ہے۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ

سب کے اندر ایسی صلاحیت ہوتی ہیں اور سب ان کا استعمال اسی طرح کرتے ہیں مگر پھر آہستہ آہستہ پتہ چلتا گیا کہ یہ خصوصیات صرف میرے ساتھ ہیں۔ شروع شروع میں میں اپنی اندرونی کیفیات کسی کو اس لئے نہیں بتاتی تھی کہ سب کچھ مجھے فطری جذبہ لگتا تھا کہ سب کے ساتھ ہی تو ایسا ہے۔ اس کا کیا ذکر کرنا بعض کو اس لئے نہیں بتاتی تھی کہ لوگ مجھے پاگل نہ سمجھیں۔

دن گزرتے چلے گئے۔ میرے دل کا تقاضہ کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناتواں جسم کے اندر کیا کیا روگ پل رہے تھے۔ اللہ کو خط لکھنے کا ارمان۔ غیب میں داخل ہو کر غیب کو اچھی طرح سے جان لینے کا شوق۔ مرنے کی آرزو۔ میرا جی چاہتا میں گہری نیند سوجاؤں کوئی مجھے نہ جگائے۔

ریحانہ اور صفدر کی محبت آکاش بیل کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں ہی بہت سیریس تھے۔ ریحانہ کا خیال تھا کہ اس کے ڈاکٹری پاس کرتے ہی وہ اس سے شادی کرلے گی۔ مگر کبھی کبھی وہ بہت پریشان بھی ہوجاتی تھی کہ پتہ نہیں اس کے ماں باپ مانیں گے بھی یا نہیں۔ اس کے ماں باپ برادری سے باہر شادی کرنے کے قائل نہیں تھے۔

ان دنوں میرے نویں کلاس کے امتحان قریب تھے۔ روزانہ گیلری میں بیٹھی پڑھائی کرتی۔ ایک دن شام کے وقت حسب معمول پڑھائی کررہی تھی کہ سامنے والی بلڈنگ کی گیلری میں نظر پہنچی۔ کرسی پر ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی گلی کے سارے لڑکے دیکھے بھالے تھے یہ کوئی نیا تھا۔ ہماری گلی کا نہ تھا۔ وہ

کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ امتحانوں کا زمانہ تھا۔ میں جان گئی کہ امتحانوں کی تیاری کررہا ہوگا۔ فطری جستجو کے تحت خیال آیا شاید میٹرک کا امتحان دینا ہوگا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک دم سے اس لڑکے کی نظر میری جانب اٹھی۔ ہماری نظریں ٹکرائیں اسی لمحے نہایت ہی تیزی سے فلیش لائٹ آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔ اور دل میں جیسے کسی نے بالٹی بھر کہ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی انڈیل دیا۔ جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے پورے سینے میں محسوس کی۔ اب میں پوری طرح ٹرانس میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بالٹی بھرپانی آہستہ آہستہ میرے اندر اتر رہا تھا۔ اس کی ٹھنڈک مجھے محسوس ہورہی تھی۔ میری ساری قوتیں جیسے بالکل ختم ہوگئیں۔ کھڑے ہونے کی بھی جان نہ رہی۔ میں گیلری میں ہی بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک آئے۔ میرا ذہن بالکل ماؤف ہوچکا تھا۔ ایک الہامی سی کیفیت میرے اوپر طاری تھی۔ میں اس کیفیت و حالت کو خوب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ فلیش لائٹ اب ذرا آہستہ آہستہ آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ جیسے کوئی تیز فلم چلا رہا ہے۔ سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ کیا مجھے عشق ہوگیا ہے؟ پھر اس تیز چلتی فلم میں میں نے اپنی زندگی کی پوری فلم دیکھ لی۔ میں اس وقت جان گئی کہ یہ میری زندگی ہے جو اللہ مجھے دکھا رہا ہے۔ مگر اس زندگی میں سے جو تفصیل میں دیکھ سکی وہ یہ تھی کہ میں اس لڑکے کی بیوی ہوں اور اس زندگی میں میرا اس کا ساتھ ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ پانی جیسے سارا میرے اندر انڈیل

دیا اور یہ فلم بھی ختم ہوگئی۔ اور میں اس کیفیت سے باہر آگئی۔ میری حالت عجیب ہو رہی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ عقل گھبرا گئی۔ اب کیا ہوگا۔ میں نے اپنے اوسان بحال ہونے کے لئے چند لمبے لمبے سانس لئے پھر دل میں اللہ میاں سے مخاطب ہوئی۔ اے اللہ۔ میں جانتی ہوں تو نے مجھے میری تقدیر دکھا دی ہے مگر میں تو اس لڑکے کو جانتی تک نہیں اس سے پہلے اسے کبھی دیکھا تک نہیں۔ مجھے اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے بے حد محبت ہے۔ میں تو اس لڑکے سے ملنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ یہ سب کیسے ہوگا۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے اگر میں اس لڑکے سے نہ ملی تو مرجاؤں گی۔ ننھی منی عقل اس سارے حالات کے سامنے ایک تماشائی بن گئی۔ میرے اوپر جیسے کسی نے چکی کے دونوں پاٹ رکھ دیئے ہیں۔ رنج و غم اور خوف کے بوجھ تلے مجھے سانس لینا دشوار تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب میں کون سا قدم اس سلسلے میں اٹھاؤں۔ اللہ کو کیا منظور ہے۔ سخت رنج تھا۔ اللہ سے کوئی شکایت کرتے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تب میں نے اپنی ہمت کو یکجا کرتے ہوئے اللہ سے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھ پر رحم فرما اور مجھے صحیح راستہ دکھا۔ اس وقت اندر سے ایک آواز آئی کہ ہم نے تمہاری شادی منظور کرلی ہے۔ دکھ کے مارے میرا دل اندر ہی اندر چیخ اٹھا۔ جی چاہتا تھا خوب روؤں مگر اندر کمرے میں سارا گھر بھرا ہوا تھا۔ آنسو پونچھ کر اس طرح بن گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میری زندگی ظاہر باطن دونوں

راستوں پر اپنی چال چل رہی تھی۔

مجھے عشق میں کبھی کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ عشق ایک فطری جذبہ ہے۔ فطری جذبے کی تکمیل نہ ہو تو زندگی کسک بن جاتی ہے ادھوری رہ جاتی ہے۔ عشق کو میں ایک بہت ہی پاک جذبہ و تقاضہ سمجھتی تھی۔ اس وقت تک مجھے مرد عورت کے جنسی تعلقات کا بھی کچھ علم نہ تھا کیونکہ میں نے کبھی اس قسم کی باتیں کسی سے کی ہی نہیں تھی۔ ریحانہ بھی بہت اچھی لڑکی تھی۔ بہت باحیا۔ وہ صفدر کے ساتھ ملتی ضرور تھی مگر نہ کبھی میں نے اس سے اس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی نہ اس نے مجھے بتایا۔

میرے نزدیک عشق کا مطلب خوبصورت الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار تھا مگر وہ بھی زبان سے نہیں۔ بلکہ تحریر سے یا دل کے اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر والہانہ کیفیات کے ذریعے سے۔ میرا محبوب کے ساتھ بس ایک ہی تقاضہ تھا کہ میری نظر اسے دیکھتی رہے اور بس۔ میں سوچتی عشق کی تکمیل دیدار ہی تو ہے۔ جب نظر محبوب کو دیکھ لیتی ہے تو دل کو تسکین حاصل ہوجاتی ہے۔

روحانی تعلق

کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ میرے اندر ایک ہوک سی اٹھی اور جب تک میں گیلری میں آکر اسے دیکھ نہ لیتی مجھے چین نہ آتا۔ میں بہت سوچتی کہ مجھے کس مصیبت میں ڈالا گیا ہے۔ مجھے مرد کی نہیں' اللہ کی محبت چاہئے۔ اندر سے اشارہ ملتا یہ جذبہ اللہ کی طرف سے ہے۔ چند روز بعد ہم سب اپنی اپنی پڑھائی میں مشغول ہوگئے۔ ہماری ملاقات بس کبھی کبھار دیکھنے کی حد تک رہ گئی۔ امتحان ختم ہوگئے۔ اس قصے کو تقریباً دو ماہ گزر چکے تھے۔ لیکن شام کو میں گیلری میں کھڑی تھی سامنے نظر کی تو وہ لڑکا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور خدا حافظ کے لئے ہاتھ ہلادیا۔ میں گھبرا کے کمرے کے اندر چلی آئی مگر دل کو ایک دھچکہ سا لگا۔ یہ تو جا رہا ہے۔ شاید لاہور سے آیا ہوگا کیا پتہ کہاں سے آیا ہے کہاں جا رہا ہے مجھے تو ابھی تک اس کا نام بھی نہیں معلوم۔ اب کیا ہوگا۔ پتہ نہیں اب میں اسے دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اللہ میاں سے کہا یا اللہ میں تو ایک خوش باش زندگی کی خواہش رکھتی ہوں اس زندگی کی

لکھنے کا مقصد پورا نہ ہونا۔ اس لڑکے کو دیکھنے کی خواہش۔ مجھے ایسا لگتا جیسے کسی نے مجھے بھٹی میں ڈال دیا ہے۔ اندر کی شامہ جلتی رہتی۔ اوپر کی شامہ ہنستی کھیلتی رہتی۔ میری ظاہری زندگی میں ذرا بھی تبدیلی نہ تھی۔ میں نے اپنی کمزوری ظاہر کرنا کبھی پسند نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی اپنے دل کا حال کسی پر کھولنا چاہا۔ یہ تینوں خواہشات ایسی تھیں کہ جیسے بالکل ایک برابر تھیں۔ روزانہ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں جانکنی کے عالم میں ہوں۔ عموماً" ایسی حالت شام کے وقت ہوتی۔ جب میں گیلری میں کھڑی ہوکر اپنے خیالوں میں گم اپنی خوشیوں کو تلاش کرتی کبھی خلاؤں میں گھورتا ہوا دل پکارتا' اے میرے رب میں تجھے کس طرح خط لکھوں میرا جی چاہتا ہے میں تجھے اچھے اچھے الفاظ میں پکاروں۔ میں کیا کروں۔ کیسے اس خواہش کو ختم کروں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ کبھی سڑک پر چلنے والوں میں ریحانہ اور اس لڑکے کو تلاش کرتی۔ اب جب وہ دن یاد آتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ انسان بھی کتنا پراسرار ہے اس کے من کی دنیا سے کوئی دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ ریحانہ کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش نے مجھے جلتی آگ میں جھونک دیا تھا اور ریحانہ کو پتہ بھی نہ تھا میں اس کے ساتھ اتنی نارمل رہی کہ کبھی ایسی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ میں چاہتی تو اس کے والدین کے گھر جا کر اس سے ملنے کا سامان کر لیتی مگر میں خوب جانتی تھی کہ ریحانہ کے پردے میں مجھے کس کو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ وہ ہستی جو کبھی کبھی میرے تصور کے پردے کے پیچھے سے دکھائی دیتی ہے اور پھر

کئی کئی دن چھپ جاتی ہے۔ جب وہ چھپ جاتی تو میری نظر اسے دنیا میں ڈھونڈنے لگتی۔ میرا دل ریحانہ سے ملنے اور بات کرنے کو نہیں صرف ایک نظر دیکھنے کو چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی ریحانہ تو کیا کوئی بھی اس راز کو سمجھ نہ سکے گا۔ چار پانچ سال کی دوستی میں میں نے کبھی ریحانہ سے یہ نہیں کہا کہ بچھڑ گئے تو یاد کریں گے۔ پھر اس لڑکے کا روگ میری جان نکالے دیتا تھا۔ میں تو یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ کسی دوسرے شہر جا چکا ہے اس کو تو کچھ علم نہیں اور میں خواہ مخواہ اس کی یاد میں شمع کی طرح جل کر پگھل رہی ہوں۔ اللہ میاں کی یہ حکمت میری سمجھ میں نہ آئی تھی مگر اللہ کی رضا کو جانتے ہوئے چپ چاپ انتظار میں تھی۔

ایک دن گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ نہایت تیزی سے کوئی شخص برابر میں آیا اور میرے ہاتھ میں ایک خط دے کر یہ کہتا ہوا اس کا جواب ضرور دینا۔ اتنی ہی تیزی سے واپس چلا گیا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ مجھے تو سوچنے کا بھی موقعہ نہ ملا۔ جب میرا دماغ ٹھکانے آیا تو دل نے کہا یہ تو وہی ہے۔ گھبراہٹ کے مارے میں نے جلدی سے خط اپنی مٹھی میں دبالیا اور ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ گھر آکر کتاب میں چھپا کر وہ خط پڑھا' لکھا تھا۔

آپ بھی حیران ہوں گی کہ یہ دیوانہ کون آگیا نہ آپ مجھے جانتی ہیں نہ میں آپ کو جانتا ہوں۔ مگر جب سے دیکھا ہے دن بدن یوں لگتا ہے جیسے ہم

جنم جنم کے شناسا ہیں۔ میرے شب و روز کے ہر لمحے میں آپ میرے ساتھ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امتحان کے زمانے کے وہ چند دن جو میں نے آپ کی گلی میں گزارے تھے وہ دن کسی طرح بھولتے ہی نہیں۔ آج بھی آپ کی حیا بار پلکیں اسی طرح میری جانب اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ آپ کے مسکراتے لب مجھے زندگی کا پیغام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کتنی بار آپ کو دیکھنے اور ملنے کی کوشش کی مگر نہ جانے آپ کہاں چھپی بیٹھی ہیں۔ کتنے دنوں سے یہ خط لکھ کر رکھا ہے اور آپ تک رسائی ہونے کے لئے جانے کتنے دن اس غریب خط کو لگیں گے۔

آپ کا

"وہ"

خط پڑھ کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ الٰہی یہ کیا ہوا۔ میرے سینے میں پھر وہی ٹھنڈک محسوس ہوئی جیسی پہلے دن اسے دیکھنے میں ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے اللہ نے میری سن لی ہے۔ کمسن جوانی کا یہ پہلا پہلا لمحہ تھا۔ میرے اندر باہر کا ہر تار بجنے لگا۔ میں نے دوبارہ سہ بارہ خط پڑھا۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے اندر اتر گیا۔ میں نے سوچا۔ لڑکا تو اچھا اور شریف معلوم ہوتا ہے۔ خط کی عبارت بھی معقول ہے۔ میرے اندر محبت کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اس لڑکے سے بہت ہی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ اسی وقت دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہیں اللہ میاں ناراض نہ ہوجائیں

کہ میں اللہ کی بجائے ایک لڑکے سے اتنی محبت کر رہی ہوں۔ میں نے اللہ میاں سے کہا یا اللہ ناراض نہ ہونا۔ مجھے جو محبت تجھ سے ہے وہ کسی سے نہیں ہوسکتی مگر تو جانتا ہے کہ میں ایک نوجوان لڑکی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھ سے پیار کرے۔ میری محبت کا اقرار کرے۔ یہ میرا فطری تقاضہ ہے۔ یہ میری ضرورت ہے میرے اللہ یہ تقاضہ اور ضرورت بھی تیری ہی پیدا کردہ ہے تو ہر ضرورت سے بے نیاز ہے۔ مگر تو بندوں کی حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے تو یہ نہ سمجھنا کہ میں دنیا کی محبت میں تیری محبت کو بھلادوں گی۔ ایسا نہیں ہوسکتا تو ہی میری منزل ہے میری تلاش ہے۔ تیری محبت میری روح میں رچی ہوئی ہے۔ اسے کوئی کم نہیں کرسکتا۔ یہ سب کچھ کہہ کر میرا دل ہلکا ہوگیا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ اللہ مجھ سے خوش ہے اور میری ہر خواہش اور ہر تقاضہ کی تکمیل کا سامان کر رہا ہے۔

دو تین دن تک میں نے اس خط کو چھپا چھپا کر رکھا اور جانے کتنی بار پڑھا۔ پھر میں سوچنے لگی نہ جانے کب ملاقات ہو۔ اس خط کو میں کب تک چھپا کر رکھوں گی کسی نے دیکھ لیا تو پتہ نہیں ایسے خطوط کو کیا کرتے ہیں۔ عقل نے جواب دیا واپس کردیتے ہیں۔ اب میں دعا کرنے لگی جلدی سے کہیں مل جائے تو اچھا ہو تاکہ خط واپس کردوں۔ تیسرے دن چھوٹی بہن کے ساتھ باہر نکلی چند گلیاں چھوڑ کر ایک گلی میں گزر رہی تھی کہ ایک دم سے کوئی تیزی سے میرے برابر آگیا۔ آہستہ سے بولا۔ خط پڑھ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی

تھا میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگا کیا نام ہے آپ کا۔ میں نے کہا شمامہ۔ کہنے لگا میں حبیب ہوں۔ کتنی بار آپ سے ملنے کی کوشش کی آپ نظر ہی نہیں آتیں۔ میں نے کہا۔ میں سمجھی آپ کسی دوسرے شہر سے آئے تھے۔ امتحان دے کر واپس چلے گئے۔ اس نے بھرپور نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ اسکول کا کیا ٹائم ہے آپ کا۔ میں نے کہا بارہ بجے سے شام پانچ بجے تک۔ کہنے لگا میں ملوں گا۔ میں نے جلدی سے پوچھا اس خط کا کیا کروں۔ وہ شاید سمجھا نہیں کہنے لگا۔ کیا آپ نے پڑھا نہیں ابھی تک۔ میں نے کہا پڑھ تو لیا ہے مگر اب کیا کروں۔ کیا آپ کو واپس کردوں۔ وہ مسکرایا نہیں اس کو پھاڑ دینا۔ مگر جواب ضرور دینا۔ یہ کہہ کر وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ وہ تو چلا گیا مگر میں دل ہی دل میں سخت شرمندہ تھی کہ کہتا ہوگا عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔ گھر آکر میں نے اس خط کو پھر ایک بار پڑھا۔ مجھے اس کا پھاڑنا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ میں نے سوچا اگر کسی کا ڈر نہ ہوتا تو میں ضرور اسے سنبھال کر رکھتی۔ اپنے رب کو خط لکھنے کے لئے میں کب سے بے چین تھی۔ دل اندر ہی اندر محبوبیت کے الفاظ دہراتا رہتا تھا۔ مگر وہ سب اللہ کے لئے تھا۔ رات کو میں جب خط لکھنے بیٹھی تو دل نے اپنا سب راز اگل دیا۔ میں خود اپنا خط پڑھ کر حیران رہ گئی۔ میرے حافظے میں ہربات اسی طرح محفوظ ہے۔ وہ خط یہ تھا۔

میرے وجود کا ہرذرہ آپ کو سلام کہتا ہے۔ محبت تو ایک ایسا جذبہ ہے

جو روح کی گہرائیوں میں پلتا ہے۔ جب محبت کرنے والے دو دل آپس میں ملتے ہیں تو رحمت خداوندی جھوم اٹھتی ہے۔ فرشتے سر بسجود ہوجاتے ہیں۔ میرے نزدیک محبت ایک بہت ہی پاک اور عظیم چیز ہے۔ یہ دنیاوی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ دنیا کی ہر شے کا تعلق جسم سے ہے مگر آفاق کی ہر شے کا رشتہ روح کے ساتھ ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ محبت کے کیا معنی لیتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ محبت میرے لئے بندگی کی طرح ہے اور میں بندگی کبھی چھوڑ نہیں سکتی۔ زندگی کا ہر رشتہ ٹوٹ سکتا ہے مگر محبت کے رشتے نہیں ٹوٹ سکتے۔ سانس کے تار جسم سے باندھے جاتے ہیں مگر محبت کے تار دلوں سے بندھتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہم دونوں مل کر محبت کے ان لمحات کو ابدی بنادیں۔

شمامہ

یہ خط لکھ کر مجھے ایسا اطمینان ہوا جیسے مدتوں کے پیاسے کے حلق میں کوئی پانی کی ایک بوند ٹپکا دے۔ دوسرے دن اسکول سے واپسی پر جیسے ہی میں نے راستے پر قدم رکھا۔ وہ آگیا۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ جب سے ریحانہ کا ساتھ چھوٹا تھا میں مین روڈ سے آنے جانے لگی تھی۔ مگر آج پھر میں نے ان ہی پرانے راستوں پر قدم رکھ دیا۔ اس نے پوچھا۔ آپ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں۔ میں نے کہا نویں کا امتحان دیا تھا اب دسویں میں ہوں۔ ان دنوں گیارہ کلاس کی میٹرک تھی۔ پھر میں نے پوچھا اور

"آپ"۔ بولا۔ میٹرک کا امتحان دینے آپ کی گلی میں آئے تھے۔ ہم چند
لڑکوں نے اسٹڈی کے لئے یہ فلیٹ لیا تھا اور اب سائنس کالج میں ہوں۔ بس
اس کے علاوہ پھر ہماری کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے ایسا
لگ رہا تھا جیسے میں زمین پر نہیں چل رہی بلکہ جیسے یہ خواب کی دنیا ہے۔ میرا
دل اندر ہی اندر اس سے باتیں کر رہا تھا مگر زبان بالکل خاموش تھی۔ دل اندر
ہی اندر کہہ رہا تھا تم میری محبتوں کے مرکز ہو۔ تم سے ہی میری زندگی ہے۔ تم
مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ میرا تمہارا رشتہ ازلی ہے۔ میری نظریں سامنے فضا
میں اٹکی ہوئی تھیں اور دل اندر ہی اندر اس طرح یہ سب کچھ کہہ رہا تھا جیسے
ایک ریکارڈ چل رہا ہو۔ وہ میرے برابر برابر ایک سائے کی طرح چلتا رہا۔ ہم
دونوں کی حالت سحر زدہ سی تھی۔ یہاں تک کہ راستہ ختم ہونے کو آگیا۔ میں
نے خط نکالا اور اسے پکڑا دیا۔ خدا حافظ۔ وہ جواباً بولا خدا حافظ۔ میں کل پھر
تمہیں ملوں گا۔ میری آنکھوں میں خوشی جھلکنے لگی۔ میں نے کہا اچھا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح وہ مل گیا۔ ہم اسی راستے پر چل نکلے۔
راستے پر قدم رکھتے ہی ریحانہ کا تصور آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی قطرہ قطرہ
میرے اندر سے نچوڑ رہا ہے۔ مجھ پر پھر جانکنی کی حالت طاری ہونے لگی۔ میں
نے اس دم دعا کی۔ یااللہ ریحانہ میری بہت عزیز سہیلی ہے اسے سدا خوش
رکھنا۔ بظاہر وہی کل والی حالت تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے
میری نظر فضا میں تھی خیال آیا بچپن کا وہ دور گزر گیا ہے جس میں میری محبت

کی تصویر ریحانہ تھی اب یہ تصویر حبیب ہے۔ میری سب سے پہلی تصویر جو
دنیا میں میں نے دیکھی وہ میری ماں ہے۔ ماں کا نقش بھی میرے دل کی گہرائی
میں منقش نظر آیا۔ جس کے ساتھ میرا ذہنی رابطہ اکثر رہتا تھا۔ پھر ریحانہ اور
آج حبیب ہے۔ میں بڑی ہوتی جا رہی ہوں۔ عمر کے ساتھ ساتھ میری
ضرورتیں بدل رہی ہیں۔ جب مجھے ماں کی ضرورت تھی تو اللہ نے ماں کا ساتھ
دے دیا۔ پھر سہیلی کی ضرورت پڑی کہ جو باتیں میں ماں سے نہ کہہ سکتی تھی
وہ سہیلی کے ساتھ کرتی تھی اور اب جو باتیں میں سہیلی سے بھی نہ کر سکتی تھی
وہ مجھے اس لڑکے سے کرنی ہیں۔ میں اندر ہی اندر اس تبدیلی پر غور کرتی
رہی۔ میرے اندر پھر خیالات کا ایک ریکارڈ چل گیا۔ اے میری زندگی کے ہم
سفر۔ اللہ نے تمہیں میرا ہم سفر چن لیا ہے۔ اللہ کا فیصلہ اور ارادہ انسان کے
ارادے پر غالب ہے۔ میں نے اللہ کے فیصلے پر سر جھکا دیا ہے۔ تم بھی اسے
قبول کرلو کیونکہ ہونا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ میں تمہیں اتنی محبت دوں گی
کہ تم اس محبت میں سب کچھ بھول جاؤ گے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے
لئے صرف یہی ایک چیز ہے۔

کل کی طرح آج بھی سارا راستہ خاموشی سے گزر گیا۔ یہ راستہ بہت
خاموش تھا۔ یہاں ذرا بھی ٹریفک نہ تھی۔ بہت بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں جن
کے احاطے کے اندر بڑے بڑے ہرے بھرے درخت لگے تھے اور یوں لگتا تھا
جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ صاف ستھرے ہرے بھرے راستے پر ہم دونوں

"آپ"۔ بولا۔ میٹرک کا امتحان دینے آپ کی گلی میں آئے تھے۔ ہم چند لڑکوں نے اسٹڈی کے لئے یہ فلیٹ لیا تھا اور اب سائنس کالج میں ہوں۔ بس اس کے علاوہ پھر ہماری کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں زمین پر نہیں چل رہی بلکہ جیسے یہ خواب کی دنیا ہے۔ میرا دل اندر ہی اندر اس سے باتیں کر رہا تھا مگر زبان بالکل خاموش تھی۔ دل اندر ہی اندر کہہ رہا تھا تم میری محبتوں کے مرکز ہو۔ تم سے ہی میری زندگی ہے۔ تم مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ میرا تمہارا رشتہ ازلی ہے۔ میری نظریں سامنے فضا میں اٹکی ہوئی تھیں اور دل اندر ہی اندر اس طرح یہ سب کچھ کہہ رہا تھا جیسے ایک ریکارڈ چل رہا ہو۔ وہ میرے برابر برابر ایک سائے کی طرح چلتا رہا۔ ہم دونوں کی حالت سحر زدہ سی تھی۔ یہاں تک کہ راستہ ختم ہونے کو آگیا۔ میں نے خط نکالا اور اسے پکڑا دیا۔ خدا حافظ۔ وہ جواباً بولا خدا حافظ۔ میں کل پھر تمہیں ملوں گا۔ میری آنکھوں میں خوشی جھلکنے لگی۔ میں نے کہا اچھا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح وہ مل گیا۔ ہم اسی راستے پر چل نکلے۔ راستے پر قدم رکھتے ہی ریحانہ کا تصور آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی قطرہ قطرہ میرے اندر سے نچوڑ رہا ہے۔ مجھ پر پھر جانکنی کی حالت طاری ہونے لگی۔ میں نے اس دم دعا کی۔ یا اللہ ریحانہ میری بہت عزیز سہیلی ہے اسے سدا خوش رکھنا۔ بظاہر وہی کل والی حالت تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے میری نظر فضا میں تھی خیال آیا بچپن کا وہ دور گزر گیا ہے جس میں میری محبت

کی تصویر ریحانہ تھی اب یہ تصویر حبیب ہے۔ میری سب سے پہلی تصویر جو دنیا میں میں نے دیکھی وہ میری ماں ہے۔ ماں کا نقش بھی میرے دل کی گہرائی میں منقش نظر آیا۔ جس کے ساتھ میرا ذہنی رابطہ اکثر رہتا تھا۔ پھر ریحانہ اور آج حبیب ہے۔ میں بڑی ہوتی جا رہی ہوں۔ عمر کے ساتھ ساتھ میری ضرورتیں بدل رہی ہیں۔ جب مجھے ماں کی ضرورت تھی تو اللہ نے ماں کا ساتھ دے دیا۔ پھر سہیلی کی ضرورت پڑی کہ جو باتیں میں ماں سے نہ کہہ سکتی تھی وہ سہیلی کے ساتھ کرتی تھی اور اب جو باتیں میں سہیلی سے بھی نہ کر سکتی تھی وہ مجھے اس لڑکے سے کرنی ہیں۔ میں اندر ہی اندر اس تبدیلی پر غور کرتی رہی۔ میرے اندر پھر خیالات کا ایک ریکارڈ چل گیا۔ اے میری زندگی کے ہم سفر۔ اللہ نے تمہیں میرا ہم سفر چن لیا ہے۔ اللہ کا فیصلہ اور ارادہ انسان کے ارادے پر غالب ہے۔ میں نے اللہ کے فیصلے پر سر جھکا دیا ہے۔ تم بھی اسے قبول کر لو کیونکہ ہونا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ میں تمہیں اتنی محبت دوں گی کہ تم اس محبت میں سب کچھ بھول جاؤ گے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے صرف یہی ایک چیز ہے۔

کل کی طرح آج بھی سارا راستہ خاموشی سے گزر گیا۔ یہ راستہ بہت خاموش تھا۔ یہاں ذرا بھی ٹریفک نہ تھی۔ بہت بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں جن کے احاطے کے اندر بڑے بڑے ہرے بھرے درخت لگے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ صاف ستھرے ہرے بھرے راستے پر ہم دونوں

چپ چاپ قدم سے قدم ملائے ساتھ چلتے رہے۔ کل کی طرح آج بھی ہمارے سفر کا آغاز سلام سے ہوا اور اختتام خدا حافظ پر ہوا۔ آج میں نے دل میں کہا۔ کل آنا۔ اس نے زبان سے کل آنے کے لئے کچھ نہ کہا۔ جب وہ چلا گیا میرے دل میں ایک افسوس سا ہونے لگا۔ کاش میں اس سے کچھ باتیں کر لیتی۔ وہ بھی کہتا ہوگا کیسی خاموش کیسی سنجیدہ لڑکی ہے۔ جب کہ میں نہ خاموش اور نہ ہی اتنی سنجیدہ لڑکی ہوں۔ میں تو ہنستی گاتی خوش باش لڑکی ہوں۔ پھر مجھے کیا ہوجاتا ہے دل نے کہا میں اس سے باتیں کروں گی ضرور۔ مگر پہلے وہ مجھے جان تو لے۔ میں اسے بتا تو دوں کہ میں کون ہوں۔ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ اس رات میں آنکھوں میں اس کے سپنے سجا کے سوگئی۔ خواب دیکھتی ہوں کہ میں گھنے جنگل میں ہوں تن تنہا جیسے مجھے کسی کی کھوج ہے مگر میں جانتی ہوں کہ مجھے کس کی کھوج ہے۔ وہ میرا محبوب ہے۔ محبوب کی صورت حبیب کی صورت بن گئی۔ میں جنگل میں بے خوف و خطر چلی جا رہی ہوں۔ اتنے میں ایک بڑا سا سانپ آکر میرے پاؤں سے لپٹنے کی کوشش کرتا ہے جیسے ہی میرے قدم اس کے لپٹنے سے دھیمے پڑتے ہیں میں پاؤں کی جانب دیکھتی ہوں اور غصہ میں اس سانپ کو پاؤں تلے روندھ دیتی ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر آگے جاکر پھر ایک سانپ کسی ڈالی سے لٹکتا ہوا میرے کندھوں پر آجاتا ہے۔ میں بہت غصہ میں اسے اپنے کندھوں سے جھٹک دیتی ہوں۔ تھوڑا آگے چلنے کے بعد زمین پر چار پانچ بڑے بڑے

اژدھے میرا راستہ روکے کھڑے تھے۔ اب کے میرے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ میں ان کے بالکل پاس جا کر کھڑی ہوگئی اور غصہ میں چلاتے ہوئے کہا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھے محبوب کے راستے سے روک سکتے ہو۔ تم میں یہ طاقت نہیں ہے۔ لو آؤ اور اپنی قوت کا خود ہی مشاہدہ کرلو۔ یہ کہہ کر میں نے ایک مضبوط عزم کے ساتھ قدم بڑھایا اور اپنے پاؤں اژدھوں پر رکھتی ہوئی گزر گئی۔ وہ اژدھے بالکل بے جان سے پڑے رہے۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔

خواب دیکھ کر میں نے اللہ سے دعا کی کہ اے میرے رب میری محبت کے راستے میں جو بھی رکاوٹیں ہیں انہیں آسان فرما۔ اگلے دن دل کہہ رہا تھا وہ آئے ضرور۔ اور میں نے امید کے راستے پر قدم رکھ دیا۔ ابھی چند قدم چلی تھی کہ وہ آگیا جیسے بہار آگئی مگر پھر وہی چند جملے چند الفاظ اور خاموشی۔ میں اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ راستہ ختم ہوا تو اس نے ایک خط میری طرف بڑھا دیا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے موقع پا کر سب سے پہلے وہ خط پڑھا۔ لکھا تھا۔

گھر میں سارا دن آپ سے کہنے کے لئے الفاظ اکٹھے کرتا ہوں اور آپکے حضور آکر جیسے زبان بند ہوجاتی ہے۔ لگتا ہے یہی حال آپ کا بھی ہے۔ اظہار مدعا کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ آپ کے بغیر میں زندگی کا تصور نہیں کرسکتا۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے ہمیں ایک بندھن میں باندھ دیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے دامن میں چاند

ستارے بھردوں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ دل کے اس بندھن کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آپ کی محبت میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ آپ کی طرح خوبصورت الفاظ میرے پاس نہیں ہیں مگر جیسے بھی ہیں انہی کو میرے دل کی آواز سمجھ لیجئے۔

حبیب

خط پڑھ کر میری روح کا ایک ایک تار بج اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں صدیوں سے جس کے انتظار میں تھی وہ مجھے مل گیا ہے۔ میں نے اللہ کے حضور بڑی عاجزی کے ساتھ دعا مانگی۔ یا اللہ وہ میری روح کا چین ہے۔ اسے مجھ سے مت جدا کرنا۔ اس کے ساتھ ہی ریحانہ کی جدائی اندیشہ بن کر سامنے آگئی۔ میری نظروں کے سامنے بچپن کے وہ دن آگئے جب ہم سڑک پر پڑی ماچس کی خالی ڈبیہ کو ٹھوکر مارتے مارتے اسکول پہنچ جاتے تھے۔ یا اللہ مجھے وہ یاد آتی ہے اور بہت یاد آتی ہے۔ میں نے اسے دوست مانا ہے۔ دوست تو زندگی میں ایک ہی ہوتا ہے۔ اس ساری دنیا میں میں نے ایک لڑکی کو اپنے دوست کی حیثیت سے چنا۔ وہ جہاں بھی رہے اسے خوش رکھنا اور اسے میرے حال کی خبر دے دینا۔ اللہ سے یہ کہہ کر مجھے ایک سکون و اطمینان ملا کہ وہ ضرور میرا حال اس تک پہنچا دے گا۔ بظاہر میں نے یہ کبھی جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ کہاں ہے کیسی ہے اور اس سے ملاقات بھی کی جا سکتی ہے۔ میرا رشتہ تو اندر کا تھا۔ جسے میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں جانتی تھی۔

حبیب کی محبت ریحانہ کی محبت کا نعم البدل ہے مگر میں جس درد سے آشنا ہوئی تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ پھر وہی درد میری جان نچوڑتا رہے۔ اس دن کے بعد وہ دو تین دن نہ آیا۔ میری آنکھیں اسے دیکھنے کو تڑپنے لگیں۔ رات ہوگئی۔ میں شام سے بار بار گیلری میں جاتی کہ شاید وہ دکھائی دے جائے مگر بے سود۔ آخر رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی۔ وہی دل کا درد جسے میں جانکنی کی تکلیف کے سوا اور کوئی نام نہ دے سکتی تھی۔ میرے سینے روئیں روئیں سے جیسے جان کھینچنے لگا۔ میں کتنی دیر اسی تکلیف میں اپنے رب سے فریاد کرتی رہی کہ مجھے اس آگ میں آخر کیوں جلا رکھا ہے۔ میری نظریں اسے کیوں دیکھنا چاہتی ہیں۔

رات کو خواب میں دیکھتی ہوں کہ میں اپنی دھن میں مگن ہنستی کھیلتی ہوئی ایک راستہ پر جا رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے محبوب سے ملنے جا رہی ہوں۔ میرا کمسن شباب اپنے حسن سے بے خبر ہے۔ میں اپنا ڈوپٹہ لہراتی راستے کے ٹیلوں پر گاتی لہراتی چلی جا رہی ہوں۔ دل میں محبوب سے ملنے کی لگن خوشیوں کے پھول کھلا رہی ہے۔ کبھی میں اس ٹیلے پر کھڑی ہو کر اسے نہایت ہی پیار بھری آواز میں پکارتی ہوں اور کبھی کسی درخت کی ٹہنی سے جھول کر اس کو آواز دیتی ہوں۔ میں اسی خوشی میں تھی کہ ایک سانپ میرے پیچھے لگ گیا۔ میں محبوب کے خیال میں اتنی زیادہ ڈوبی ہوئی تھی کہ بہت دیر تک مجھے اس کے ساتھ ساتھ آنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ کافی دیر بعد جب

اس نے اپنا پھن اٹھا کر میرے سامنے آکر پھنکارا تو میں چونک کر کھڑی ہو گئی
مگر یہ دخل درمعقولات مجھے کچھ اچھی نہ لگی۔ خبردار جو میرے راستے میں
آیا۔ کہہ کر میں نے اسے گلے سے پکڑ کر دور پھینک دیا اور پھر اسی طرح ہنستی
گاتی اپنے راستے پر چل دی۔

صبح آنکھ کھلی تو دوسری بار خواب میں سانپ دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ
ہماری محبت میں دنیاوی رکاوٹیں آتی ہیں۔ میں نے دعا کی کہ یا اللہ ہمارے
راستے کی ہر مشکل آسان کرنا اور ہمیں اپنی حفاظت میں رکھنا۔ دوسرے دن
وہ اسکول پر ملا۔ آج میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس سنجیدگی کو ہٹا کے اس سے
نارمل طریقے سے بات کروں گی اس نے آتے ہی سلام کیا میں نے جواب دیا
اور اپنی بے صبری کا حال سنانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے اس میں اپنی کمزوری نظر
آئی۔ اسی لئے میں نے اس سے پوچھا کہ تم تین دن کیوں نہیں آئے۔ اس
نے کہا آپ کیسی ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہوں۔ کہنے لگا کچھ مصروف تھا۔ اسی
وجہ سے نہ آسکا۔ میں نے کہا اچھا۔ اس وقت ہم ایک بڑے گھنے سے درخت
کے نیچے سے گزر رہے تھے جس کی شاخیں بالکل نیچے تک تھیں۔ اس کے
پتے املی کے پتے کی طرح تھے مگر نہایت ہی باریک باریک تھے۔ اس نے پتے
توڑ کر میرے اوپر پھینک دیئے۔ شرم سے میں نے اپنا چہرہ ڈوپٹے میں چھپالیا۔
اس کے بعد وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں ہوں ہوں کرتی رہی۔ میری آنکھوں
کے سامنے کچھ اور ہی منظر تھا میں سجی سجائی دلہن بنی کسی فرش پر بیٹھی تھی۔

کوئی میری مانگ میں افشاں بھر رہا تھا۔ اس بار رخصت ہوتے ہوئے اس نے
میرا ہاتھ پکڑلیا۔ میرے سر سے پاؤں تک ایک کرنٹ دوڑ گیا۔ اس نے میری
آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا خط کا جواب ضرور دینا۔ میں نے سرہلا
کے شرماتے ہوئے گردن ہلادی۔ دل نے کہا پاگل ہے دیوانہ ہے۔ میں نے
پوچھا پھر میں کیا ہوں۔ دل نے کہا تم بھی پاگل اور دیوانی ہو۔ ہم رخصت
ہوگئے۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے کبھی کوئی خیال نہ آتا کہ دنیا ہمیں دیکھ
لے گی۔ ہمارے لئے مشکل ہوجائے گی۔ اندر اندر میں جانتی تھی کہ اللہ ہمارا
ملاپ چاہتا ہے اور بس اس کے سوا میں اور کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

آج میرا دل بے انتہا خوش تھا کبھی میرے تصور میں اس کا ہاتھ پکڑنا
دکھائی دیتا کبھی پتیاں پھینکنا نظر آتا۔ بار بار تصور میں دلہن بنی دیکھتی اور وہ
میری مانگ میں افشاں کے ذرات ٹپکاتا رہتا۔ دل سے آواز آتی وہ تمہارا
محبوب ہے تم اس سے محبوبیت کی وہ بات کرسکتی ہو جو تمہارے دل میں ہے۔
میرے اندر آج جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ تنہائی پاتے ہی میں نے اللہ سے
کہا یااللہ میں کیا کروں۔ وہ بچھڑتا کیوں ہے۔ اس کی جدائی کا ہر لمحہ میری
موت کیوں بن جاتا ہے۔ دل میں پھر تقاضہ اٹھا کہ میں خط لکھوں۔ محبت کے
جذبات الفاظ کا طوفان بن کر میرے دل میں اٹھنے لگے۔ دل کی گہرائیوں سے
روح کی آواز آئی اے میرے رب تو بہتر جانتا ہے میرا عشق تجھ ہی سے ہے
مگر میں بشری جذبات کے تقاضوں کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتی تو مجھ سے

واقف ہے۔ میری حفاظت رکھنا ان دنوں میرے اندر گناہ ثواب کا کوئی
احساس نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے میں مرد عورت کے جسمانی تعلقات سے تو قطعی
طور پر ناواقف تھی۔ اس کا کوئی تصور ہی نہ تھا بس مجھے جس چیز کا ڈر لگتا وہ یہ
تھا کہ کہیں میں نادانی میں حبیب سے اللہ کے برابر محبت نہ کر بیٹھوں۔ میرے
نزدیک یہی سب سے بڑا گناہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اللہ سے کہتی
رہتی کہ میں ایک نوجوان لڑکی ہوں اور میرے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ ان
تقاضوں کی بناء پر کبھی میں ماں سے محبت کر بیٹھتی ہوں کبھی دوست سے اور
کبھی ایک مرد سے۔ ان سب کی محبتیں میری دنیاوی ضرورتیں ہیں۔ ان میں
آپ ناراض نہ ہونا۔ جب میں سب کچھ اللہ میاں سے اچھی طرح سے کہہ
دیتی تو میرا دل مطمئن ہوجاتا اور میں اللہ کا شکر ادا کرتی۔ مجھے اندر اندر
احساس ہوجاتا کہ اللہ میاں مجھ سے خوش ہیں۔ آج جذبات کے ہزاروں
طوفان لئے میں پھر اسے خط لکھنے بیٹھ گئی۔

خدا کی ساری خدائی میں سے میری نظر بس ایک ہی ہستی پر آکر ٹھہر گئی
ہے۔ تم جانتے ہو وہ کون ہے۔ اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو ہم ملتے ہی کیوں۔ تم
میری مانگ کا سیندور ہو۔ میری ہر خوشی تم سے ہے۔ اے محبوب محبت روح
کی زندگی ہے۔ محبت کے بغیر روح مردہ ہوجاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہم
ایک دوسرے سے اتنی محبت کریں کہ ہماری روحیں سدا
سرشار رہیں۔ تم میرے لئے قدرت کا ایک حسین تحفہ ہو۔ میرا رب مجھ پر

مہربان ہے۔ مجھے زندگی میں کبھی کسی چیز کی چاہ نہیں رہی سوائے محبت کے۔
اللہ ہماری محبتوں کو آباد رکھے۔ آمین۔

شامہ

دوسرے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ دن کاٹنا دوبھر ہوگیا۔ میں نے اپنے
دل کو سمجھایا اور اسکول کی پڑھائی پر توجہ دی۔ کچھ گھر کے کام کاج میں لگ گئی
مگر اس کا خیال تو دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔
ہمارے درمیان خطوط کا سلسلہ چلتا رہا۔ کم از کم ہفتے میں ایک خط جب تک
میں اسے لکھ نہ لیتی مجھے چین نہ ملتا۔ ہم تقریباً روزانہ اسکول کے راستے پر
ملتے۔ اب ہمارے درمیان تھوڑی سی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ وہ راستے میں
میرا ہاتھ پکڑلیتا۔ مگر اب بھی ہم ایک دوسرے سے بہت کم گفتگو کرتے تھے۔
ایسا لگتا تھا جیسے ہمارے درمیان کوئی آڑ ہے۔ حیا کی دیوار۔ اس کی طرف نظر
بھر کے دیکھنے بھی نہیں دیتی تھی۔ ادھر دن بدن وہ میری جان بنتا جا رہا تھا اور
تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن میں کوئی نہ کوئی خواب ایسا دیکھ لیتی تھی جو یہ
پیغام دیتا تھا کہ میں اس سے دور رہوں۔ کبھی سانپ دیکھتی، کبھی شیر دیکھتی کہ
مجھے اس کے راستے سے ہٹا رہے ہیں۔

ایک دن خواب دیکھا کہ میں اس کو خط لکھ رہی ہوں کہ اتنے میں کچھ
لوگ آتے ہیں جیسے یہ سب لوگ مجھے بھی جانتے ہیں اور اس کو بھی۔ یہ عام
لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ کو پتہ ہے یہ ٹھیک آدمی نہیں ہے۔ آپ اس کا

دھیان چھوڑ دیں۔ میں خواب میں ان سے لڑ رہی ہوں۔ مسلسل ایسے خواب دیکھ کر میں کچھ فکرمند ہوگئی۔ میں نے حبیب سے ان کا ذکر کیا۔ وہ کہنے لگا تم ان کی طرف دھیان نہ دو۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اس شام جب میں مغرب کی نماز پڑھنے لگی تو نماز کے اندر ہی مجھے اللہ تعالیٰ کا وہ عکس نظر آیا جو میں ہمیشہ سے دیکھتی آئی تھی۔ اس طرح لگا کہ اس عکس نے مجھے اس کے ساتھ اتنی محبت کرنے کو منع کیا۔ میں نے کہا کیوں۔ کہنے لگا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت عجیب سا لگا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کہ ایک تو اس کی محبت میرے دل میں ڈال دی اس کے ملنے کے اسباب مہیا کردیئے اور اب مجھے کہا جا رہا ہے یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اب میں نہیں رک سکتی۔ اگر وہ برا آدمی ہے تو بھی میری تقدیر ہے۔ میں انشاء اللہ اسے اتنی محبت دوں گی کہ وہ ٹھیک ہوجائے گا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں ایک دن ضرور میرے اندر ریحانہ کی محبت کا طوفان اٹھتا۔ میری نگاہ اسے تلاش کرنے لگتی۔ میں گیلری میں کھڑی ہوجاتی اور ہر آنے جانے والی لڑکی کو گھورتی شاید اس میں نظر آجائے۔ یہ سب کچھ ایک بے اختیارانہ کیفیت تھی جو کئی گھنٹوں تک رہتی۔ پھر میں اللہ سے دعا کرتی کہ اے اللہ وہ جہاں بھی ہے اسے زندگی کی بھرپور خوشیاں دینا۔ اس پورے وقت میں مجھے اتنی شدید تکلیف پہنچتی کہ جیسے میری جان نکلتی جا رہی ہے۔ اسی کیفیت میں جب کہ میرے ہاتھ پاؤں

سے جان نکلتی رہتی مجھے دنیا کے سب کام کرنے پڑتے۔ نہ میں رو سکتی نہ ہنس سکتی۔ مگر مجھے ایسا لگتا کہ میں اس وقت جو کچھ کر رہی ہوں یہ محض ایکٹنگ ہے۔ حقیقت میں میرے اندر کی کیفیت کچھ اور ہے جس نے مجھے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ تمام اضطرارانہ کیفیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں۔ اللہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ ویسے بھی پندرہ سال کی عمر میں بغیر کسی رہنمائی کے ذہن اور کتنا سوچ سکتا ہے۔ بہرحال حبیب کے متعلق تو جب بھی میں نے خواب دیکھا جس میں اس کے ملنے سے مجھ کو منع کیا جاتا۔ میں ہر بار یہی سمجھتی کہ اللہ میاں میرے ارادے کو آزما رہا ہے کہ اس کے اندر کتنی سکت ہے۔ یہ تمام خواب ہر بار مجھے ایک نیا حوصلہ اور نیا عزم عطا کرتے۔ اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی کہ مجھے اس راستے پر استحکام عطا فرما۔

اسی دوران میرے بھائی نے شہر سے دور ایک نیا مکان بنالیا تھا اور ہم سب وہاں منتقل ہوگئے تھے۔ میرے بڑے دونوں بھائیوں کی شادیاں بھی ہوچکی تھی اور بڑی بہنیں بھی بیاہی جا چکی تھیں۔ بڑے بھائی شادی کے بعد الگ رہتے تھے اور چھوٹے بھائی اپنی بیوی کے ساتھ ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ فلیٹ چھوڑتے ہوئے مجھے سخت تکلیف ہوئی کیونکہ جب تک میں ہر روز حبیب کو نہ دیکھ لوں میری حالت بری رہتی تھی۔ اکثر مغرب کے وقت میری نظریں اسے ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں مجھ پر اس کی محبت کا اس

اندر غلبہ ہوجاتا کہ میں پریشان ہوجاتی۔ میرے اندر شدید تقاضہ اٹھتا کہ بس دیکھ لوں۔ ایسی حالت میں میرے سوچنے کی صلاحیت بھی گم ہوجاتی بس دیکھنے کا تقاضہ دل و دماغ پر چھا جاتا۔ وہی جانکنی سی کیفیت طاری ہوجاتی۔ میں گیلری میں کھڑی ہوجاتی اور جس جانب اس کا گھر تھا اس طرف نظریں جما دیتی۔ دل اسے پکارنے لگتا تم کون سے گوشے میں چھپے ہو سامنے آؤ۔ میری نظر تمہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی آدھا گھنٹہ اور کبھی ایک گھنٹہ دل یونہی پکارتا رہتا مجھ پر ایک جذب کی سی کیفیت طاری رہتی۔ یہ عجیب بات تھی اس وقت مجھے گھر میں سے کوئی ڈسٹرب نہ کرتا۔ میں اپنے حال میں جذب کھڑی اسے پکارتی رہتی اور پھر وہ دور سڑک پر کھڑا نظر آجاتا۔ میں دیکھتی کہ وہ وہاں کھڑا ہے۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی اور دل ہی دل میں کہتی اللہ میرا حال جانتا ہے۔ وہ میرا مددگار ہے۔ وہ عشق کی آگ کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ جس نے مجھے اس آگ میں ڈالا ہے وہی جانتا ہے۔ میں نے کبھی حبیب کو اپنی یہ حالت نہیں بتائی۔ نہ ہی کبھی اس بات کا ذکر کیا۔

میں اندر ہی اندر اس بات سے واقف تھی کہ میرے اندر کچھ غیر معمولی روحانی قوتیں ہیں اور ان قوتوں کے ذریعے اللہ میاں مجھے کچھ سکھانا چاہتے ہیں۔ مجھے تو بس ایک ہی لگن تھی کہ میں اللہ میاں کو دیکھ لوں۔ اس سے مل لوں۔ میں اپنی زندگی کے ہر دور اور ہر نئے موڑ کو اسی راستے کی ایک

کڑی سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی سے بھی اپنی کیفیات بیان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی سمجھے گا یا نہیں۔ میرے نزدیک عشق محبوب کے دیدار کا نام تھا۔ ہرچند دنوں بعد جب ریحانہ کو دیکھنے کی تڑپ دل میں پیدا ہوتی تو گیلری میں کھڑی ہوجاتی اور نگاہ ہر گزرنے والی لڑکی میں ریحانہ کا عکس تلاش کرتی۔

عشق کا تعلق تو دل سے ہے عقل سے نہیں۔ دل جو کچھ دیکھتا ہے آنکھ اس سے بے خبر رہتی ہے۔ جب دل کے بھڑکتے شعلے ذرا کم ہوتے تو عقل میں آجاتی کہ ریحانہ اپنے گھر ہے۔ بس اس کی خوشی اور راحت کے لئے دعا کرتی اور خود مجھ کو سکون مل جاتا۔ مگر حبیب کے لئے ایسا نہیں ہوتا۔ اسے دیکھنے کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر بس نگاہ اسے لوگوں کے ہجوم میں تلاش کرنے لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے کسی نے مجھے کباب کی سیخ پر چڑھا رکھا ہے۔ میرا تن من جلنے لگتا۔ میرا دل اندر سے پکارنے لگتا اور میری نظر اسے دیکھ لیتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ آدھی رات کو میری آنکھ کھلتی۔ میری یہی کیفیت ہوجاتی اور اسی وقت میرے کانوں میں اس کی آواز آجاتی۔ اس کے بعد میں سکون سے سوجاتی۔ میں یہ جانتی تھی کہ میرے عشق میں ایسی قوت و کشش ہے جو محبوب کو قریب کردیتی ہے اور اسے میں اللہ کی عطا و رضا سمجھتی۔ اس کمسن عمر میں میں تو بس یہی سمجھتی تھی کہ انسان کے اندر اٹھنے والے بشری تقاضے منجانب اللہ ہیں۔ یہ فطرت ہے۔ فطرت کے ان تقاضوں

کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ جب ریحانہ کے عشق کا غلبہ آتا تو میں اللہ سے یہی کہتی کہ مجھے ایک دوست کی ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ میں ہنسوں کھیلوں اور جب حبیب کی محبت زور پکڑتی تو میں اللہ سے کہتی کہ مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جس سے میں اپنے دل کے جذبات کا اظہار کروں۔ میرے اندر عشق کا سمندر ہے۔ مجھے اس کے اظہار کی ضرورت ہے۔ اس طرح مجھے کسی فعل پر غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ میرے اندرونی جذبات کا کسی کو علم ہو بلکہ میں اندرونی جذبات کا ساتھی اللہ کو سمجھتی تھی۔ اندر ہی اندر جب کبھی مجھے ذرا سی بھی فرصت ملتی میری روح اپنے رب کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوجاتی۔ مجھے جو کچھ محسوس ہوتا جو کچھ دل میں سمجھتی سب کچھ اللہ سے بیان کردیتی اور اس سے مشورہ طلب کرتی۔ اس سے مدد طلب کرتی۔ مجھے کبھی یہ شک یا اندیشہ نہیں گزرا کہ اللہ میری مدد نہیں کرے گا۔ میں یہ جانتی تھی کہ اللہ سب سے زیادہ مجھ سے قریب ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ میری مدد نہ کرے۔

خواب

ہم نے فلیٹ چھوڑ دیا اور شہر سے دور نسبتاً بڑے مکان میں منتقل ہوگئے۔ میرے اندر ایک بے چینی تھی کہ میں اب کس طرح اسے روز روز دیکھ سکوں گی۔ پھر میں خود ہی اس سوال کے جواب میں دل سے کہتی کہ تجھے صبر کرنا ہوگا۔ اب ہر وقت میرا جی یہ چاہتا کوئی بھی نہ ہو اور وہاں میں میٹھی نیند سوجاؤں۔ میں اللہ سے کہتی اے اللہ مجھے گہری نیند سلادیں کہ مجھے کوئی نہ جگائے۔ نئے گھر میں گئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ حبیب سے ملاقات اسکول پر بھی نہ ہوسکی۔ اب گھر دور ہونے کی وجہ سے مجھے اسکول بس پر آنا جانا پڑتا تھا۔ میں روز انتظار کرتی ایک دو بسیں جان کر چھوڑ دیتی مگر وہ نہ آیا۔ ایک دن اسٹاپ پر کھڑی کھڑی یاد کررہی تھی کہ ایک دم الہامی کیفیت طاری ہوگئی میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سائیکل تیز تیز دوڑاتا ہوا آرہا ہے۔ ابھی وہ پچھلے اسٹاپ کے پاس تھا یہاں آنے میں اسے کم از کم دس منٹ لگنے تھے بس میرے سامنے رکی۔ کنڈیکٹر اسٹاپ کا نام لے کر چلاتا رہا۔ اس ٹائم تقریباً روزانہ وہی بس آتی تھی اور بس ڈرائیور اپنے پسنجر کو پہچانتے تھے

کہ اسے کہاں جانا ہے اس لئے وہ آواز دے کر بھی چڑھالیا کرتے تھے۔ مجھے
بھی ڈرائیور نے اندر آنے کا اشارہ کیا میں نے اشارے سے نہ کردی۔ اسی
طرح آگے پیچھے دو تین بسیں گزر گئیں۔ اس دوران میں دیکھتی رہی کہ وہ
سائیکل دوڑاتا ہوا نہایت تیزی سے میرے پاس آرہا ہے۔ میں اسے مایوس
کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر ہی میں وہ سائیکل پر ہانپتا کانپتا پہنچ ہی گیا۔
پسینے میں اس کی شرٹ بدن سے چپک گئی تھی۔ میرے قریب آکر وہ سائیکل
سے اتر گیا اور تیز چلتی سانسوں کے درمیان کہنے لگا مجھے بہت دیر ہوگئی تھی
میں سمجھا تم چلی گئی ہوگی۔ میں نے مسکرا کر کہا مجھے پتہ تھا کہ آج آپ ضرور
آئیں گے اس لئے کھڑی تھی۔ وہ ایک دم چونک کر بولا تمہیں کیسے پتہ چلا۔
میں نے ہنس کر کہا۔ میرے دل نے کہا تھا اب ہم دونوں اسی راستے کی جانب
چل دیئے ان راستوں پر قدم رکھتے ہی محسوس ہونے لگا جیسے یہ راستے ہمارے
لئے نئے نہیں ہیں۔ میں نے اس سے اتنے دن نہ آنے کے متعلق پوچھا اس
نے پڑھائی کی مصروفیت وجہ بتائی۔ ان ہرے بھرے سنسان راستوں پر چلتے
چلتے میرا جی چاہتا خوشی کے یہ لمحے ہمیشہ کے لئے ٹھہر جائیں۔ میں ان لمحوں
میں بھی اللہ کو کبھی نہیں بھولی۔ میں اللہ کو اندر ہی اندر پکارتی رہتی۔

میری روح میرا دل اسے اپنا جانتا تھا اور اب تن بھی اسے اپنا کہنے لگا
اب وہ بھی اس کی راہ دیکھتا جب ہم ملتے تو یوں لگتا کہ جیسے فطرت نے ہمیں
اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میری روح میرا دل شاد تھا مگر ہر پندرہ بیس دن

کے بعد اچانک ہی ریحانہ کی ہڑک من میں اٹھنے لگتی تھی۔ شروع شروع میں
تو اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھاتی رہی کہ بچپن کی محبت اور ساتھ تھا ابھی میں
اس کی جدائی کی عادی نہیں ہوئی مگر اتنے مہینے گزرنے کے بعد بھی وہی روز
اول والا معاملہ تھا۔ اس دن بھی میں سارا دن خوشی خوشی اپنے کاموں میں
مشغول رہی۔ حبیب کا تصور دل کے خوش رکھنے کو کافی تھا۔ شام گہری ہوتی تو
اچانک ریحانہ کا خیال آجاتا۔ وہ اس وقت کیا کررہی ہوگی اور اس کے ساتھ
ہی دل نے بے شمار سوالات کرڈالے۔ اسے بچپن کا زمانہ یاد بھی آتا ہوگا اس
کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا ہوگا۔ پھر وہی دل کا تقاضا کہ ایک نظر دیکھ لوں
یہاں تک کہ اس تقاضے میں رات ہوگئی اور پھر بڑی مشکل سے میں نے اپنے
دل کو سمجھایا اور اس کے لئے دعا کی کہ اللہ پاک اسے زندگی کی اور آخرت کی
بھرپور خوشیاں عطا فرما۔ جب اس خیال کی گہرائی سے نکلی تو میں نے بڑی
سنجیدگی سے اس پر غور کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہر تھوڑے دنوں بعد میری یہ
حالت ہوجاتی ہے اور جب میں اس حالت سے باہر نکلتی ہوں تو اس کے
متعلق اتنا سوچتی بھی نہیں۔ میں اپنے کاموں میں مگن ہوجاتی ہوں اور ریحانہ
کو تو یاد بھی نہیں کرتی کہ ایسی حالت ہو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ تب سوچنے پر
میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اللہ چاہتا ہے کہ میں اسے یاد کرکے اس کے
لئے دعا کرتی رہوں کیونکہ آخر میں نے اسے دوست کہا تھا۔ دوستی کا تقاضا بھی
تو نبھانا ہے۔ دنیا میں بچھڑنے سے دوستی ختم تو نہیں ہوجاتی۔ ارے روحیں تو

مرنے کے بعد بھی ملتی ہیں۔ ضرور اللہ نے میری دعا قبول کرلی اور ضرور ہماری دوستی مرنے کے بعد بھی قائم رہنے والی ہے۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا مجھے اللہ کی مہربانی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ بچپن سے ہی اپنی امی سے یہ سنتی آئی تھی کہ اللہ سے جو مانگو وہ دیتا ہے۔ بس اللہ سے سب کی بھلائی کی دعا کرنی چاہئے۔ میرے دل میں یہ بات بالکل پکے یقین کے ساتھ بیٹھ گئی کہ اللہ سے جو مانگو وہ مل جاتا ہے اور مرنے سے پہلے آدمی کی ہر خواہش اللہ پوری کردیتا ہے۔ ان دنوں جو سب سے زیادہ دل کی خواہشات تھی وہ یہ کہ سب سے پہلے تو اللہ میاں کو اچھی طرح دیکھ لوں۔ اللہ نے جس کی محبت دل میں ڈالی ہے تو دنیا اور آخرت میں اس کا ساتھ عطا کرنا اور ریحانہ کا ساتھ بھی آخرت میں دینا کیونکہ انسان کو دوست کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ میں نے دوستی کے لئے ریحانہ کو چن لیا ہے۔ میں بس یہی تینوں خواہشات اللہ سے کرتی اور اسی کی دعا مانگتی۔

اکثر میں سوچتی کب یہ زندگی گزرے گی۔ کب وہ دن آئے گا جس دن میں مروں گی اور غیب میں داخل ہوجاؤں گی اور اللہ میاں سے دعا کرتی۔ اللہ میاں میں بوڑھی ہونا نہیں چاہتی ہوں۔ کافی دیر زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ آپ سے ملنے کے لئے اور غیب کی دنیا کو دیکھنے کے لئے اتنا لمبا انتظار کیسے کروں گی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں آئندہ زندگی بڑی لمبی دکھائی دیتی۔ میں دل میں کئی کئی مرتبہ زندگی مختصر ہونے کی دعا کرتی۔ میرے اندر کی شمامہ اپنی دنیا میں

مگن تھی باہر کی شمامہ اپنی دنیا میں۔ کہاں اندر اندر مرنے کا اتنا اشتیاق اور کہاں باہر باہر زندگی کے ہر کام میں بھرپور حصہ لینا۔ دونوں رخوں میں زندگی اپنی پوری رفتار سے گزر رہی تھی۔ مجھے گھر گرہستی کے ہر کام کا شوق تھا۔ اگر نہ بھی ہوتا تو امی بخشتیں کب۔ وہ تو یہی چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹیاں علم و ہنر میں ساری دنیا سے بہتر ہوں ہر کام بڑی بہن چھوٹی بہنوں کو سکھایا کرتیں۔ بڑوں کے لئے امی کا یہ حکم تھا کہ اسکول میں' پڑوس میں' بازار میں جہاں بھی تم کو کوئی چیز اچھی لگے تو فوراً" گھر آکر اس کی کاپی کرو۔ اس طرح ہم لوگ سلائی' کڑھائی' بنائی' کھانا پکانا غرض کہ سب کچھ سیکھ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی بڑے بھائی اور بہن کو ڈرائنگ اور آرٹس سے بھی دلچسپی تھی ان سے میں نے بھی سیکھی اور خالی وقت میں شوقیہ تصویریں بھی بنالیا کرتی تھی۔ غرض کہ اس زمانہ کا کوئی بھی ہنر ایسا نہ تھا جو ہم نے نہ سیکھا ہو۔ بس مجھے روٹی پکانا بہت دوبھر لگتا تھا۔ سالن پلاؤ اور اچھی اچھی چیزیں پکالیا کرتی تھی مگر روٹی پکانے میں جان نکلتی تھی۔ مجھ سے چھوٹی بہن بڑی باریک باریک چپاتیاں بناتی۔ جب میری باری آتی تھی تو میں اس کی منتیں کرتی تھی۔ میری امی بھی اس معاملے میں بڑی سخت تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ہر لڑکی سب کچھ کام کرے تاکہ ہر کام سیکھ لے۔ امی کا ایسا رعب تھا کہ کچھ کہہ نہ سکتے تھے مگر میں چپکے چپکے اس کی منتیں کرتی رہتی۔ بہن آج تم روٹی پکادو کل میں تمہارے حصے کا کام کردوں گی۔ کبھی تو یہ سن لیتی تھی اور کبھی کہہ دیتی تھی کہ امی کو بتادوں گی

کہ بی آپا روٹی نہیں پکا رہیں۔ پھر چار و ناچار خود ہی پکانا پڑتا تھا۔

سکینہ نے ان دنوں کہیں سے مشین ایمبرائیڈری سیکھ لی تھی۔ اس کی سلائی بھی بہت اچھی تھی۔ ہم دونوں بڑے اچھے اچھے کپڑے سینے اور جب پہن کر اسکول جاتے تو سب لڑکیاں تعریف کرتیں تو اور بھی خوشی ہوئی۔ کراچی میں فیشن بھی بڑی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ ہر نیا فیشن ہم دوسرے ہی دن کاپی کرلیتیں۔ ہماری اچھی اچھی سلائی کڑھائی پر امی بھی بہت خوش ہوتی تھیں۔ نئے نئے فیشن کو اپنانے سے انہوں نے کبھی ہمیں نہیں روکا۔ مگر ساتھ ساتھ ذہنی تعلیم پر بھی پوری توجہ دلائی۔ ہم سب بہن بھائی روزے رکھنے کے بڑے شوقین تھے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے یہاں بڑا خوبصورت ماحول ہوتا۔ سب لوگ پورے روزے رکھتے۔ ابا قرآن باترجمہ پڑھتے اور ہمیں بھی اس کی تلقین کرتے اور قرآن کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے۔ ایک دفعہ ابا قرآن پڑھ رہے تھے اس میں شیطان کا تذکرہ تھا۔ ابا نے مجھے پاس بلایا۔ کہنے لگے۔ شامہ شیطان کو دیکھا ہے۔ میں ابا کے سوال پر سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگے لوگ جو کہتے ہیں کہ شیطان سے بچ کر رہو۔ شیطان پر لاحول بھیجو تو کیا لوگوں کو شیطان دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کہا۔ ابا دکھائی تو نہیں دیتا۔ ابا کہنے لگے پھر لوگ کس سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ میں نے کہا ابا پھر برائی کیا ہے۔ بدی کو جو ہم شیطان سے منسوب کرتے ہیں تو بدی کیا ہے۔

لو سنو۔ کہنے لگے۔ بیٹی شیطان انسان کے اندر ہی ہے۔ شیطان وہ مرکز ہے جہاں سے بدی کے خیالات ہمارے اندر آتے ہیں۔ میں نے کہا مگر ابا اگر شیطان نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر کوئی بھی غلط کام نہ کرتا۔ کہنے لگے۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہے۔ اگر برائی نہ ہوتی تو تمہیں اچھائی کا کیسے پتہ چلتا بیٹی۔ مچھلی ساری عمر سمندر میں رہتی ہے سمندر سے ہی اسے رزق فراہم ہوتا ہے۔ مچھلی کے لئے سمندر کی زندگی ایک ایسا روٹین ہے جو ایک آٹومیٹک مشین کی طرح جاری و ساری ہے۔ اس کا ذہن اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں کہ سمندر کے اس پر کیا کیا احسانات ہیں۔ جیسے ہم ہروقت سانس لیتے ہیں۔ ہمارا دل ہر وقت دھڑکتا ہے۔ ہمارا ذہن کبھی اس طرف نہیں جاتا مگر اس وقت جاتا ہے جب سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکن میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔ تب ہمیں صحیح عمل کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح جب مچھلی سمندر سے باہر نکلتی ہے تو سمندر کی عنایات کا اسے احساس ہوتا ہے۔

ان دنوں میرا شدت سے جی چاہتا کاش میں جنگل میں نکل جاتی۔ فطرت سے قریب تر رہ کر اپنے رب کو تلاش کرتی۔ تقریباً تین سال پہلے بھی جب ہم فلیٹ میں رہتے تھے تو میرے اوپر یہی خوف چھایا رہتا تھا اس لحاظ سے تو مجھے اپنے لڑکی ہونے پر بھی افسوس ہوتا تھا۔ بس میرا جی چاہتا کہ جنگل میں نکل جاؤں جہاں بہت سے پرندے ہوں ان کے ساتھ میں بھی اڑتی رہوں۔ بار بار میری نظر آسمان پر جاتی۔ چڑیوں کو آزادی کے ساتھ اڑتے دیکھ کر

میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ دل ان سے باتیں کرنے لگتا۔ اے چڑیو! تم کتنی خوش نصیب ہو۔ جب جی چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے اڑ کے پہنچ جاتی ہو۔ کاش میں لڑکا ہوتی تو کسی جنگل میں جا کر پرندوں کے ساتھ آزادی سے رہتی اور اللہ کے تصور میں کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھی رہتی۔ وہاں میرے کاموں میں کوئی محل نہ ہوتا۔ کاش ایسا ہوتا۔ آخر میری زندگی کا کوئی تو مقصد ہوگا۔ میں بے مقصد زندگی نہیں چاہتی۔ مجھے میری زندگی کا مقصد بتا دیجئے میں کسی سے نہیں پوچھوں گی۔

حبیب نے ایک دن بتایا کہ وہ کسی رشتے دار کے پاس ایک ماہ کے لئے لاہور جا رہے ہیں۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ ایک ماہ تک میں اسے نہ دیکھ سکوں گی۔ لیکن میرے دل نے ایک عزم کے ساتھ کہا تم اتنا عرصہ نہیں رہ سکو گے۔ میری کشش تمہیں کھینچ لائے گی۔ دو ہفتے گزر گئے ایک رات خواب دیکھا کہ آج اکیس تاریخ ہے اور وہ آگیا ہے۔ تیسرے دن اکیس تاریخ تھی۔ مجھے اپنے سچے خوابوں کا پتہ چل جاتا تھا۔ عام طور سے میں خواب ہمیشہ ہی سچے دیکھتی تھی۔ میں اس دن صبح سے ہی انتظار میں رہی۔ وہ آگیا۔ کھڑکی سے اسے آتے دیکھ کر مجھے خوشی تو بے حد ہوئی مگر ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ یوں لگا جیسے اسے اسی دن آنا تھا۔ ہم گھر سے باہر ملے۔ اس نے کہا میرا دل نہیں لگ رہا تھا اس لئے دو ہفتے پہلے ہی چلا آیا۔ میں نے کہا کہ ہاں میں صبح سے ہی تمہارے انتظار میں تھی۔ وہ حیران ہوا تمہیں کیسے پتہ چلا۔ میں نے کہا میں

نے خواب دیکھ لیا تھا۔ میں اسے اس کے متعلق جو بھی الہام میں یا خواب میں دیکھتی ضرور بتا دیتی تھی۔ میں سوچتی۔ جیون ساتھی کے درمیان کوئی راز نہیں رہنا چاہئے۔ اس طرح ہمیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں بھی مدد ملے گی۔

ان دنوں خوش رہنا ہماری زندگی کا مقصد تھا۔ میرا دسویں کا امتحان ہوگیا۔ اب میں گیارہویں کلاس میں یعنی میٹرک میں آگئی تھی۔ حبیب تو ہر مرتبہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی سختی لگائی ہوئی تھی کہ تمہیں بھی میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لینی ہے۔ میں ہنستی کہ مجھ سے یا تو اپنے عشق کا امتحان پاس کرالو یا پھر میٹرک کا پاس کرالو مگر خیر پڑھائی کا تو مجھے بھی بے حد شوق تھا۔ میں میٹرک کے شروع سال سے ہی روزانہ رات کو جاگ جاگ کر پڑھائی کرتی۔

ابھی امتحان میں چار پانچ ماہ تھے کہ میں نے خواب دیکھا کہ میں اپنے گھر کی دہلیز پر اندر کی طرف کھڑی ہوں۔ میرے بڑے بھائی دہلیز پر اس طرح کھڑے ہیں کہ ان کا ایک پاؤں باہر اور ایک پاؤں دہلیز کے اندر ہے اور اندر والا ہاتھ میں نے پکڑ رکھا ہے اور باہر والا ہاتھ چند لوگوں نے پکڑ رکھا ہے۔ جو لوگ باہر ہیں وہ سارے کے سارے میرے وہ رشتہ دار ہیں جن کا انتقال ہوچکا ہے اور جنہیں میں نے اپنی زندگی میں دیکھا بھی نہیں۔ ہمارے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے۔ بھائی کا ایک ہاتھ پکڑ کر میں انہیں اندر کھینچ رہی ہوں

اور کہتے ہیں کہ ہمیں اسے لے کر جانا ہے۔ میں دانت پیس کر کہتی ہوں کہ میں نہیں جانے دوں گی۔ وہ کہتے شامہ ہمیں پتہ ہے تو بہت طاقتور ہے مگر ہمیں اس کو لے کر ہی جانا ہے۔ بہت دیر تک رسہ کشی کے بعد بالآخر میرا ہاتھ چھوٹ جاتا ہے اور بھائی کو وہ لوگ لے جاتے ہیں۔ یہ خواب دیکھ کر میں بے حد پریشان ہوگئی۔ میں جان گئی تھی کہ یہ سچا خواب ہے۔ سچا خواب دیکھ کر جب آنکھ کھلتی تو ہمیشہ مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے اور دل میں ذرہ برابر بھی شک نہ آتا بلکہ دل اندر سے یہی کہتا ایسا ہی ہونا ہے۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں سے انتہائی محبت تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اپنی زندگی بھی انہیں دے دیتی مجھے معلوم تھا کہ کاتب تقدیر کا قلم چل چکا ہے اور اب کسی کی شنوائی نہیں ہوسکتی۔ اب میں کیا کروں۔ کس سے اپنا راز کہوں۔ کیسے دل کا بوجھ گھٹاؤں۔ مجھے اپنی روح بے بسی کے حال میں حسرت و یاس کی تصویر نظر آئی۔ میں نے فجر کی نماز ادا کی اور اپنے رب کے سامنے جھک گئی۔ اے میرے رب تیرے فیصلے اٹل ہیں ہمیں اپنے فیصلوں کو قبول کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرما۔ اس دن حبیب سے میری ملاقات ہوئی میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے اور میں بہت پریشان ہوں۔ اسے پتہ تھا کہ میرے خواب اکثر سچے ہوتے ہیں۔ وہ مجھے تسلی دینے لگا موت اور زیست تو اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ ہم سب اسی کے ہیں۔ وہ جب چاہے اپنے پاس بلالے۔ مگر ضروری نہیں کہ یہ سچ ہو وہ

اپنے ماں باپ کی جوان اولاد ہے اور اس کے ننھے ننھے بچے ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ تم خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔ حبیب کے الفاظ سے مجھے بڑا اطمینان ملا۔ میں نے سوچا۔ رنج و غم کے لمحات میں ہمدردی و غمگساری کتنی بڑی نعمت ہے۔

ابھی میرے میٹرک کے امتحان میں تقریباً دو ماہ تھے کہ ایک رات جب میں سوئی تو تھوڑی دیر بعد ہی آنکھ کھل گئی۔ مجھ پر ایک الہامی سی کیفیت تھی۔ بند آنکھوں سے مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میری نانی پر نانی جنہیں میں نے زندگی میں دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ نظر آئیں۔ ان کی روحیں بالکل جوان تھیں مگر میں انہیں فوراً پہچان گئی۔ دونوں نے ریشم کا بہت خوبصورت ڈریس پہن رکھا تھا۔ خوشیاں ان کے روئیں روئیں سے ٹپک رہی تھیں۔ وہ سارے گھر میں خوشی خوشی گھوم پھر رہی تھیں۔ وہ جہاں جہاں جاتیں میری آنکھیں انہیں دیکھتیں۔ ان کی باتیں سنتیں۔ ابا کو اماں کو ہر ایک کو دیکھ دیکھ کر وہ اس قدر خوشی سے ہنستیں۔ یہ فلاں ہے یہ فلاں ہے۔ سب کے پاس جا جا کر خوشی خوشی اسے دیکھتیں۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ میں زمین پر امی کے ساتھ لیٹی تھی مجھے سخت ڈر لگا۔ مگر میں جانتی تھی کہ مجھ پر الہامی کیفیت طاری ہے۔ وہ خوشی خوشی میرے پاس آئیں۔ میرا منہ چوما ان کے پیار میں بڑی گرمجوشی تھی۔ وہ بار بار مجھے پیار کرتیں ہنستیں اور سارے گھر میں گھومتیں۔ ساری رات یہی ہوتا رہا۔ دن نکلا تو وہ غائب ہوگئیں۔ ابھی میری پلک جھپکی ہی تھی

کہ اسکول کے لئے اٹھنا پڑا۔ پھر تو ہر روز یہی ہونے لگا۔ وہ آتیں مجھے پیار کرتیں میرے بال پکڑتیں میں ان سے کہتی کہ چلی جاؤ مجھے سونے دو۔ ساری رات میری یونہی گزر جاتی۔ مجھے فکر سی رہنے لگی تھی کہ وہ کیوں آتی ہیں اور کیا ہونے والا ہے۔ چند دن بعد میں نے امی سے کہا کہ امی ہر روز نانی اور پرنانی آتی ہیں اور اس طرح سب کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور مجھے سونے نہیں دیتیں۔ امی کہنے لگیں کہ ان سے کہنا کیوں آتی ہیں یہاں کیا کام ہے۔ میں نے رات کو ان سے اسی طرح کہا کہ آپ کیوں یہاں آتی ہیں کیا کام ہے اب آپ نے سب کو دیکھ لیا اب واپس چلی جائیں۔ وہ دونوں یہ سن کر خوب ہنسیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں لو بھئی یہ ہمیں کہتی ہے کہ واپس چلے جائیں۔ یہاں کیا کام ہے پھر ہنسنے لگیں۔ بس ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ ان کی وجہ سے ساری رات جاگتی تھی۔ میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے۔ عجیب مشکل میں جان تھی۔ پندرہ بیس دن ہوگئے تو پھر میں نے امی سے کہا۔ امی میری ساری رات جاگتے گزر جاتی ہے یہ روز روز آتی ہیں کیا کروں۔ دن بھر میرا اسکول کے کاموں میں گزر جاتا ہے میٹرک کی پڑھائی ہے مجھے فکر ہو رہی ہے۔ گھر والے مجھے ایک حکیم کے پاس لے گئے اس نے کچھ شربت وغیرہ دیئے اور کہا کہ نیند نہ آنے کی شکایت شہنشاہ عالمگیر کو بھی تھی۔ اس کو بھی اسی شربت کے پینے سے آرام آیا تھا۔ میں نے حکیم صاحب کو تو نہیں بتایا کہ رات بھر روحیں نظر آتی ہیں۔ صرف نیند نہ آنے کی

شکایت کی تھی مگر ہوا یہ کہ میں نے حکیم صاحب کی دو بوتلیں شربت ختم کر ڈالیں مگر یہ شہنشاہی بیماری تو ختم نہیں ہوئی۔ بیماری ہوتی تو ختم ہوتی۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ کیا کیفیت ہے مگر ایک تو بڑے بھائی جان کی موت کا خواب ذہن میں تھا دوسرے مجھے اپنے میٹرک کے امتحانوں کی شدید فکر تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اگر میں اسی طرح جاگتی رہی تو بیمار نہ پڑجاؤں۔ دن میں میں جان کر سوتی نہ تھی۔ امتحان کا بوجھ ہر وقت ذہن پر سوار رہتا تو اپنا زیادہ وقت پڑھنے میں گزار دیتی۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ رات کو یہ مجھے پڑھنے نہ دیں گی۔ اس لئے دن میں ہی اسٹڈی کرلوں۔ پورے سوا مہینے تک یہی عالم رہا۔ اس کے بعد وہ غائب ہوگئیں۔ روحوں کے جانے کے دوسرے دن سے ہی میں آرام سے سونے لگی تھی۔ ایک رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اس رات یوں لگا جیسے بھائی جان کی طبیعت سخت خراب ہے۔ دل گھبرانے لگا میں رونے لگی۔ امی ابا سے پوچھا ابا بولے بیٹے! ابھی کل ہی تو وہ آیا تھا۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ میں ہچکیاں لے کے کہہ رہی تھی۔ بھائی جان تکلیف میں ہیں۔ امی میری روحانی صلاحیتوں سے باخبر تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اس نے کچھ نہ کچھ ضرور دیکھا ہے۔ وہ ابا کے پیچھے پڑگئیں کہ جاکر اس کے گھر دیکھ کر تو آؤ۔ ابا کہنے لگے۔ ہر روز دفتر جانے سے پہلے وہ تم کو سلام کر کے جاتا ہے۔ بھائی جان کی عادت تھی کہ وہ دفتر جانے سے پہلے جلدی جلدی ہمارے گھر آتے۔ امی کو سلام کرتے اور کہتے اچھا اماں میں آتا ہوں اور چلے جاتے۔ ابا کہنے

لگے کل بھی وہ تم کو سلام کر کے گیا تھا۔ صبح پھر آجائے گا۔ تم لوگ تو خواہ
مخواہ وہم کررہی ہو۔ شامہ نے یونہی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔ آدھی
رات کو اتنی دور میں کیسے جاؤں۔ راستے میں کتے بھی بہت ہوتے ہیں ذرا دن
نکلنے دو تو جاؤں گا۔ ابھی تو رات کا تیسرا پہر ہے۔ امی بہت بگڑیں۔ بس اپنا ہی
خیال ہے پتہ نہیں میرے بچے کا کیا حال ہے۔ ذرا جاکر دیکھ لیتے تو کیا حرج
تھا۔ گھر میں کوئی اور مرد ہے بھی نہیں۔ کس کو بھیجوں۔ مجھ پر عجیب کیفیت
طاری تھی۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے بھائی بہت تکلیف میں ہیں اور ان کی
تکلیف روحانی طور پر میں محسوس کررہی تھی۔ بس روئے جا رہی تھی۔ بہت
دیر بعد میری طبیعت سنبھلی۔ اٹھ کر نماز پڑھی۔ دعا کی۔ فجر کے بعد ابا ان کے
گھر گئے پتہ چلا رات کو تیسرے پہر اچانک بھائی جان کی طبیعت سخت خراب
ہوگئی تھی۔ پیٹ پھول گیا سینے میں سخت درد اور کھانسی اٹھ رہی تھی بہت
تکلیف تھی۔ درد کی گولیوں سے بھی کچھ فرق نہ پڑا۔ صبح ڈاکٹر کے پاس جائیں
گے۔ اب ذرا افاقہ ہے۔ ابا نے آکر بتایا۔ امی بہت خفا ہوئیں۔ اگر تم اسی
وقت چلے جاتے تو کیا تھا۔ شامہ کبھی غلط نہیں کہتی ہے۔ رات اس کو بھائی کی
تکلیف کا پتہ چل گیا تھا اسی لئے تو وہ اس قدر رو رہی تھی ورنہ تو وہ روتی
کب ہے۔ میں نے کہا۔ امی جانے دیجئے۔ واقعی آدھی رات کو ابا اتنی دور
پیدل کیسے جاتے۔ اس دن کے بعد سے بھائی جان کی طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی۔
اچھے بھلے تندرست انتیس سال کے جوان آدمی تھے۔ اچانک نجانے کیا

ہوگیا۔ دو تین دن بعد ہم انہیں اپنے گھر لے آئے۔ ڈاکٹر گھر آتے علاج چل
رہا تھا میرے اندر خواب کی وجہ سے شدید رنج بھر گیا تھا مگر کسی سے بات بھی
نہیں کرسکتی تھی۔ میں ایسے خواب گھر میں کسی کو نہیں بتاتی تھی کہ جو ہونا ہے
وہ تو ہونا ہی ہے۔ خواہ مخواہ سب کو پریشان کرکے کیا فائدہ۔ مجھے اپنی امی ابا
اور بہن بھائیوں کی پریشانی کا بے حد خیال رہتا تھا۔ ہر وقت یہی سوچتی کہ کس
طرح میری ذات سے انہیں سکھ اور خوشی پہنچے۔ یہی وجہ تھی کہ غم اور پریشانی
والی بات کبھی کسی کو نہ بتاتی۔ بس ایک حبیب تھا جس سے میں تقریباً ہر طرح
کی بات کرلیتی تھی۔ بھائی سخت بیمار تھے ایک دن صبح انہوں نے مجھے پاس
بلایا۔ کہنے لگے۔ شامہ تجھے خواب کی تعبیر آتی ہے۔ میں نے کہا بھائی جان کیا
خواب دیکھا۔ فکر مند لہجے میں آہستہ سے بولے۔ امی کو بالکل نہ بتانا۔ گھر میں
کسی کو نہ بتانا بس تو مجھے ہی اس کی تعبیر بتا۔

ایثار

میں نے دیکھا کہ میں ایک سڑک پر جا رہا ہوں۔ اس سڑک پر پانی بہہ رہا ہے اور سڑک گیلی ہے۔ مگر بڑا اچھا موسم ہے کہ سڑک کے کنارے بلڈنگ کی بالکونی سے خوبصورت عورتیں مجھے اشارے کنایوں سے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ یہ خواب سنتے ہی میرے دل میں مبہم سا خیال آیا موت بلا رہی ہے۔ مگر فوراً ہی میں نے اسے جھٹک دیا اور مسکرا کر بھائی سے بولی۔ آپ خواہ مخواہ اتنے فکرمند ہو رہے ہیں۔ خواب تو بہت اچھا ہے۔ میں تعبیر نامے میں اس کی تعبیر دیکھ کر آپ کو بتاتی ہوں۔ میں نے چپکے سے تعبیر نامے میں تعبیر دیکھی۔ وہاں لکھا تھا۔ خوبصورت عورت دیکھنے کو مطلب ہے دولت ملے گی۔ میں نے بھائی کو بتایا مگر وہ میری بات سننے کے بعد بھی اسی طرح فکرمند رہے۔ ان کی حالت ذرا بھی نہ بدلی جیسے انہیں اس پر قطعی یقین نہیں آیا ہو۔ بس آہستہ سے کہنے لگے تو کسی سے کہنا مت۔ امی کو بالکل نہ بتانا۔ میں نے کہا میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ بھائی جان کی بیماری سے سارا گھر پریشان تھا۔ ابھی تو ان کے دو چھوٹے چھوٹے بیٹے تھے۔ ایک ڈھائی تین سال کا اور

ایک سوا سال کا۔ کچھ ہی دنوں میں بھائی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے۔

دو تین ہفتوں میں ان کی حالت بدل گئی۔ صحن میں کیلوں کا درخت تھا۔ جس میں کیلے لگے تھے مگر بالکل کچے تھے۔ یہ گھر کا پہلا پہلا پھل تھا۔ ایک دن امی نے تسلے میں بھائی کے پاؤں دھلا کر انہیں کرسی پر صحن میں اسی درخت کے نیچے بٹھا دیا۔ بھائی جان نے حسرت سے کیلوں کی طرف دیکھا کہنے لگے اماں یہ پہلا پھل میں کھاؤں گا۔ اماں پیار سے بولیں پک جائے تو سب سے پہلے میں اپنے بیٹے کو دوں گی یہ پھل۔ وہ چپ چاپ بیٹھے کرسی کی پشت پر سر ٹکائے کیلے کے درخت کو گھورتے رہے۔ ان کی آنکھوں سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ میری ماں کی آنکھوں میں اس سے بھی زیادہ حسرت تھی۔ ممتا کا بس نہیں چلتا تھا کہ ابھی کیلے پک جائیں تو توڑ کر اپنے بچے کو کھلا دے۔

دوسرے ہی دن بھائی کوما میں چلے گئے۔ ڈاکٹر نے برین ہیمرج بتایا اور تیسرے دن وہ چل بسے۔ جس وقت ان کا جنازہ لے جا رہے تھے میں بالکل صاف کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ چار فرشتے ہیں یہ کافی لمبے قد کے آدمی نما ہیں۔ ان چاروں نے بھائی کو اٹھایا ہوا ہے اور لے جا رہے ہیں۔ یہ منظر اس قدر واضح تھا کہ بھائی کا اصل میں جنازہ کون لے جا رہا ہے سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بس صرف فرشتے ہی انہیں لے جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ بھائی کسی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں چیخ چیخ کر انہیں کہنے لگی۔ خدا کے لئے میرے بھائی کو مت لے جاؤ۔ پوری قوت سے میں

سب سے التجا کرتی رہی کہ میرے بھائی کو روکو۔ وہ اسے لے جا رہے ہیں۔ پکڑو انہیں مت لے جانے دو۔ میں چلا رہی تھی اور فرشتوں سے التجا کر رہی تھی۔ چھوڑ دو اسے۔ میرے بھائی کو مت لے جاؤ۔ پھر میں ان سے لڑنے لگی میں تمہیں ہرگز بھی نہیں لے جانے دوں گی۔ میں ان کے بالکل قریب تھی مگر وہ میری بات پر دھیان نہیں دے رہے تھے اور بس اپنا کام کئے جا رہے تھے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں ابھی بچی ہوں اور یہ تمام فرشتے خوب جوان اور مضبوط آدمی ہیں مگر اس کے باوجود بھی میں چیخ چیخ کر ان سے اپنے بھائی کے لئے جھگڑ رہی تھی۔ چھوٹی بھابھی نے میری پشت پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگیں شمامہ صبر کرو۔ میں چیخ پڑی بھابھی وہ میرے بھائی کو لے جا رہے ہیں۔ انہیں روک لو۔ وہ میری نہیں سنتے۔ وہ سمجھیں میں جلوس جنازے میں شامل لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔ میں ان کے خیال سے واقف ہو گئی۔ میں پھر چیخ کر بولی۔ وہ لمبے قد والے میرے بھائی کو لے جا رہے ہیں۔ بھابھی پاس کھڑے کسی سے بولیں۔ ہسٹیرک ہو گئی ہے۔ جلدی سے گولی دینا۔ ایک گولی زبردستی مجھے کھلا دی۔ نہ اس وقت میں ہسٹیرک تھی نہ میرا دل کمزور تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شعوری طور پر میں اس وقت اپنے آپ کو بے حد توانا محسوس کر رہی تھی۔ بس جو کچھ میں حقیقت میں دیکھ رہی تھی اسے روکنا چاہتی تھی اور اس پر میرا کچھ بس نہیں چل رہا تھا۔ میرے مسلسل چلانے اور جھگڑنے کے باوجود بھی وہ فرشتے میری بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔ ان کے اندر تو جیسے

بس اپنے کام کے سوا اور کوئی خیال ہی نہ تھا۔ اس لمحے مجھے وہ بالکل پتھر دل لگے۔ وہ میرے درد کو کیا سمجھ سکتے تھے۔

جب بھابھی نے مجھے اعصاب کو سکون دینے والی گولی کھلائی تو مجھ پر رنج کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آہ یہ بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ سب لوگ سمجھ رہے ہیں جیسے میرا دل میرا ذہن اتنا کمزور ہے کہ اس کی کمزوری نے میرے اعصاب پر اثر ڈال دیا ہے۔ کاش یہ بھی دیکھ سکتے جو میں دیکھ رہی ہوں۔ پھر ان سے صبر کی بات کرتی۔ میں رو کر پھر چیخ پڑی تم لوگ دیکھتے کیوں نہیں۔ وہ میرے بھائی کو لے جا رہے ہیں۔ انہیں روکتے کیوں نہیں۔ خدا کے لئے انہیں روکو۔ مجھے اس وقت گھر میں بھی تمام لوگ بیک وقت دکھائی دے رہے تھے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ سب افسوس کر رہے تھے کہ بہن کو بھائی کی موت کا گہرا صدمہ ہو گیا ہے۔ دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ مجھے اس وقت یہ سب لوگ زہر لگ رہے تھے۔ اس لئے کہ کوئی بھی صورت حال کو صحیح نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ انہیں دیکھنا چاہئے جو میں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے شدید جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سب مجھے اپنے دشمن لگ رہے تھے۔ اگر یہ واقعی میرے غم سے رنجیدہ تھے تو ایک بار تو ان فرشتوں کو روکتے۔ یہ تو ان کے قریب جاتے ہی نہیں تھے۔ ان کے لئے انہوں نے سارا راستہ خالی کر دیا تھا۔ بس ایک میں ناتواں ان کے راستے پر کھڑی تھی۔ وہ چار ہٹے کٹے بھلا میری کیا سنتے۔ میرے اندر کا درد ایک طوفان تھا جو ہر خس و خاشاک کو بہانے

کو تیار تھا۔ چند گھنٹوں بعد مجھے نیند آ گئی۔

صبح اٹھ کر صحن میں قدم رکھا تو ایک دم کیلوں کے درخت کی جانب نظر گئی۔ درخت کے اوپر بھائی کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ یہ ان کی حسرت ہے۔ وہ گھر کا پہلا پھل کھانا چاہتے تھے۔ میں نے کسی سے ذکر نہ کیا مگر دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ میں یہ نہیں کھاؤں گی۔ کھانے کی حسرت لے کر میرا بھائی جس کے لئے دنیا سے چلا گیا۔ میں صحن سے لوٹ آئی۔ اس درخت سے جیسے خوف سا آنے لگا مگر یہ صرف میں ہی گھر میں اکیلی ایسی نہیں تھی۔ تین دن کے اندر سارے گھر والوں کی یہ حالت ہوگئی کہ سب ہی نے کیلوں کے درخت پر بھائی جان کی صورت دیکھی۔ سب کھلی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ابا بھی اس درخت سے سخت خائف ہوگئے۔ شام کو تو کوئی بھی صحن میں نہ جاتا۔ درخت کے پاس جانا دشوار ہوگیا۔ ہر ایک کی زبان پر یہی بات تھی کہ اس درخت کو کٹوا دو۔ چھوٹے بھائی جان اور امی ابا صلاح کرنے لگے کہ پھلدار درخت کاٹنا گناہ ہے۔ ابھی پھل بالکل ہی کچا ہے مگر سارا گھر ایسا خوفزدہ ہورہا تھا کہ جیسے درخت اب یہاں نہیں ہونا چاہئے۔ اس کو کیا کریں میرے کانوں میں بھائی جان کی آواز گونجتی۔ پہلا پھل میں ہی کھاؤں گا اماں۔ ان کی گردن ہر دم درخت پر دکھائی دیتی۔ یہ بات صرف میری ہوتی تو کچھ نہ تھا مگر اب تو سارا گھر دیکھ رہا تھا اور سب خوفزدہ تھے۔ بھائی جان نے مولوی صاحبان سے اور چند لوگوں سے بات کی۔ باقاعدہ فتویٰ لیا انہوں نے

فتویٰ دیا کہ اگر ایسی بات ہے کہ سارا گھر اس درخت کو کٹوانے پر آمادہ ہے تو کٹوا دیں۔ بھائی کی خواہش غالب آگئی تیسرے دن درخت کو پوری طرح جڑ سے کٹوا دیا گیا۔ کسی کا جی تک نہ چاہا کہ اس پھل کو ہاتھ بھی لگائے۔ عجیب وحشت تھی سب کے دلوں پر۔ وہ کیلے ایک غریب عورت لے گئی۔ اس وقت سے گھر کی وحشت دور ہوگئی پھر کسی کو نظر نہ آئے۔

میں روزانہ باہر کے برآمدے میں جا کھڑی ہوتی جس وقت وہ صبح دفتر جانے کے لئے آتے تھے جلدی جلدی آتے اماں کے پاس جاتے۔ سلام کرتے اور کہتے اچھا اماں میں آتا ہوں۔ ہر روز میری آنکھوں کے سامنے یہی منظر دہرایا جاتا۔ میں کھلی آنکھوں سے انہیں اس طرح آتا دیکھتی۔ ان کی آواز سنتی۔ یہ سب کچھ اتنا واضح ہوتا کہ میں باقاعدہ ان سے آتے جاتے باتیں کرتی۔ ان سے ان کا حال پوچھتی۔ گھر کی باتیں بتاتی۔ اپنا دکھ بتاتی۔ میں جانتی تھی کہ ان کی روح ہر روز اس طرح آتی ہے۔ وہ اماں کو سلام کرنے آتے ہیں۔ انہیں اماں سے بے حد محبت ہے اور ان کی فکر بھی ہے۔ اماں ممتا کے دکھ میں انہیں بے وفا کہنے لگتی تھیں۔ اب انہیں کون بتاتا۔ ان کا بیٹا تو اب بھی اپنی وفائیں نبھا رہا ہے۔ میری زبان بند تھی۔ میں جان گئی تھی کہ لوگ میری طرح سب کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ مجھے پاگل سمجھیں گے یا پھر سمجھیں گے کہ اعصابی کمزوری کی وجہ سے میں صدمے کا شکار ہوں۔ نہ میرا دل کمزور ہے نہ میرے اعصاب کمزور ہیں۔ بس اللہ کے سوا مجھے اور کوئی

نہیں جان سکتا۔

پورے چالیس دن تک بھائی جان روزانہ آکر اماں کو سلام کرتے اور مجھ سے ایک دو باتیں کر کے جلدی جلدی رخصت ہوجاتے۔ میں جب بھی ان سے پوچھتی آپ ٹھیک ہیں کہتے ہاں ٹھیک ہوں اور کوئی بات وہاں کی نہیں بتاتے۔ چالیسویں کے بعد ایک دن اسی وقت آئے اور کہنے لگے شمامہ اب میں روز روز نہیں آسکوں گا مگر کبھی کبھی تم لوگوں کو دیکھنے آسکوں گا۔ اس دن مجھے بڑی ہی تکلیف ہوئی۔ اس دن مجھے سچ مچ بھائی جان کے مرنے کا احساس ہوا کہ واقعی اب میرا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے اور میں اسے نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ قدرت کا قانون ہے۔ جان سے زیادہ عزیز ہستیاں کیسے پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔

اس کے بعد پھر بھائی جان نہیں آئے۔ میں نے دو تین دن ان کا انتظار کیا۔ پھر صبر کرلیا کہ نہ جانے وہاں ان کی کیا مجبوریاں ہوں گی۔ اس عرصے میں ایک بار میری حبیب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم مرنے کے بعد روح کے دنیا میں آنے پر یقین رکھتے ہو۔ وہ کہنے لگا نہیں۔ اگر روحیں دنیا میں آئیں بھی تو انہیں کون دیکھ سکتا ہے۔ میں یہ سن کر چپ ہوگئی۔ پھر میں نے بھائی جان سے متعلق کوئی بات اسے نہیں بتائی۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ مجھے پاگل سمجھے اور مجھ سے ملنا بند کردے۔

ان چند دنوں میں مجھے یوں لگا جیسے میں ایک دم بڑی ہوگئی ہوں۔

میرے اندر گھر کی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھا۔ بڑے بھائی زیادہ تر گھر کو سپورٹ کرتے تھے۔ ابا ریٹائرڈ تھے۔ دونوں بھائی مل کر گھر چلاتے تھے۔ ہمیں امی نے یہی تربیت دی تھی کہ ضرورت پڑنے پر خود کمانا کھانا۔ کسی کی محتاجی اچھی نہیں ہے۔ میں نے گھر کی طرف دیکھا۔ ہم چھ بہنیں اور ماں باپ گھر میں تھے۔ بڑی بہن نرسنگ کا کورس کررہی تھی۔ سکینہ اور میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ ابھی اس کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا۔ سکینہ فیشن ایمبرائڈری بھی سیکھتی تھی اور ساتھ میں چند لڑکیوں کے گھر جاکر سکھاتی بھی تھی۔ اسے مشینی ایمبرائڈری کا بے حد شوق تھا۔ سلائی بھی وہ بڑی عمدہ کرتی تھی۔ مجھ سے چھوٹی تینوں بہنیں اسکول میں پڑھتی تھیں۔ سب سے چھوٹی آٹھ نو سال کی تھی۔ اس سے بڑی دس سال کی تھی۔ اس سے بڑی تقریباً" چودہ سال کی تھی۔ میں نے گھر کا جائزہ لیا۔ ابھی ان چھوٹی بہنوں کی تعلیم باقی ہے۔ ساری بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ ایک بھائی ہے اس کی اپنی فیملی ہے۔ وہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرے گا کہ ہمیں کرے گا۔ ذمہ داری کا یہی احساس ہم تینوں بڑی بہنوں کے اندر جاگ اٹھا۔ کوئی بھی ایک بھائی کے اوپر بوجھ ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سکینہ نے مشین ایمبرائڈری سکھانے کے لئے کئی لڑکیوں کے ٹیوشن اور لے لئے۔ بڑی بہن نرس بن چکی تھیں اور ہسپتال میں کام کرنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ ابھی تو میرا میٹرک کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا۔ کسی سے ٹیلی فون آپریٹر کا پتہ لگا کہ وہ میٹرک پاس کو لیتے ہیں۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ بس یہی کام کرنا ہے۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں پاس
ہوجاؤں گی۔ امی نے تو اجازت دے دی تھی۔ اب مسئلہ بھائی کا تھا۔ بڑی
ہمت کر کے میں نے ان سے پوچھا اور کہا کہ میں گوارا نہیں کرسکتی کہ آپ پر
اس قدر بوجھ پڑے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھالیا۔ نہایت محبت
کے ساتھ کہنے لگے۔

شامہ تمہاری عمر ابھی مشکل سے سولہ سال ہے۔ تم نے ابھی دنیا میں
باہر نکل کر دیکھا ہی کیا ہے۔ دنیا اچھی نہیں ہے۔ جوان لڑکیوں کو آفس میں
کام کرنے پر دنیا اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا
پڑتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کالج میں داخلہ لے لو۔ تم پڑھائی میں اچھی ہو۔
کم از کم بی اے کرلو۔ پھر شادی کردیں گے۔ مگر میرے اندر یہ احساس اس
قدر شدید تھا کہ میرا ضمیر کسی قیمت پر یہ گوارا نہ کرسکا کہ ایک بھائی پر گھر کا
سارا بوجھ پڑجائے مجھے اندر سے پورا حوصلہ بھی تھا کہ میں آرام سے یہ جاب
کرلوں گی۔ ادھر ادھر میرے خراب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ حبیب میرے لئے مجازی خدا کا درجہ رکھتا تھا۔ میں اس سے پرستش کی
حد تک عشق کرتی تھی۔ بھائی نصیحت کررہے تھے اور میرا دل انہیں جواب
دے رہا تھا۔ جب میں کسی طرح نہ مانی تو بھائی نے کہا۔ اچھا میری ایک
نصیحت پلے سے باندھ لو۔ وہ یہ ہے کہ سننا سب کی کرنا اپنی۔ تم جب باہر نکلو
گی تو تمہیں بے شمار لوگ ملیں گے جو تمہارے برے وقت پر دل جوئی بھی

کریں گے اور تمہیں طرح طرح کے مشورے بھی دیں گے۔ ایک آدمی اتنی
باتوں پر عمل نہیں کرسکتا۔ ایسے وقت تم سب کی باتیں سب کے مشورے غور
سے سننا اور پھر ان میں سے جو بھی تم کو پسند آئے اپنی مرضی سے اپنے
ارادے کے ساتھ اس پر عمل کرنا۔ کسی کی ناراضگی کی فکر نہ کرنا۔ کوئی شخص
بھی دنیا کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ میری بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ سننا سب کی کرنا
اپنی۔ میرے لئے بھائی کی نصیحت حضرت لقمانؑ کی نصیحت سے کم نہ تھی۔ جو
زندگی کے ہر موڑ پر میرے لئے مشعل راہ بنی رہی۔

میں ٹیلی فون ایکسچینج گئی۔ وہاں انٹرویو میں جب میں نے بتایا کہ ابھی میرا
رزلٹ آنے والا ہے تو پہلے تو انہوں نے کہا کہ بعد میں آنا۔ میں نے کہا آپ
مجھے رکھ لیں۔ ایک دو ہفتے میں میرا رزلٹ آہی جائے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔
کہنے لگے ہم میٹرک پاس سے نیچے لیتے ہی نہیں۔ میں نے کہا میں انشاء اللہ
ضرور پاس ہوجاؤں گی۔ وہ میری طرف سے غور سے دیکھنے لگے۔ کہنے لگا آپ
کو یقین ہے۔ میں نے کہا مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ میں سیکنڈ ڈویژن میں
پاس ہوجاؤں گی۔ وہ افسر کہنے لگا چلئے رکھ لیتے ہیں مگر اس شرط پر کہ اگر فیل
ہوگئیں تو ہم نہیں رکھ سکتے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور دوسرے دن کام سے
لگ گئی۔ پندرہ دن بعد میرا رزلٹ آگیا۔ میں سیکنڈ ڈویژن سے میٹرک میں
کامیاب ہوگئی تھی۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ اس افسر نے بھی اپنی خوشی کا
اظہار کیا اور حبیب تو اس قدر خوش ہوا کہ جیسے میں نے پی ایچ ڈی کرلی ہے۔

ایکسچینج میں لڑکے لڑکیاں سب اکھٹے کام کرتے تھے۔ خصوصاً جہاں میں
کام کررہی تھی۔ وہاں سب لوگ بہت اچھے تھے۔ اصل میں شروع شروع میں
تو میں چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔ کم ہی کسی سے بولتی تھی۔ ویسے بھی مجھے
زیادہ بولنے کی عادت نہ تھی۔

ان دنوں میرے سر پر اس قدر گھر کی ذمہ داری کا بوجھ تھا۔ حالانکہ گھر
کی مالی حالت اتنی بری نہیں تھی۔ اللہ کا فضل تھا مگر بس ہر وقت میرے سر پر
سوار رہتا کہ مجھے کسی پر بوجھ نہیں بننا ہے۔ بڑے بھائی کے جانے سے مالی
وسائل میں جو کمی ہوگئی تھی اس کو دور کرنے کے لئے گھر والوں کی مدد کرنی
ہے۔ مجھے تین چھوٹی بہنوں کا اس قدر خیال آتا جیسے وہ میری بہنیں نہیں
میرے بچے ہیں۔ اور ان کی کفالت میرے ذمہ ہے۔ مجھے اس میں بڑی ہی
خوشی ملتی کہ میں کسی کے کام آرہی ہوں۔ ساڑھے سات گھنٹے ڈیوٹی ہوتی تھی
اور ایک گھنٹہ جانے اور ایک گھنٹہ بس میں آنے میں خرچ ہوتا تھا۔ اس
دوران میں ایک آنے کے پکوڑے اور ایک آنے کا بن لیتی اور پانی پی کر اپنا
پیٹ بھرتی۔ باقی سارے پیسے امی کو دیتی تھی۔ پہلی کو جب تنخواہ ملتی تو خوشی
خوشی پاس مارکیٹ سے ایک ڈیڑھ روپے کے پھل خریدتی۔ سستا زمانہ تھا۔
تھیلہ بھرجاتا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چھوٹی بہنوں کو خوشی سے پکارتی کہ
دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔ پھر اسی وقت تینوں کو ایک ایک روپیہ
جیب خرچ دیتی۔ باقی پیسے امی کو دیتی۔ سارا گھر خوش ہوجاتا۔ ہم ہنستی گاتیں۔

بڑا ہی خوشگوار ماحول ہوتا۔ ساری بہنیں سہیلیوں کی طرح تھیں۔

سکینہ سے بڑی بہن جو نرسنگ کی جاب کررہی تھی وہ اسپتال کے
اسٹاف ہاؤس میں ہی رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے ان کی ڈیوٹی اکثر ٹی بی وارڈ میں
لگایا کرتے تھے کیونکہ وہاں اور نرسیں جانا پسند نہیں کرتی تھیں اور عام طور
سے نائٹ ڈیوٹی ہوتی تھی۔ صبح ناشتہ میں انہیں دو انڈے ملتے تھے۔ یہ کچے
ہوتے تھے کہ جیسا مرضی اپنی پسند سے پکوالیں۔ ان کے اندر محبت اور ایثار
اس قدر تھا کہ پورے پندرہ دن انڈے جمع کرتیں۔ فرج میں رکھوا دیتی اور
پندرہ دن بعد جب گھر لوٹتیں تو سب کے ساتھ ہی پکا کر کھاتیں۔ امی کا دل
بہت دکھتا۔ وہ بار بار کہتیں کہ نائٹ ڈیوٹی کے بعد تجھے انرجی کی ضرورت ہے
وہیں کھالیا کرو مگر وہ ہمیشہ یہی کہتیں امی سب کے ساتھ مل کر کھانے میں مزہ
آتا ہے۔ سب بہنیں خوش ہوجاتی ہیں۔ دراصل ہمیں شروع ہی سے ایک
دوسرے کا خیال رکھنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ ہم کبھی اپنی ذات کے لئے کچھ
بھی نہ سوچتے تھے۔ ہمیشہ یہی ذہن میں رہتا کہ ہماری ذات سے کس طرح
دوسروں کو فائدہ اور خوشی پہنچے۔

سکینہ تو ہر وقت دوسروں کی مدد میں سرگرداں رہتی۔ محلے پڑوس کی
لڑکیوں کو جس کو بھی ضرورت پڑتی سلائی، امبرائڈری میں اس کی مدد کرتی۔
غرض یہ کہ پورے گھر میں خدمت خلق میں سکینہ سب سے آگے تھی۔ اس
وجہ سے اس کے بہت سے ملنے جلنے والے تھے وہ گھر جا کے جو بھی کام کردیتی

تھی لوگ اس سے بے حد خوش تھے۔ بڑی تعریف کرتے تھے۔ میں بہت ہی کم کسی کے گھر جاتی تھی۔ آفس میں ہی دن بھر لگ جاتا۔ گھر آ کے کچھ گھر کے کام کرتی۔ کھانا وغیرہ بھی اپنی باری پر پکاتی۔ باقی کام کرتے کرتے گاتا گانا میری عادت تھی۔ اصل میں گانا میرے موڈ کی ترجمانی کرتا۔ جب دل افسردہ ہوتا کسی وجہ سے تو غمگین گانے لب پر آتے اور جب خوش ہوتی تو خوشی کے گانے۔ گانا میری فطرت تھی اور ہے۔

حبیب کے اور میرے درمیان خطوں کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوا تھا۔ تقریباً" ہر پندرہ بیس دن میں ایک خط حبیب کو ضرور لکھ دیتی۔ جب ملتے تو یہ خط دے دیتی۔ ان خطوں میں کوئی دنیاوی بات نہ ہوتی۔ بس بندگی کے اس عشق کا اظہار ہوتا جو بچپن سے میرے دل میں پل رہا تھا۔ عشق کی اس شدت کا بیان ہوتا جس کی تصویر ہر لمحے میرے تصور کے پردے پر رہتی تھی۔ حبیب کو لکھا ہوا ہر خط میرے اس تقاضے کی تسکین تھا۔ میں شروع ہی سے اپنے اندر اٹھنے والے تقاضوں کا رخ جانتی تھی میں جانتی تھی کہ میرے اندر اللہ کے عشق کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ اس دریا کا بہاؤ کبھی ماں کی جانب ہوتا، کبھی سہیلی کی جانب، کبھی بہن بھائیوں کی جانب اور اب عشق کے تقاضے کا بہاؤ حبیب کی جانب تھا۔ میں اکثر تنہائیوں میں اپنے اندر اٹھنے والے ان تقاضوں پر سنجیدگی سے غور کرتی تو مجھے یہی پتہ چلتا کہ ہر تقاضہ اللہ ہی کی جانب سے میرے اندر آرہا ہے۔ وہ میرے اندر لوگوں کی محبت ڈالتا ہے۔ جیسے جیسے

میرے اندر کے تقاضوں کا رخ بدلتا جاتا ہے میرا اللہ ان کی تکمیل کے لئے وسائل بھی پیدا کرتا جاتا ہے۔

میں بچپن سے ہی بہت زیادہ عبادت گزار تو نہیں رہی۔ میرا عشق ہی میری عبادت ہے جو اللہ کے تصور کو ظاہر اور باطن دونوں میں جانتا ہے مگر نماز میں مجھے لطف و سرور بہت آتا۔ قرآن سے تو مجھے انتہائی لگاؤ تھا۔ میں ہمیشہ قرآن باترجمہ پڑھتی۔ میں سوچتی حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالٰی کے سب سے زیادہ محبوب بندے ہیں۔ وہ اللہ میاں سے کیسے ملتے ہوں گے۔ کیسے باتیں کرتے ہوں گے۔ کاش مجھے بھی وہ راستہ مل جائے تو میں اس راستے پر چلوں۔ میں اکثر اللہ میاں سے تکرار کرتی کہ یہ کیا راز ہے کہ آپ نے مخلوق کو پیدا کردیا اور خود پردے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں تو آپ کو جس طرح بغیر دیکھے پیار کرتی ہوں اس طرح آپ کو دیکھ کر بھی پیار کرنا چاہتی ہوں۔ میرے دل نے کبھی اللہ کو خود سے دور نہیں جانا۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے اندر ہی نظر آیا۔ میں اس سے اپنے دل کی ہر بات کرلیتی۔ اپنے مسائل میں کبھی کسی سے نہ کہتی۔ اللہ پاک خود اس کا بندوبست کسی نہ کسی طرح کردیتے تھے۔ میں جانتی تھی اللہ اتنے قریب سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر خواہ مخواہ کسی سے کہنے سننے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔

سردیوں کی رات میں جب رات آٹھ بجے کام سے چھوٹتی تو گھر پہنچتے پہنچتے رات کے نو بج جاتے۔ ان دنوں ہمارے گھر کا علاقہ بڑا سنسان تھا۔ بہت

سے لوگ چائے کے کھلے ہوٹل کے اطراف بیٹھے رہتے جو بس اڈوں پر ہوتے تھے۔ بس اڈے سے ہمارے گھر تک بھی ذرا چلنا پڑتا تھا۔ سردی میں راستہ بالکل سنسان ہوجاتا تھا۔ میں اتنی ڈرپوک نہ تھی مگر امی کو بہت فکر رہتی۔ ایک دو دفعہ ابا اسٹاپ پر بھی آئے۔ ایک دفعہ جب میں بس سے اتری تو امی اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھیں۔ مجھے بڑی تکلیف اور شرمندگی ہوئی۔ میں نے امی سے کہا۔ آپ آئندہ مجھے لینے نہ آئیں۔ میں خود آجاؤں گی۔ کہنے لگیں روز روز تمہارے ابا نہیں آتے۔ کہتے ہیں کہ سمجھ دار ہے خود آجائے گی۔ میں نے کہا امی بس آپ نہیں آئیں گی۔ میں واقعی بچی نہیں ہوں۔ اللہ میری حفاظت کرنے والا ہے۔ امی نے دعا دی اور کہا کہ بیٹی اللہ ہی سب کا محافظ ہے۔ میں نے اللہ سے کہا اے میرے رب میں اپنے ماں باپ خصوصاً ماں کو اپنی ذات کے لئے تکلیف نہیں دینا چاہتی تو ہی میری حفاظت رکھنا۔

دوسرے دن دفتر سے نکلی تو حبیب کھڑے تھے۔ میرے ذہن میں انہیں دیکھتے ہی خیال آیا انہیں اللہ نے میرے لئے بھیجا ہے۔ خوشی کے مارے دل کھل گیا۔ حبیب نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ اتنی رات کو تم اکیلے جاتی ہو۔ میں نے کہا یہاں تو آفس والے بھی اسٹاپ پر ہوتے ہیں۔ وہاں ابا یا امی لینے آجاتی ہیں مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ سردی میں انہیں انتظار کی تکلیف دوں۔ حبیب فوراً بولا میں تمہیں گھر تک چھوڑ آیا کروں گا۔ میں نے کہا تمہیں تکلیف تو نہیں ہوگی۔ کہنے لگا بلکہ کچھ دیر تمہارا ساتھ ہوجائے گا۔ ہم نے

فوراً ہی بس پکڑلی۔ اسٹاپ پر اتر کر اس نے مجھے گھر چھوڑا اور خود رخصت ہوگیا۔ وہ روزانہ اسی طرح کرتا۔ ہم کبھی بھی زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ بس اسٹاپ سے گھر کے راستے تک تھوڑی سی بات ہوجاتی اور بس۔

میں اللہ کی مہربانیوں پر ہروقت اس کا شکر ادا کرتی۔ ان دنوں مجھے اس بات کا کبھی احساس نہ ہوا مگر اب سوچتی ہوں کہ کیسی عجیب بات تھی۔ ہم سالوں اس طرح راستے میں ملتے رہے۔ تقریباً چار سال سڑک پر اکٹھے چلتے رہے۔ جیسے کسی نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ نہ کسی نے ہمارے والدین سے ذکر کیا۔ نہ کسی نے ہمیں راہ میں ٹوکا۔

ہمیں ملتے ہوئے تین سال ہوچکے تھے۔ حبیب کے والدین اپنی برادری میں حبیب کا رشتہ طے کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا بھی نہ تھا۔ حبیب نے انکار کردیا اور کہہ دیا کہ میں اپنی پسند سے شادی کروں گا۔ اس پر وہ کسی طرح نہ مانے اور مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ حبیب اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ عجیب سچویشن تھی۔ حبیب نے مجھے ساری بات بتائی۔ میں نے بڑے ٹھنڈے دل سے یہ ساری بات سنی اور حبیب سے بولی کہ ماں باپ کا حق اپنی اولاد پر زیادہ ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ جانے تم سے کیا کیا امیدیں لگا رکھی ہوں گی۔ تم اپنے ماں باپ کا دل میری وجہ سے نہ توڑو۔ ماں باپ کو ناراض کرکے نہ تم خوش رہ سکو گے نہ میں خوش رہ سکوں گی۔ خون کے رشتے کبھی چھوٹتے نہیں ہیں۔ میری وجہ سے اگر ان میں دراڑ

پڑ گئی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اب تم مجھ سے ملنا چھوڑ دو اور اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ حبیب یہ بات سن کر بہت ناراض ہوا۔ اس نے مجھ سے صاف صاف کہا میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ابھی تو میں نے تعلیم ختم کر کے کام شروع کیا ہے اور وہ میری شادی کا سوچ رہے ہیں لیکن ابھی کچھ دن تو میں کسی طرح ٹال سکتا ہوں۔ میں نے کہا دیکھو جب کسی طرح تمہارے ماں باپ آمادہ نہیں ہیں تو اب کیا اور جب کیا۔ رہا سوال محبت کا تو محبت تو دلوں میں بستی ہے۔ محبت کو دل سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ حبیب نے کہا تم تو پاگل ہوگئی ہو۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں بتا دیا۔ کل میں پھر آؤں گا۔ میں نے کہا کل بھی میرا یہی فیصلہ ہوگا کہ تم مجھ سے ملنا چھوڑ دو اور اپنے ماں باپ کی بات مان لو۔ دوسرے دن وہ پھر آیا۔ میں نے سختی کے ساتھ اسے ملنے سے منع کردیا۔ وہ چلا گیا یہ کہتے ہوئے کہ میں یہ شہر ہی چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔

زندگی اپنی راہ چلتی رہی مگر اس طرح جیسے اپاہج ہو۔ دو مہینے مشکل سے ہوئے تھے مجھے ہلکی ہلکی کھانسی رہنے لگی۔ میرے ہونٹ مسکرانا بھول گئے۔ میرے لب گانا بھول گئے۔ میں اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔ ہزار اپنے آپ کو سمجھاتی مگر سب بے سود تھا۔ تین ماہ میں کافی کمزور ہوگئی اور ہلکی ہلکی کھانسی میں ہی کام پر جاتی رہی۔ میں اللہ پاک سے کہتی کہ مجھے اس کٹھن دور سے گزار دے۔ امی میری گرتی ہوئی صحت سے پریشان ہوئیں۔ اب مجھے پہننے

اوڑھنے میں دلچسپی تھی نہ کسی کام میں۔ امی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے کہا ٹی بی کا اثر ہے۔ ابھی بالکل شروع ہے۔ یہ شروع ہی کی علامتیں ہیں۔ انجکشن کے کورس لگیں گے ٹھیک ہوجائے گی۔ مجھے صبح شام انجکشن لگتے۔ ہر وقت امی میری صحت کے پیچھے پڑی رہتیں۔ آہستہ آہستہ میری کھانسی ختم ہوگئی مگر دل کا حال وہی تھا۔ میرے اندر زندہ رہنے کی ہر امنگ ختم ہوگئی تھی۔ میں نے حبیب کو دیکھا تھا نہ اس کے متعلق خبر سنی تھی۔ سنتی بھی کس سے۔ کوئی ہمارے درمیان رشتے کو جانتا بھی تو نہ تھا۔

اس دن دفتر میں بیٹھی بیٹھی سوچنے لگی کہ اللہ میاں نے میرے دل میں اس کی محبت ڈالی ہے۔ ان چھ مہینوں میں میں نے بھی دیکھ لیا ہے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی نہ ہی کسی اور کا خیال کرسکتی ہوں۔ اپنا حال تو میں خود جانتی ہوں یا میرا اللہ جانتا ہے۔ حبیب کے ماں باپ کو ہمارے حال کا کیا پتہ ہے۔ میں نے اللہ پاک سے بڑی عاجزی کے ساتھ التجا کی کہ یا اللہ میں ابھی بالکل نوجوان ہوں۔ آگے چل کر میری بھی شادی کا مسئلہ کھڑا ہوگا اور میں کسی اور کا خیال بھی اب نہیں کرسکتی۔ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ ایک بار پھر حبیب اور میں مل جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو کم از کم میں ایک نظر دیکھ ہی لوں۔ میرے ذہن میں خیال آیا جب میں خود اس سے ملنے کو منع کرچکی ہوں تو اب وہ کیوں مجھے ملنے آئے گا۔ میں نے سوچا ایک ہی ترکیب ہے۔ دفتر کے کسی لڑکے کے ساتھ اس کے گھر کے قریب والے اسٹاپ پر اتر جاؤں وہاں

سے گزرے گا مجھے اجنبی لڑکے کے ساتھ دیکھ کر ضرور میری طرف آئے گا۔

میں نے ایک لڑکے سے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ میں فلاں اسٹاپ پر اتروں گی۔ تم بھی میرے ساتھ اتر جانا پھر وہاں سے مجھے جہاں جانا ہے وہاں کی بس لے لوں گی تم مجھے بس میں بٹھا کر واپس چلے آنا۔ وہ کہنے لگا کہ یہاں سے تو ہر طرف کی بسیں ملتی ہیں آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں نے کہا بس مجھ سے زیادہ سوال مت کرو۔ اگر تم میرے ساتھ جا سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں کسی اور کو ساتھ لے لوں گی۔ وہ جلدی سے بولا ارے نہیں مس شمامہ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

رات آٹھ بجے کام ختم کر کے میں اس لڑکے کے ساتھ حبیب کے گھر کے پاس والے اسٹاپ پر اتر گئی مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور یہاں کہیں ہوگا اور مجھے دیکھ لے گا۔ میں اس لڑکے کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑی رہی۔ ہر بس آنے پر وہ کہتا مس شمامہ آپ کی بس آگئی۔ میں کہتی ابھی نہیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد مجھے حبیب نظر آگیا۔ اب میں نے اس لڑکے سے کہا اب تم جا سکتے ہو۔ میری بس بھی آگئی ہے۔ میں اپنے گھر کی بس میں سوار ہوگئی۔ مجھے پوری امید تھی کہ حبیب ضرور اسی بس میں میرے پیچھے آئے گا۔ جب میں اپنے گھر کے اسٹاپ پر اتری تو وہ بھی بس سے اتر گیا۔ سلام کے بعد کہنے لگا۔ کیا حال ہے تمہارا۔ میں نے کہا ٹھیک ہوں۔ کہنے لگا وہ لڑکا کون تھا۔ میں نے کہا وہ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ کہنے لگا اس کے ساتھ یہاں کیوں آئی تھیں۔ میں نے

سادگی سے کہا آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ پھر ہماری فوراً صلح ہوگئی۔ لڑائی تھی ہی کب۔ حبیب نے بتایا کہ اس کے بعد وہ ماں باپ سے ناراض ہو کر دوسرے شہر اپنے رشتہ داروں کے پاس چلا گیا تھا۔ ایک ماہ بعد ماں باپ نے بلوالیا۔ اس شرط پر کہ اب شادی کی بات نہیں کریں گے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب عمر بھی شادی نہیں کروں گا۔ میں نے بھی بتایا میں بہت بیمار رہی میرا تو پہلے ہی یہ فیصلہ تھا کہ کسی اور کا خیال بھی نہیں کروں گی۔ اس نے مجھے سمجھایا کہنے لگا جب وقت آئے گا تو میں تم سے ماں باپ کے بغیر شادی کرلوں گا جب ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم کہیں اور شادی کا خیال بھی نہیں کرسکتے تو پھر ہمیں کسی کی ناراضگی اور رضامندی کا سوچنا فضول ہے۔ ہم پھر پہلے کی طرح ملنے لگے۔

مجھے سروس کرنے کو تین سال ہونے کو آئے تھے۔ ہم نے سوچا اب ہمیں شادی کرنا چاہئے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی طرف سے کوئی ڈر نہ تھا۔ میں جانتی تھی وہ ایسے تنگ نظر نہیں ہیں۔ میں کہوں گی تو مان جائیں گے۔ حبیب نے پھر اپنے والدین سے کہا۔ اس کی ماں اور بہن مجھے دیکھنے آئیں۔ دونوں نے مجھے ناپسند کردیا۔ میں نے اس وقت تک اپنے گھر میں نہیں بتایا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر پسند آگئی تو پھر ہی بات کروں گی۔ حبیب کو پتہ چلا تو پھر انہیں ضد آگئی۔ گھر میں ماں باپ کے ساتھ پھر تلخ کلامی ہوئی۔ مجھے اس نے کہا میرے ماں باپ تو مانیں گے نہیں۔ بہتر ہے کہ ہم شادی کرلیں۔ بعد میں

وہ خود ہی راضی ہوجائیں گے۔ ہم دونوں بالغ ہیں۔ شریعت میں ہمیں اپنی مرضی کی شادی کرنے کا پورا حق دیتی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں تیار ہوں میں اپنی امی سے بات کروں گی۔

چند دن بعد میں نے حوصلہ کر کے امی سے کہا کہ امی ایک لڑکا ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ امی کہنے لگی ٹھیک ہے تمہارے بھائی کو بلاؤں گی اس کے سامنے اسے بلوالینا۔ بھائی جان کا مجھ پر بہت رعب تھا۔ ویسے وہ بے حد نیک اور رحم دل تھے۔ میرے بھائی اور ایک کزن کے ساتھ حبیب کا انٹرویو ہوا۔ ابھی وہ ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں دوسرے کمرے میں تھی کہ میری بہن جسے صورت حال کا پتہ لگ گیا تھا میرے پاس آئی کہنے لگی۔ بھائی جان کی صورت بڑی سنجیدہ لگ رہی ہے سب ہی بہت چپ چاپ بیٹھے ہیں لگتا ہے بھائی جان نے انکار کردیا۔ اتنا سنتے ہی میری ناک سے ایک دم نکسیر پھوٹ گئی۔ حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں نے جلدی سے دوپٹہ ناک پر رکھا۔ سارا دوپٹہ خون سے تر ہوگیا۔ بہن گھبرا کر بھائی کو اندر بلا لائی۔ بھائی نے مجھے تسلی دی۔ فوراً" لٹا دیا۔ کہنے لگے گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پھر دوبارہ حبیب کے پاس واپس چلے گئے۔ حبیب چلا گیا تو بھائی جان امی سے کہہ رہے تھے۔ لڑکا نہایت ہی شریف ہے ہمیں پسند آیا۔

دوسرے دن رات کے گیارہ بجے میرے بڑے بہنوئی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگے ایک راز کی بات کرنی ہے۔ میں ہنس دی کہ راز کی

بات اور وہ بھی مجھ سے۔ میں سمجھی یونہی مجھ سے مذاق کررہے ہیں۔ وہ بولے اپنا کان قریب لا۔ پھر آہستہ سے میرے کان میں بولے کل تیری شادی ہورہی ہے مہندی لگا لے۔ میں ایک دم اچھل پڑی۔ کل میری شادی ہورہی ہے۔ کہنے لگے ارے ہاں۔ کل تیرا دولہا سہرا باندھے آئے گا تجھے لینے۔ اب میرے سمجھ میں آیا کہ میری نکسیر کا خون دیکھ کر بھائی جان بہت پریشان ہوگئے انہوں نے میری محبت کا اندازہ لگالیا اور فوراً" ہی شادی طے کردی۔ دوسرے دن میرے تو تمام گھروالے اور رشتہ دار تھے مگر حبیب صرف اپنے ایک دوست کے ساتھ آیا تھا۔ ہماری شادی ہوگئی۔ حبیب کو سب ہی نے پسند کیا۔ رخصت ہوکر ہم بھائی جان کے ساتھ رہے۔ وہ جس بلڈنگ میں رہتے تھے وہیں ایک فلیٹ خالی تھا اس میں مجھے لے گئے۔

حبیب نے پہلی رات مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ اب میں تیرے ان خطوں سے محروم ہوجاؤں گا۔ میں سوچنے لگی زندگی کتنے خوشگوار موڑ پر آگئی ہے۔ تیسرے دن بھائی جان نے ہمیں گھر سیٹ کرنے میں پوری مدد کی۔ کچن کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں اپنے گھر کی انتہائی خوشی تھی۔ تیسرے دن بڑا مزہ آیا۔ حبیب کام پر سے واپس آئے تو انہیں بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے کہا چلو اب اپنے کچن میں پکانا شروع کردیتے ہیں۔ اس سے پہلے بھائی جان کے ہاں ہی کھانا کھا رہے تھے۔ ابھی تیسرا دن ہی تھا۔ میں نے جلدی جلدی آٹا گوندھا۔

بھائی جان بھابھی کہیں گئے ہوئے تھے۔ آٹا ذرا پتلا ہوگیا۔ میں ویسے ہی حبیب کے سامنے روٹی ڈالتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ ادھر آٹا پتلا ہوگیا تو ادھر توا بھی بالکل اوندھا تھا۔ مجھے امی کے گھر کی عادت تھی سیدھے توے پر روٹی پکانے کی۔ اب جو روٹی بیل کر توے پر ڈالی تو آدھے توے پر اور آدھی زمین پر۔ حبیب کہنے لگے ہٹ تیرے کی۔ اب تو مجھے روٹی پکانا بھی سکھانی پڑے گی۔ ہم خوب ہنسے۔ پھر حبیب نے روٹی پکائی میں نے بھابھی کے کچن سے سالن لیا۔ دونوں نے مل کر کھایا۔ حبیب بعد میں جب بھی موقع ملتا کہنے سے نہ چوکتے روٹی پکانی تو تجھے میں نے سکھائی ہے۔ میں ایک پتی ورتا استری کی طرح فوراً ان کی استادی تسلیم کرلیتی۔

چار پانچ دن بعد حبیب نے اپنے گھر والوں کو خط بھجوا دیا کہ ہم نے شادی کرلی ہے بعد میں وہ تقریباً ہر ہفتے جاتے۔ میں نہیں جاتی۔ میں نے شادی کے بعد سروس بھی چھوڑ دی تھی۔

چاندنی رات

دو ماہ بعد ہمیں وہ فلیٹ چھوڑنا پڑا اور ایک دوسری جگہ دو کمرے کرائے پر لے لئے۔ اس میں ہم ایک سال رہے۔ ہماری بیٹی پیدا ہوئی۔ ہمارے درمیان محبت بڑھتی ہی جارہی تھی۔ زندگی بہت پرسکون تھی۔ بیٹی کی پیدائش پر حبیب بے حد خوش تھے۔ ابھی وہ مشکل سے دو ہفتے کی تھی کہ اسے لئے لئے پھرتے۔ پان کی دکان پر جا رہے ہیں تو وہ کمبل میں لپٹی ساتھ ہے۔ آس پاس کے دکان والے تو سارے جان گئے تھے اور دکان پر آنے والے بھی جان گئے تھے کہ حبیب صاحب کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ حبیب کو اپنے "شاہکار" پر بڑا فخر تھا۔ ایک سال بعد ہم دوسرے مکان میں شفٹ ہوگئے۔ ان دنوں ہمیں سوائے تھوڑی سی مالی پریشانی کے علاوہ کوئی پریشانی نہ تھی۔ حبیب کی تنخواہ کا ایک تہائی تو کرائے میں چلا جاتا تھا۔ کچھ وہ اپنے گھر بھی والدین کو دیتے تھے۔ باقی میں گھر چلتا۔ میرا ذہن کبھی بھی روپیہ پیسے کی طرف نہیں گیا۔ میرے دل میں کبھی کوئی خواہش ہی نہیں ہوتی تھی۔ جتنا ملتا اسی میں گزارہ کرلیتی۔

عام طور سے یہ تھا کہ مہینے کے آخری دس دنوں میں نہ گھر میں شکر ہوتی، نہ دودھ کے لئے پیسے ہوتے۔ حبیب اور میں خوب ہنستے، ہم کہتے چھوڑو یار کالی چائے میں نمک ڈال کے پی لیتے ہیں۔ ہم دونوں ہی اس معاملے میں سخت لاابالی تھے۔ مالی تنگی تو ہمارے ذہن کے اوپر سے ہی گزر جاتی تھی۔ تقریباً" ہر ماہ ایسا ہوتا کہ میرے پاس ہنڈیا پکانے کے لئے کوئی چیز نہ ہوتی مگر میں نے کبھی بھی حبیب کو پتہ نہ لگنے دیا۔ میں سوچتی وہ کہاں سے لائیں گے خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ نہ ہی میں نے کبھی اپنے گھر والوں کو خبر ہونے دی بس میں یہ کرتی کہ جہیز کے تھوڑے بہت سامان میں سے جو فالتو برتن وغیرہ ہوتے وہ چپکے سے ٹین ڈبے والوں کو بیچ دیتی۔ ان میں انڈیا کے نقاشی والے اسٹیل کے برتن بھی چند تھے جن پر میری نانی مرحوم کا نام نقش تھا۔ میری ماں نے بہت محبت سے مجھے دیئے تھے کہ یہ ان کے جہیز کے ہیں لیکن مجھے انہیں بیچتے ہوتے ذرا بھی دکھ نہ ہوتا۔ بس میرے ذہن میں صرف یہ ہوتا کہ حبیب جب شام کو آئیں گے تو کھانا تیار ہونا چاہئے اور انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ پیسے ختم ہوگئے ہیں۔ تنخواہ تو وہی پہلی کو ملتی ہے۔ مجھے اس وقت تک جس طرح بھی ہو کام چلانا ہے۔ حبیب کو میں نے کبھی نہیں بتایا کہ میں اس طرح گھر چلاتی ہوں۔ میں سوچتی وہ پریشان ہوں گے کہ ان کی کمائی پوری نہیں پڑتی ہے۔ ویسے بھی میرے نزدیک اس کی اتنی اہمیت ہی نہیں تھی۔

تھوڑے ہی عرصے میں حبیب کی ترقی ہوگئی اور سال میں دو تین دفعہ

بونس بھی مل گئے جس سے ہمارے گھر کئی چیزیں آگئیں۔ میں اللہ کی مہربانیوں پر ہر وقت شکر گزار ہوتی۔ اللہ نے رزق میں بے حساب برکت ڈال دی تھی جب میرے پاس بیچنے کو سارے جہیز کے برتن ختم ہوگئے تو حبیب کو بونس ملنے شروع ہوگئے اور ہمیں تنگی نہ ہوئی۔ ان دنوں مجھے چونکہ گھر گرہستی اکیلے چلانے کی اتنی عادت نہیں تھی۔

شروع شروع میں بڑے مزے مزے کے واقعات پیش آئے۔ ایک دن حبیب صبح صبح پائے لے کر آئے کہ شام کو پکالینا۔ میں وہ پائے ہنڈیا میں چڑھا کر دوپہر میں سوگئی۔ مجھے ان کے گلنے کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ میری نیند بھی مدہوشی کی ہوتی تھی۔ شام کو حبیب نے ہی آکر جگایا۔ جاگتے ہی مجھے پائے یاد آئے۔ حبیب کہنے لگے جلنے کی بو کہاں سے آرہی ہے۔ ہم دونوں باورچی خانے کی طرف دوڑے۔ پائے کی ہڈیاں دیگچی سمیت کوئلہ بنی ہوئی تھی۔ اب جو ہم دونوں کو ہنسی آئی۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں درد ہوگیا۔ حبیب کہنے لگے اب میں کیا کھاؤں گا۔ اس طرح دوچار دفعہ اور بھی میری ہنڈیا جلی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں پھوہڑ تھی بلکہ میں گھر گرہستی میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ خدمت گزار بھی بے حد تھی، محنتی بھی تھی۔ اس کی تو حبیب بھی بہت تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے پتہ ہوتا کہ تو اتنی اچھی بیوی ثابت ہوگی تو میں پہلے ہی تجھ سے شادی کرلیتا۔ مگر بس میرے اندر ایک کسر تھی مجھے ان دنوں نیند بڑی گہری آتی تھی۔ جب سوتی تھی تو سو ہی جاتی تھی۔

مجھے یاد ہے شروع دنوں میں حبیب ایک شام کام سے آکر کھانا وغیرہ کھا کے اپنے والدین کے گھر چلے گئے۔ اب میں اکیلے کیا کرتی۔ تھوڑا بہت کام کیا پھر مجھے نیند آگئی میں اندر سے کنڈی لگا کر سوگئی۔ ابھی صرف نو ساڑھے نو ہی بجے تھے۔ حبیب آئے پتہ نہیں کتنی دیر کھٹ کھٹ کرتے رہے پھر کھڑکی کھلی تھی وہاں سے اندر آکر مجھے ہلاتے جلاتے رہے۔ بڑی مشکل سے میری آنکھ کھلی۔ حبیب خوب ناراض ہوئے کہ ایسی گہری نیند سوتی ہے۔ آدھا گھنٹہ مجھے آئے ہوئے ہوگیا دروازہ کتنی دیر کھٹکھٹاتا رہا۔ اتنی مشکلوں سے کھڑکی سے کود کر اندر آیا۔ دس منٹ سے تجھے ہلا رہا ہوں رات کو گھر میں کوئی اور آگیا تو تجھے تو ہوش ہی نہیں ہوگا۔ میں نے بے فکری سے کہا "ارے میاں بھلا تمہارے سوا اس گھر میں کس کو آنا ہے۔" میاں اس بات پر خوش ہوگئے اور ہم دونوں ہنس دیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوشیاں ہمارے اندر سے پھلجھڑی کی طرح پھوٹتی تھیں۔ ہم دونوں ہی شروع سے خوش باش طبیعت کے مالک تھے۔

اب ہم بس گھر میں رہتے تھے۔ وہ میری امی کے گھر کے قریب ہی تھا۔ حبیب سب کے ساتھ خوب گھل مل گئے تھے۔ میرے سارے گھر والے ان پر جان دیتے تھے۔ وہ صبح صبح فجر کے وقت اٹھتے' نماز پڑھ کر بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرتے۔ پھر دفتر جاتے۔ رات کو کھانے کے بعد ہم سب امی کے گھر چھت پر چڑھ جاتے۔ میری تینوں چھوٹی بہنیں ساتھ ہوتیں۔ وہ کہانی سننے

کی فرمائش کرتیں۔ حبیب بڑے مزے مزے کی کہانیاں سناتے۔ اکثر کہانیاں وہ خود ہی گھڑ لیا کرتے تھے۔ چھوٹی بہنوں کے ساتھ ساتھ میں بھی ان کی کہانیاں بڑے شوق سے سنتی تھی۔ چاندنی راتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جب بادل آتے حبیب پتنگ لے آتے۔ ہم چھت پر چڑھ کر پتنگیں اڑاتے اور خوب شور مچاتے۔

میرے یہاں دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ حبیب کی بہنیں کبھی کبھار آجاتی تھیں۔ میں کبھی ان کے یہاں نہیں گئی۔ حبیب نے بتایا تھا کہ وہ ابھی تک ناراض ہیں۔ پھر بیٹیاں ہونے کی وجہ سے بھی کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ یہ جوانی کا جوش ہے۔ زیادہ دیر نہیں نبھ سکتی۔ پھر انہوں نے الگ ہونا ہی ہے۔ ان کے والد وقتاً فوقتاً انہیں بلاتے۔ خاندان کی خوبصورت لڑکیاں دکھاتے۔ یہ آگ بگولہ ہوکر وہاں نہ جانے کا عہد کر کے آتے۔ جب مجھ سے بتاتے تو میں انہیں سمجھاتی کہ آخر وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ تم سے محبت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ بس انہیں کہہ دیا کرو میری شادی ہوگئی بچے ہوگئے۔ اب ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ ملتے جلتے رہنے سے ان کے نظریات آہستہ آہستہ بدل جائیں گے۔ تم ملنا ترک نہ کرو آخر کو وہ تمہارے ماں باپ ہیں ان کے تم پر احسانات ہیں۔

حبیب کو شروع ہی سے انگلینڈ جانے کا شوق تھا۔ بڑی بیٹی تقریباً سوا دو سال کی تھی اور چھوٹی نو ماہ کی تھی تو ان کے جانے کا بندوبست ہوگیا۔

انہوں نے کہا کہ وہ اکیلے جا کر وہاں رہنے اور کام کا بندوبست کرکے جلد ہی
مجھے اور بچوں کو بلالیں گے۔ ان کے گھر والوں نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہاں
جا کر بیوی بچوں کو نہ بلانا۔ بس اب چھوڑ دینا گھر والوں کے سامنے انہوں نے
ہاں کردی۔ مجھے کہا کہ ایئرپورٹ تم میں سے کوئی نہ آئے تاکہ میرے گھر
والوں کو شک نہ پڑے۔ تم بھروسہ رکھو میں تم کو ضرور بلاؤں گا۔ میں نے
سوچا یہ بھی میری آزمائش ہے۔ اللہ چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ خواہ مخواہ
پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔ میں نے اپنے سب گھر والوں کو منع کردیا۔ حبیب
پر سب کو اعتماد تھا کہ وہ دھوکے باز آدمی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے
کبھی بھی اپنے نجی معاملات میں کسی کا دخل پسند نہیں کیا تھا۔ جاتے ہی حبیب
کا خط آیا۔ وہ مجھے اور بچوں کو بہت مس کررہے تھے۔ تقریباً ہر روز ان کا
خط آتا کبھی کبھی تو دو تین خط اکٹھے آجاتے۔ میرا عالم یہ تھا کہ ابھی خط لکھ کر
ہٹی ہوں تو دوسرا آگیا۔ پھر لکھنے بیٹھ جاتی۔ بڑے بہنوئی خوب ہنستے۔ ارے تم
دونوں لیلیٰ مجنوں کو خط لکھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے کیا۔

چھ ماہ کے اندر اندر انہوں نے میری اور بچوں کی ٹکٹ بھیج دی لیکن
جانے سے سترہ دن پہلے میری چھوٹی بیٹی کا کالی کھانسی میں انتقال ہوگیا۔ ہوا یہ
کہ میری دونوں بیٹیوں کو کالی کھانسی لگی تھی۔ میں اسی میں انہیں لے کر بڑی
بہن کے یہاں چلی گئی۔ اس کی بیٹی بھی انہی کی عمروں کی تھی۔ اسے بھی
کھانسی لگ گئی۔ ایک دن ان کی بیٹی کا سانس بند ہوگیا مجھے شدت سے

احساس جرم ہوا۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں بند کرکے اللہ تعالیٰ سے گزارش
کی کہ چاہے وہ میری لڑکیوں میں سے تجھے جو بھی پسند آئے وہ لے لے یا
دونوں ہی لے لے مگر بہن کی بیٹی کو چھوڑ دے ورنہ یہ قتل میری گردن پر ہوگا
مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ ایسا موذی مرض ہے۔ وہ
ٹھیک ہوگئی اور میری چھوٹی بیٹی کو ایک دن سوتے میں پھندا لگا اور سانس بند
ہوگیا جس کی وجہ سے وہ مرگئی۔ سترہ دن بعد میں انگلینڈ آگئی۔

جب میں پہلی رات انگلینڈ میں سوئی تو میں نے اللہ سے درخواست کی
کہ اے میرے رب مجھے کبھی بھی یورپ آنے کا شوق نہ تھا نہ ہی اپنے رشتے
داروں کو چھوڑنا پسند تھا مگر اب جب کہ یہ سب ہوگیا ہے تو مجھ پر اتنا کرم کرنا
کہ مجھے یہاں پر قرآن کے علوم سیکھنے کا موقعہ دینا۔ مجھے غیب کا مشاہدہ کرانا
جو بچپن سے میری تمنا ہے۔ اے میرے رب میں جانتی ہوں کہ میرا یہاں آنا
بھی تیری حکمت کے ساتھ ہے تو اس حکمت کو جانتا ہے مگر میں نہیں جانتی۔
مجھے یہاں آنے کے لئے بہت کچھ چھوڑنا پڑا ہے۔ اپنا وطن، ماں باپ، بھائی
بہنوں کی محبت جو تو اچھی طرح جانتا ہے۔ اب میں نہیں چاہتی کہ جو کچھ
چھوٹ گیا اس کو روتی رہوں، میں چاہتی ہوں ان سب کی محبتوں کے بدلے
میں تو اپنی محبت عطا فرما۔ مجھے غیب میں دیکھنے کا شوق ہے مجھے اپنے رب کو
جاننے کا شوق ہے، میں یہاں کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی۔
مجھے اپنے علوم سے نواز۔ میرے دل کو اندر ہی اندر اس بات کا یقین ہوگیا کہ

اللہ نے جو مجھے سب سے الگ تھلگ کردیا ہے تو اب وہ چاہتا ہے کہ میں روحانی علوم سیکھوں۔

حبیب نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا جو ایک بڑی سی بلڈنگ میں تھا۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ حبیب سارا دن کام کرتے۔ میں اپنی بچی کے ساتھ گھر پر رہتی۔ میں نے سوچا مجھے اللہ نے تنہائی کا زبردست موقع دیا ہے۔ مجھے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ میرے ذہن میں ہمیشہ سے یہ رہا کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس کے اندر ہر قسم کے علوم ہیں۔ کوئی علم قرآن سے ہٹ کر نہیں ہے۔ میں پہلے بھی قرآن باترجمہ پڑھتی تھی اور اپنی سمجھ کے مطابق اس میں غور کرتی تھی۔ اب میں نے باقاعدہ طور پر اسے پڑھنا شروع کیا۔ حبیب رات کو کام سے واپس آتے میں سارا دن قرآن پڑھتی رہتی۔ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی کرتی۔ مجھے یقین تھا کہ قرآن میں اللہ پاک کے اسرار موجود ہیں۔ یہ محض نصیحت کی کتاب نہیں ہے تو میں اپنے دل میں اللہ میاں سے سوال کرتی کہ وہ کون سے علوم ہیں جو اسے تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ مجھے وہ علوم سکھا دیجئے۔ اس وقت تک مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان علوم کو سیکھنے کے لئے کسی استاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تو قرآن میں جو کچھ پڑھتی تھی اللہ میاں سے اسی حوالے سے فوراً دعا مانگ لیتی تھی۔ مثلاً قرآن میں یہ پڑھا کہ

"ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کردیا ہے ہے کوئی سمجھنے والا۔"

اب میں ہزاروں بار یہ آیت دہرا دہرا کے اللہ میاں سے درخواست کرتی کہ آپ نے ہی تو اس میں لکھا ہے میں قرآن سمجھنا چاہتی ہوں۔ میرے اللہ آپ مجھے قرآن کا فہم عطا فرمائیں۔ مجھے ایک جنون سا ہوگیا تھا قرآن کے علوم سیکھنے کا۔ میرا دل کسی کام میں نہ لگتا نہ باہر نکلنے کو چاہتا۔ میں ہر وقت اللہ کا شکر کرتی کہ اس نے مجھے فرصت کے زیادہ سے زیادہ لمحات عطا کئے ہیں تاکہ میں اطمینان کے ساتھ قرآن میں غور کرسکوں۔

میرا یہ عالم تھا کہ نہا کر بال سکھانے ہیٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو بال کھلے سوکھ رہے ہیں اور اتنی دیر میں بھی قرآن میرے ہاتھ میں ہے۔ گھر کا سارا کام میں ایک روبوٹ کی طرح کرتی تھی۔ جیسے ہاتھ پاؤں اپنی حرکت کررہے ہیں مگر دل اور ذہن کسی نہ کسی آیت پر غور و فکر میں منہمک ہے۔ میں قرآن کے حوالے سے سارا وقت اللہ سے باتیں کرتی رہتی۔ سب سے زیادہ شوق مجھے حروف مقطعات یا حروف نورانی کی تشریح جاننے کا تھا کہ الم کا مطلب کیا ہے۔ الر کا مطلب کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ قرآن کے ترجمہ میں لکھا ہوا تھا کہ یہ اللہ کے اسرار ہیں اور ان کا مطلب بندوں کو پہنچایا گیا مگر میرے دل میں اتنی شدید خواہش اور تقاضہ ان کے اسرار جاننے کا ہوتا تھا کہ رہا نہ جاتا تھا۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی تھی ان الفاظ پر اور آنکھیں بند کرکے اللہ میاں سے کہتی اللہ میاں آپ نے کہا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے حبیب ہیں۔ آپ کو تمام مخلوقات سے پیارے ہیں۔

میں بھی ان کی امت سے ہوں اور قرآنی علوم سیکھنا چاہتی ہوں۔ انسان اگر یہ علوم سیکھ لے تو وہ آپ کو بہتر طور پر جان سکتا ہے اور پھر صحیح معنوں میں آپ کی بندگی کر سکتا ہے۔ غرضیکہ قرآن میں میرا اتنا زیادہ انہماک ہوگیا کہ یہ میری دھڑکن بن گیا۔ میں اسے پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

میرے دل میں ہمیشہ یہ خیال آتا کہ اگر قرآن کے علوم سیکھے بغیر ہی مرگئی تو جاہل رہ کر مروں گی۔ میں جاہل مرنا نہیں چاہتی۔ میرے نزدیک جاہلیت سب سے بڑا گناہ تھا اور ہے۔ جاہل میرے نزدیک وہ ہے جو اپنے رب کی حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی علوم سیکھنے کے راستے میں میرا ذہن کسی بھی رکاوٹ کو قبول نہ کرتا تھا۔ شروع ہی سے میرے اندر قرآن پڑھنے کا شوق اور لگن تھی۔ دوسری کسی مذہبی کتاب کی جانب دل نہ جاتا تھا۔ امی ابا نے بھی ہر وقت زیادہ تر اللہ کا ذکر کیا۔ امی تو اللہ پاک سے انتہائی محبت کرتی تھیں۔ ہر وقت اللہ کا نام ان کے منہ سے نکلتا تھا۔ ابا بھی ہمیشہ یہی کہتے کہ قرآن کو ترجمہ سے پڑھو اس کے اندر سب کچھ ہے۔ اس کے بعد ہمیں اور کسی کتاب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس اسی کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لو۔ آج میں سوچتی ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت صحیح راستے پر ڈالا۔ سب سے پہلے اللہ کی محبت دل میں ہو اور قرآن کے علوم سیکھنے کی لگن دل میں ہو تو حدیث کے علم بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ حدیث بھی تو قرآن ہی کی علمی صورت ہے۔ جو حضور پاکؐ کے ذریعے سے عمل میں

آئی۔ قرآن کی نالج ہو تو حدیث جلدی سمجھ میں آتی ہے۔

میرا یہ معمول بن گیا کہ روزانہ قرآن میں جو جو باتیں پڑھتی ان میں غور کرتی۔ یہ ساری باتیں سونے سے پہلے حبیب کو سنا دیتی تاکہ وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کچھ دن گزرے تھے کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں ایک راستے پر جا رہی ہوں۔ یہ تنگ گلیاں ہیں ان گلیوں میں کوڑا کرکٹ بھی پڑا ہوا ہے۔ میں انہیں پھلانگتی ہوئی اس سے بچتی ہوئی چلی جا رہی ہوں جیسے مجھے ایک خاص جگہ پہنچنا ہے۔ میرے ذہن میں بس اس جگہ پہنچنے کا خیال ہے۔ میں اسی خیال کے ساتھ نہایت تیزی سے ناہموار راستے اور کوڑے کے ڈھیر پھلانگتی چلی جا رہی ہوں۔ راستے میں کہیں کوڑے کے بڑے بڑے Bin رکھے ہیں۔ کہیں کچھ اور چیزیں ہیں۔ میں سفر طے کرتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہوں اور وہاں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیتی ہوں۔ جیسے میں نے اپنا مقصد پورا کرلیا ہے۔ میں نے اس خواب سے یہ تعبیر نکالی کہ اللہ نے چاہا تو میں اس ملک میں ضرور اپنی منزل مراد کو پہنچ جاؤں گی اور قرآنی علوم سیکھ لوں گی۔

میرا ہر وقت یہی جی چاہتا تھا کہ یہ علوم سیکھ کر اپنی بہنوں کو اور سب کو بتاؤں۔ پردیس کی تنہائی میں مجھے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوتی بلکہ ہر وقت اس کے لئے اللہ کا شکر ادا کرتی رہتی کہ اس نے فرصت کے ایسے زریں لمحات عطا کئے۔

دو تین ماہ بعد میں پھر امید سے ہوگئی۔ اس دوران میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھی ہوں میری نانی' پرنانی' پھوپھی سب ہی موجود ہیں۔ یہ ہستیاں میری پیدائش سے پہلے ہی مرچکی تھیں۔ صرف پرنانی میرے بچپن میں ہی فوت ہوئیں۔ وہ بھی مجھے قطعی یاد نہ تھیں۔ کمرے کے اندر پالنے میں میری مرحوم بیٹی سو رہی ہے۔ اتنے میں کمرے کی کھڑکی سے میری نظر آسمان پر پڑتی ہے' آسمان پر نور کی تین لکیریں ایک دوسرے سے متوازی ہیں ان پر نظر پڑتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ اللہ کا نور ہے جس کی مجھے ازل سے تلاش ہے۔ اس ہی لمحے اس نور کو حاصل کرنے اور قریب سے دیکھنے کا شوق ابھرا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو آسمان پر اس نور کے پیچھے پیچھے اڑتے دیکھا۔ وہ نور آگے آگے جا رہا ہے' میں بالکل اس کے پیچھے پیچھے جا رہی ہوں' نگاہ مسلسل نور پر ہے سوائے نور کے جذب کرنے' اس کی قربت حاصل کرنے کے اور کوئی خیال دل میں نہیں ہے۔ جب میں اس نور سے خوب سیراب ہوگئی تو ذہن میں زمین پر جانے کا خیال آیا کہ میری گود کی بچی اکیلی ہے۔ اسی لمحے میں زمین پر اسی کمرے میں تھی۔ داخل ہوتے ہی بچی پالنے میں اماں کہہ کر اٹھی میں نے خوشی خوشی اسے لے کر چومنا شروع کردیا۔ نانی پرنانی وغیرہ پیار سے بولیں۔ اے لے ہم اتنی دیر سے یہاں ہیں جب سے تو بے خبر سو رہی تھی اب اماں کے آنے پر اماں کہہ کر کیسے اٹھ گئی ہے۔

آنکھ کھلی تو صبح صادق کا وقت تھا۔ میری آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر نماز پڑھی اللہ کا شکر ادا کیا۔ حبیب کو خواب سنایا۔ بولے انشاء اللہ اب کے بیٹا ہوگا۔ انہیں بیٹے کا بہت ارمان تھا۔ اس لئے بھی کہ بیٹا ہوجائے گا تو ان کے ماں باپ خوش ہوجائیں گے اور خط میں بیوی اور بچی کو چھوڑنے کا ذکر نہیں کریں گے۔ ہمارے یہاں بیٹا پیدا ہوا اور سب کے مبارک باد کے خط آئے۔ پھر اس کے بعد واقعی انہوں نے کبھی چھوڑنے کی بات نہیں لکھی۔ میں نے اس کے جواب میں اپنے سسر کو پہلی دفعہ اچھا سا خط لکھا۔ سسر کو ابھی تک میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ سسرال میں گئی ہی کب تھی۔ وہ میرے خط سے بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں لکھیں۔ حبیب بہت خوش ہوئے ابھی بچہ چند ہی ہفتے کا تھا کہ میں نے خواب دیکھا۔ میں اپنے گھر میں ہوں ہم نے وہ پہلا فلیٹ چھوڑ دیا تھا اور اب اپنا گھر خرید لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی گھر میں کچن میں بچے کی دودھ کی بوتل بنانے میں مصروف ہوں۔ بڑے بھائی جان مرحوم آتے ہیں وہ کافی کمزور ہیں مگر سوٹ وغیرہ اچھا پہنا ہوا ہے۔ دروازے پر آتے ہی میں دروازہ کھولتی ہوں۔ بھائی کی آمد پر خوشی سے سلام کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی اور مقام سے آئے ہیں۔ بھائی کا چہرہ فکرمند اور سنجیدہ ہے۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر واپس کچن میں آتی ہوں کہ بھائی جان آپ یہاں ٹھہریں۔ میں ابھی بچے کا دودھ بنا کر آپ کے پاس آتی ہوں۔ وہ صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں میرے

پاس وقت نہیں ہے جلدی سے میری بات سنو۔ میرے ساتھ چلو اور فلاں
جگہ مجھے چھوڑ آؤ۔ مجھے لگا وہ بہت کمزور ہیں اکیلے نہیں جاسکتے۔ میں دودھ
بنانے لگتی ہوں اور کچن سے کہتی جاتی ہوں بھائی جان میں بچے کا دودھ بنالوں
تو آپ کے ساتھ چلوں۔ ذرا صبر کریں۔ وہ بہت ہی بے چین ہوتے ہیں۔ بار
بار آواز دیتے ہیں۔ میرے ساتھ چلو تم ہی مجھے لے جاسکتی ہو۔ تم ہی میری مدد
کرسکتی ہو۔ میں کچن سے ہی ابھی آتی ہوں ابھی آتی ہوں کرتی جاتی ہوں۔
جب میں فارغ ہوکر کمرے میں آتی ہوں تو وہ جاچکے ہوتے ہیں۔ جیسے ان کے
پاس وقت ختم ہوچکا ہے۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ اتنی جلدی کیسے چلے گئے۔
افسوس بھی ہوتا ہے کہ نہ جانے کیسے گئے ہوں گے۔

خواب دیکھنے کے بعد میں نے نماز پڑھ کر اپنے بھائی کے لئے دعائیں
مانگیں۔ جیسا کہ سب ہی کرتے ہیں۔ چند روز بعد پھر خواب دیکھا کہ میں گھر
میں ہوں اور بچے کا دودھ بنا رہی ہوں بالکل وہی خواب بھائی جان بہت کمزور
ہیں۔ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے ہیں کہتے ہیں کہ شامہ تھوڑی دور مجھے چھوڑ آ' پھر
کام کرلینا۔ میں کہتی ہوں کہ گھر میں کوئی نہیں ہے بچے کو کہاں چھوڑوں۔ اس
کا دودھ بنالوں اسے پلا کر سلادوں پھر آپ جہاں کہیں گے چھوڑ آؤں گی مگر
انہیں اتنی جلدی ہے کہ وہ انتظار نہ کرسکے اور پھر چلے گئے۔

دوسری بار یہ خواب دیکھ کر میں کافی فکرمند ہوئی۔ حبیب کو سنایا کہ کیا
کروں۔ کہنے لگے نماز پڑھ کر دعا کرو۔ میں نے بہت سے نفل ان کی مغفرت کی

نیت سے پڑھے اور اللہ میاں سے خوب دعا کی۔ میری آنکھوں میں وہ سین
گھومنے لگا۔ جب میں ساتویں جماعت میں تھی ہم سب فلیٹ میں رہتے تھے
بس ایک بہن کی شادی ہوئی تھی۔ بھائی ہم سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ہم
سب میں ہی بے حد محبت اور ایثار تھا۔ ان دنوں میری اسکول کی چھٹیاں
تھیں۔ میں نے نیا جوتا خریدا تھا۔ ایڑی سے ذرا اوپر جوتے نے کاٹ لیا چھالا
بن گیا۔ میں نے سوچا اس کو پھوڑ دوں تو جلدی ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے
قینچی سے چھالے کی پوری کھال کاٹ دی اور زخم کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ آہستہ
آہستہ یہ پھر چھالہ بن گیا میں نے پرواہ نہیں کی وہ اچھا خاصہ بڑا ہوگیا اور
بالکل ہرا نیلا سا ہوگیا۔ میں چل بھی نہیں سکتی تھی سخت تکلیف تھی۔ میں نے
سوچا اگر امی کو بتاؤں گی تو انہیں میری تکلیف کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ میں
اپنی طرف سے انہیں کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ پھر میں نے سوچا بہن
بھائیوں کو بتاؤں تو سب کی طرف نظر کرنے سے مجھے یہ لگا کہ سب گھر کے
افراد مجھ سے انتہائی محبت کرتے ہیں جب انہیں میری تکلیف کا پتہ چلے گا تو وہ
سخت پریشان ہوں گے۔ اسکول کی چھٹیاں تھیں میں ہر وقت گھر میں رہتی۔ دو
تین ہفتے میں چھالا گولف بال سے بھی بڑا ہوگیا بالکل ہرا نیلا سا پڑ گیا۔ پنڈلی
تک میری ٹانگ نیلی ہری سی ہوگئی۔ تکلیف کے مارے مجھے بخار آگیا اور ایسی
حالت ہوگئی کہ امی کو پتہ چل گیا کہ طبیعت خراب ہے۔ فلیٹ کے دو ہی تو
کمرے تھے۔ سارے زیادہ تر ایک ہی کمرے میں ہوتے تھے۔ پچھلے کمرے

میں زیادہ تر ابا ہوتے تھے۔ امی نے بھائی کو آواز دی کہ اسے ڈاکٹر کے یہاں لے جاؤ۔ مجھے چلنے کو کہا جوتا لے آئے۔ اب میں جوتا کیسے پہنتی وہاں تو ساری ٹانگ ہی خراب تھی۔ اسی صورت حال میں میری ٹانگ کا زخم نظر آگیا بس پھر کیا تھا سارا گھر حیران پریشان تھا کہ اتنی دیر یہ آرام سے کیسے رہی۔ کسی کو بتایا کیوں نہیں۔ دونوں بھائی سخت پریشان تھے۔ بھائی نے مجھے پیٹھ پر لادا اسی وقت سیڑھیوں سے اتر کر گلی میں ڈاکٹر کے یہاں لے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا زہر پھیل گیا ہے یہ انجکشن جلدی سے لے کر آؤ۔ چھوٹے بھائی جان انجکشن لینے دوڑے۔ اس کے بعد غالباً" دو تین ہفتے تک مجھے روزانہ انجکشن لگتے رہے۔ بڑے بھائی جان نہایت ہی محبت سے مجھے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر ڈاکٹر کے یہاں لے جاتے۔ دونوں بھائی مجھے پیار سے بٹھا کر سمجھاتے کہ چھالے کو کاٹا نہیں جاتا۔ ذرا سی بھی تکلیف ہو تو فورا" بتا دیا کرو۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر چند دن اور نہ آتے تو ٹانگ کاٹنی پڑتی۔

یہ سین میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ میں نے سوچا میں پردیس میں ہوں۔ بھائی چاہتے ہوں گے کہ میں انہیں نہ بھولوں۔ اسی لئے بار بار خواب میں آتے ہیں۔ میں اپنے بھائی کو کیسے بھول سکتی ہوں جنہوں نے بچوں کی طرح میری خبرگیری کی۔ میں نے اللہ میاں سے التجا کی کہ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے کہ میں کس طرح اپنے بھائی کی مدد کروں۔ اگر انہیں وہاں کوئی تکلیف ہے تو تو ہی ان کی مدد کرنے والا ہے یا مجھے بتا کہ میں کیا کروں ان کے لئے۔

میں ہر نماز میں ان کے لئے دعا کرتی، قرآن پڑھ کر ان کے لئے بخشتا۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا اور حبیب نے بھی بتایا وہ میں نے کیا۔

سسرال والے بار بار خط لکھ رہے تھے کہ بیٹے کی تصویر بھجواؤ۔ میرے بہن بھائی بھی کہتے تھے کہ جلدی سے بھجواؤ۔ میرے دل میں بھی بہت ارمان تھا کہ میرے بیٹے کو اس کے سب رشتہ دار دیکھ لیں۔ ہم نے رات کو یہ پروگرام بنایا کہ فلاں اسٹوڈیو میں جا کر بچے کی تصویر کھنچوائیں گے۔ میں نے خوشی خوشی بچے کے کپڑے بھی باہر نکال کر رکھ لئے۔ ہر چیز تیار کرلی کہ صبح صبح چلیں گے۔ رات کو خواب دیکھتی ہوں کہ گھر کے کمرے میں چھوٹے بھائی جان بیٹھے ہیں میں کچن میں بچے کی دودھ کی بوتل بنا رہی ہوں کہ اتنے میں بڑے بھائی جان لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے ہیں۔ وہ سخت نحیف ہیں چھوٹے بھائی جان انہیں صوفے پر بٹھاتے اور مجھے آواز دیتے ہیں کہ بڑے بھائی جان آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شامہ کی مدد کی ضرورت ہے وہ میرے ساتھ ذرا چلیں۔ میں نے وہیں سے آواز دی بھائی جان ابھی آتی ہوں ذرا بچے کا دودھ بنا لوں۔ وہ انتہائی بے چین ہیں کہتے ہیں جلدی آؤ ابھی چلو میرے ساتھ بعد میں دودھ بنالینا۔ میں کہتی ہوں بیٹھئے تو سہی ذرا تو انتظار کریں۔ اب جو انہیں جلال آتا ہے وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کب سے کہہ رہا ہوں میرے ساتھ چل تھوڑی دیر کے لئے۔ میں کچن سے بچے کی بوتلیں ہاتھ میں لئے دوڑ کر آتی ہوں کہ ان کا جلال دیکھ کر خوف کے مارے میرے ہاتھوں سے بوتلیں

چھوٹ جاتی ہیں اور فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں۔ میں تیزی کے ساتھ بھائی کا بازو پکڑ لیتی ہوں اور نہایت ہی محبت سے انہیں کہتی ہوں کہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ بھائی جان چلئے نا میں آپ کو لے کر چلتی ہوں۔ میں تو آ رہی تھی آپ خواہ مخواہ بگڑ گئے۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں چلئے۔ میں مستقل ان کو اسی طرح کہتی جاتی ہوں کہ ان کا غصہ ختم ہوجائے اور ان کا بازو پکڑ کے انہیں سہارا دے کر چلاتی ہوں ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں اب منظر بالکل تبدیل ہے۔ یہ ایک پل ہے جس کی چوڑائی کم ہے اس پل کے شروع کے ہی حصہ میں ایک چوڑی سی جگہ بنی ہے جہاں ایک میز ہے۔ اس کے اطراف دو کرسیاں ہیں ایک پر میری امی بیٹھی ہیں ایک پر چھوٹے بھائی جان بیٹھے ہیں۔ دونوں بہت ہی خوش ہیں آپس میں باتیں کررہے ہیں کہ دیکھو اس نے ہم میں سے کسی کو مدد کے لئے نہیں کہا ہم بھی تو یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم ہی اسے سہارا دے دیتے اور چھوڑ آتے۔ یہ شامہ کو جانتا ہے میں اس پل پر بھائی جان کو سہارا دے کر چلانا شروع کرتی ہوں اور امی اور چھوٹے بھائی سے کہتی ہوں کہ میں ابھی بھائی کو پل کے پار چھوڑ کر آتی ہوں۔ میں انہیں لے کر آہستہ آہستہ چلتی ہوں جہاں بھی ان کے قدم کمزور پڑنے لگتے ہیں اپنا سہارا انہیں دیتی ہوں۔ پل کے پار بالکل سامنے ایک عظیم الشان باغ ہے جس کا نہایت ہی عظیم الشان دروازہ ہے۔ میں بھائی کو اس دروازے پر چھوڑ دیتی ہوں اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوجاتی ہوں۔ وہ باغ کے اندر داخل ہوجاتے ہیں۔

میری آنکھ کھلی صبح صادق کا وقت تھا۔ خوف سے میری جان نکل رہی تھی۔ بھائی جان کا جلال نگاہ میں تھا۔ میں نے اس وقت حبیب کو جگا کر خواب سنایا کہ تیسری بار ایک ہی خواب دیکھا ہے۔ اب میں کسی قیمت پر بچے کی تصویر اتروانے نہیں جاؤں گی ورنہ میرا بچہ مر جائے گا۔ تم فوراً" پیسے اسی وقت کراچی میرے گھر میں بھجوا دو اور تاکید کردو کہ فوراً" بھائی جان کے نام سے کسی مستحق کو دے دیں۔ ساتھ میں میں نے خط بھی لکھ دیا اور خواب کا بھی تذکرہ کردیا۔ ان دنوں ڈاک کا سسٹم پاکستان کا بہت اچھا تھا۔ چوتھے دن ہی خط مل جاتے تھے۔ چوتھے دن میں نے خواب دیکھا کہ میں گھر میں ہوں کہ میری چھوٹی بہن آتی ہے اس کے ہاتھ میں ایک خط ہے خوشی سے زور زور سے کہتی ہوئی اندر آتی ہے کہ بھائی جان کا خط آیا۔ بھائی جان کا خط آیا ہے۔ یہ سنتے ہی میں برابر کے کمرے سے نکل کر تیزی سے آتی ہوں اور اس کے ہاتھ سے خط اڑا لیتی ہوں یہ کہتی ہوئی کہ اس خط کا تو مجھے کب سے انتظار تھا۔ میں جلدی سے خط کھول کر پڑھتی ہوں اس میں لکھا ہے آج میں ایک دوسری جگہ منتقل ہوگیا ہوں یہ جگہ بہت خوبصورت ہے یہاں پھل دار درخت ہیں سبزہ ہے، یہاں میری خدمت کے لئے دو عورتیں ہیں جو میری بیوی نہیں ہیں۔ یہ میرے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔

خواب دیکھ کر مجھے بڑا ہی سکون ملا۔ چند دن بعد میری بہن کا خط آیا۔

اس نے لکھا کہ خط ملتے ہی ان کے نام کی نیت کر کے اسی وقت فلاں فلاں کو پیسے دے دیئے تھے۔ انہوں نے لکھا کہ ہفتے کو دیئے تھے۔ ہفتے کے دن ہی رات کو میں نے خواب دیکھا تھا۔ اس واقعے سے میں ایسا ڈری کہ تین چار ماہ تک میں نے بچے کی تصویر نہیں بنوائی اور بعد میں بھی بھائی کے نام کا صدقہ خیرات کیا۔ پاکستان میں بھی سب کو کہا۔ اس کے بعد چند ایک اچھے اچھے خواب دکھائی دیئے۔ ہر روز اچھے اچھے خواب نظر آجاتے۔ پھر ایک دن میں قرآن پڑھ رہی تھی کہ اچانک مجھ پر سخت الہامی کیفیت طاری ہوگئی۔ دماغ میں ایک آواز آئی۔ اے شمامہ بنت فلاں (میرے ابا کا نام لے کر) ہم نے تمہیں اپنے علم کے لئے چن لیا ہے۔ تمہیں یہ علوم اپنے گھر میں لکھنا ہوگا۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ میری باتوں کی شہادت بھی ہونی چاہئے کہ جو کچھ میں لکھ رہی ہوں یہ میرے ذہن کی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ علوم مجھے روحانی طور پر عطا کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت میں نے درخواست کی مجھے کچھ ایسی چیزیں عطا کی جائیں کہ سب کو میری سچائی پر یقین آجائے۔

ندا آئی۔ تمہارے سامنے تمہارے بچپن کے واقعات اور تمہاری پیدائش سے پہلے کے واقعات پر سے پردہ ہٹایا جاتا ہے۔ ایک فلم چند لمحوں میں میرے دماغ کے پردے پر چل گئی۔ میری پیدائش کا وقت، میری پیدائش سے بہت پہلے جب میرے ماں باپ کی شادی کو صرف چند سال ہوئے تھے وہ کسی برہمن کے یہاں ان کے بیٹے کی شادی پر گئے تھے وہ بہت امیر تھا اس نے

تمام مہمانوں کو رخصت کرتے وقت اسٹیل کے مراد آبادی منقش پیالوں میں حلوا بھر کر تقسیم کیا تھا۔ یہ واقعہ صرف میرے ابا کو یاد تھا انہوں نے اس کی تصدیق کی حتی کہ میری ماں کے رشتے کی بات بھی میں نے دیکھی۔ جس کا کسی کو علم نہ تھا۔ بعد میں اس کی تصدیق ہوئی کہ میرے ابا سے پہلے کسی اور بھلے آدمی کا رشتہ آیا تھا۔ بزرگوں نے میری ماں کا یہ رشتہ طے کردیا۔ منگنی والے دن ان لوگوں نے سونے کے پانی کا چڑھا ہوا زیور یہ کہہ کر چڑھایا کہ یہ سونے کا ہے جس سے امی کے بزرگ خائف ہوگئے کہ ابھی سے یہ دھوکہ بازی ہے تو بعد میں نہ جانے کیا ہو۔ وہ رشتہ فوراً توڑ دیا منگنی نہیں ہوئی۔ وہیں بھید کسی طرح کھل گیا تھا۔ امی ابا کی شادی کے بعد کے خاص خاص واقعات جو میری پیدائش سے پہلے کے تھے بڑی بہن اور بھائی کے بچپن کے دوست ان کے نام ان کے کالج اور اسکول کے اساتذہ کے نام وغیرہ ان کے حلئے سب کچھ مجھے دکھا دیا گیا۔ میں نے جلدی جلدی بڑی بہن کو خط لکھے اور یہ تمام واقعات لکھے کہ ان کی تصدیق کریں ان سب کو لکھتے وقت وہ سین میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں نے ایک ایک تفصیل لکھ دی۔ ابھی دو تین خط ہی بھجوائے تھے کہ فوراً ہی بڑی بہن کا خط آگیا بس اب پرانی باتیں لکھنی بند کردو۔ تمہاری ایک ایک بات درست ہے۔ بہت سی باتیں مجھے معلوم ہیں باقیوں کی تصدیق امی ابا نے کردی ہے۔ وہ بھی بھولے ہوئے تھے تمہارے خط سے انہیں بھی یاد آگیا ہے۔ بہن کا یہ خط پڑھ کر میں اپنے مالک کی مہربانیوں پر بہت

روئی۔ ناتواں نفس اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں اپنی ساری باتیں حبیب کو بتاتی اور بڑی بہن کو بھی خط لکھ دیتی۔ سوائے اپنے گھر کے لوگوں کے کسی کو بھی یہ بات بتانے کی اجازت نہیں تھی۔ نماز اور قرآن پڑھنے میں میرا بڑا ہی دل لگتا۔ اس کے ساتھ ساتھ حبیب کا ہر کام میں بڑی محبت سے کرتی۔ بچوں کو بھی بہت محبت سے رکھتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرے اندر سے محبت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ صبح صبح روزانہ ناشتہ انہیں بیڈ پر دیتی۔ حبیب کو پراٹھے کھانے کی عادت تھی۔ بچے تو ڈبل روٹی کھاتے تھے میں گرم گرم پراٹھا پکا کر اوپر بیڈ روم میں دوڑتی ہوئی جاتی کہ کہیں پراٹھا ٹھنڈا نہ ہوجائے۔ حبیب کو کبھی اپنے کسی کام کے لئے کہنا بھی نہیں پڑتا۔ ان کی ہر چیز تیار رہتی۔ کام پر جانے سے پہلے کپڑے استری کئے ہوئے تیار سامنے رکھے ہوئے' جوتے پالش کئے ہوئے سامنے رکھے ہوتے۔ گھر کا کام کرتے کرتے گانا میرا معمول تھا۔ ہنستے کھیلتے اس طرح کام ہوجاتا کہ پتہ بھی نہ چلتا۔ میں گھر کا کام فل اسپیڈ پر کرتی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت قرآن پڑھنے اور عبادت کے لئے مجھے مل جائے۔ اب اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی بتایا جاتا وہ لکھنا بھی ہوتا تھا۔ میرا سارا دھیان اللہ پر اور روحانی علوم حاصل کرنے پر ہوتا یا پھر گھر کے کاموں پر ہوتا۔ حبیب کا عشق اپنی جگہ اسی طرح تھا بلکہ اب تو اور بھی زیادہ تھا کیونکہ اب وہ میرے بچوں کا باپ بھی تھا۔

گھر کے ہر کام میں تصور یہی ہوتا کہ حبیب اسے دیکھے گا اس خیال سے میں ہر کام میں اس کی خوشی کا خیال رکھتی۔ انکے کپڑے دھوتے ہوئے اس کا ہر کام کرتے ہوئے مجھے ایسی خوشی ہوتی کہ بیان سے باہر ہے۔ اصل میں بچپن ہی سے ہماری ماں نے ہمیں باپ اور بڑے بھائیوں کی خدمت کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ بھائیوں کے کپڑے دھونا' استری کرنا' ان کے سروں میں تیل ڈالنا' ان کے جوتوں پر پالش کرنا' ہم بہنیں ایسی ہنسی خوشی یہ کام کرتیں بلکہ ایک دوسرے سے زبردستی کرتیں کہ نہیں ہم کریں گے یہ۔ تو وہی عادت اب کام آرہی تھی۔ اللہ نے مجھے تین بیٹے جلدی جلدی دیئے تھے۔ زندگی سخت مصروف ہوگئی۔ تینوں میں ایک ایک سال کا فرق تھا۔ میرا معمول تھا کہ میں روزانہ ان کی مالش کرتی اور نہلاتی۔ بیٹی اسکول جانے لگی تھی۔ اسے اسکول لے جاتی اور لاتی۔ مجھے کبھی وقت کی کمی کی شکایت نہیں رہی۔ ہر کام کے لئے وقت مل جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ میری روحانی کیفیات بھی جاری تھیں۔ ہر تھوڑے دنوں بعد مجھ پر الہامی دور آتے۔ چند دنوں تک مستقل لاشعور غالب رہتا۔ ایسے دنوں میں مجھ پر سنجیدگی طاری ہوجاتی جیسے کوئی ہر وقت دماغ میں بیٹھا حکم دے رہا ہے۔

خوف

جب میں قرآن پڑھتی تو گہرائی میں اس کے معنی سمجھ میں آتے۔ میں اپنی روح کو چلتا پھرتا دیکھتی اور اس سے باتیں کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ سال میں کم از کم ایک بار ضرور ریحانہ کے لئے دل میں محبت کی تڑپ اٹھتی۔ میں جانتی تھی کہ میری روح اسے کتنا یاد کرتی ہے۔ یہ کیفیات ایسی ہوتیں کہ ان پر میرا کچھ بس نہ چلتا۔ میں کاموں میں مصروف رہتی مگر دل مسلسل اسے یاد کرتا رہتا حالانکہ شعوری طور پر میں پورے کنٹرول میں رہتی بس دل اس کے لئے دعائیں مانگتا رہتا کہ وہ جیسی بھی ہے جہاں بھی ہے خوش رہے۔ مجھے ایسا لگتا کہ ریحانہ ایک پردے کے پیچھے ہے اور روح کا بس نہیں چلتا کہ یہ پردہ پھاڑ دے۔ کئی کئی گھنٹے یہ حالت رہتی۔ جب یہ کیفیات گزر جاتیں تو میں ایسی نارمل ہوجاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اٹکی ہوئی سوئی پھر سے چل پڑی ہو۔ بعد میں، میں اس پر غور بھی کرتی کہ آخر کیوں ایسی حالت ہوجاتی ہے۔ پھر مجھے یوں لگتا کہ اللہ چاہتا ہے کہ میں اس کے لئے دعا کروں۔ جب بھی ایسی حالت ہوتی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ریحانہ پر کوئی

پریشانی آئی ہوئی ہے۔ میں اس کے لئے دعا کرتی اس کی دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے دعا کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ریحانہ کے بعد مجھے کبھی سہیلی کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ میں اللہ سے اسی ایک سہیلی کا ساتھ آخرت میں بھی مانگا کرتی۔ اسی طرح حبیب کے ساتھ ابدی زندگی کی دعا کرتی۔ میں نے کبھی حبیب کو نہیں بتایا کہ ریحانہ کے لئے اب بھی میری روح تڑپتی ہے۔ مجھے اپنی کیفیات کا علم تھا کہ یہ میری شعوری کیفیات نہیں ہیں مگر میں جانتی تھی کہ میں حبیب کو یہ سب نہیں بتا سکتی۔ ویسے میں عام طور سے جو دوسری روحانی باتیں تھیں وہ سب بتادیتی کیونکہ انہیں تو مجھے لکھنے کا حکم ہوتا تھا۔ میں عموماً" فجر کی نماز کے فوراً" بعد خط میں واردات لکھنے بیٹھ جاتی کہ بچے سو رہے ہیں تو جلدی جلدی لکھ ڈالوں۔

ایک مختصر سا دور ایسا بھی آیا کہ میرے دل میں اس اندیشے کے تحت شدید خوف رہنے لگا کہ میری کسی غلطی یا کوتاہی پر اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہوجائیں۔

مجھے یوں لگا میں بالکل ہی نادان اور کم عقل ہوں۔ مجھے کچھ نہیں پتہ کچھ نہیں آتا۔ میں اللہ میاں کو کیسے خوش رکھوں۔ مجھے اپنا ذہن بالکل کورا لگنے لگا۔ میں سوچنے لگی مجھے تو گھر گرہستی کی بھی کوئی بات نہیں آتی۔ گھر سے باہر میرا کسی سے میل جول نہیں ہے۔ میں کیسے بچے پالوں۔ کس طرح ان کی پرورش کروں۔ کیسے شوہر کو خوش رکھوں مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ میں سب

کام اللہ کی خوشی کے لئے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں پتہ کہ میں کس طرح
کروں۔ اس دوران اگر مجھ سے غلطی ہوگئی تو اللہ مجھ سے ناراض ہوجائے
گا۔ وہ روٹھ گیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی۔

ایک رات یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گی۔ خواب میں بھی میں
نے اپنے آپ کو اسی سوچ میں غرق پایا۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی مشکل میں
ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تو اللہ مجھ سے ناراض نہ ہوجائے پھر میں
نے دیکھا کہ میں جائے نماز پر بیٹھی دعا کررہی ہوں کہ پیارے اللہ میاں میرے
اوپر فرشتوں کے پہرے بٹھا دیجئے تاکہ وہ ہر کام مجھ سے لیتے رہیں۔ میری ہر
حرکت کے لئے وہ مجھے حکم دیتے رہیں اور میں ان کے حکم کے مطابق کرتی
جاؤں تاکہ مجھ سے غلطیاں سرزد نہ ہوں اور تو مجھ سے راضی رہے۔ پھر میں
نے دیکھا کہ جیسے تھوڑی ہی دیر بعد مجھ پر فرشتے مقرر کردیئے گئے ہوں۔ وہ دو
فرشتے تھے میں دیکھتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اب آپ کو ہمارے
حکم کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ میرا دل خوش ہوگیا اور میں نے اللہ کا شکریہ ادا
کیا۔ اب وہ ہر کام کے لئے مجھے کہتے یوں کرو۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک
روبوٹ ہوں۔ میرا خواب طویل ہوتا گیا میں نے دیکھا کہ مجھے اپنے بچوں کا
کام کرتے ہوئے جو مزا آتا تھا حبیب کے لئے جو جذبات تھے وہ سب کچھ ختم
ہوگئے۔ اس وجہ سے کہ وہ کہتے اب بچے کا دودھ بناؤ۔ اب بچے کو گود میں
اٹھاؤ اب اسے کھانا کھلاؤ۔ اب حبیب کے پاس جاؤ۔ میں بچوں کو پیار کروں تو

فرشتوں کے حکم سے حبیب کی خدمت کروں تو فرشتوں کے حکم سے۔ پھر میں
انسان تو نہیں رہی میں تو ایک چلتی پھرتی مشین بن گئی کہ جس کے کل پرزے
دوسرے کے بٹن دبانے پر حرکت کرتے تھے۔ میرے تو ہونٹوں کی مسکراہٹ
بھی چھن گئی۔ وہ چہک لہک کر گانا بھی بند ہوگیا۔ میں سخت سنجیدہ ہوگئی۔
حبیب الگ پریشان کہ اس کو کیا ہوگیا۔ مجھے خود اپنی سنجیدگی ایک آنکھ نہ
بھائی۔

خواب میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے اللہ میاں سے یہ
پہرے بٹھانے والی بات صحیح نہیں کی۔ میں نے نماز پڑھی اور خوب عاجزی
کے ساتھ دعا کی کہ اللہ میاں یہ تو بڑی مشکل ہے ہر دم فرشتے مجھے دیکھتے رہتے
ہیں اور اس قدر تحکمانہ لہجے میں مجھے حکم دیتے رہتے ہیں۔ میں تو ذرا بھی
آزادی محسوس نہیں کرتی۔ نہ مجھ سے ہنسا جاتا ہے نہ کوئی Feeling محسوس
ہوتی ہے۔ میں ماں ہوں میں اپنے بچوں سے خود پیار کرنا چاہتی ہوں۔ حبیب
میری جان ہے میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ ساری زندگی
ایسے کیسے بسر ہوگی۔ میں اپنی آزادی چاہتی ہوں۔ آپ مہربانی فرما کے یہ فرشتے
ہٹا لیجئے اور مجھے توفیق دیجئے کہ میں سب کام ٹھیک ٹھاک کرسکوں۔ ابھی میں
نے دعا کے ہاتھ نیچے بھی نہیں کئے تھے کہ وہ دونوں فرشتے میرے پاس سے
اڑے اور کہنے لگے اچھا اب ہم جاتے ہیں آپ پر سلامتی ہو۔ اللہ حافظ۔
میں نے بھی انہیں خدا حافظ کہا اور کھڑکی کے شیشے سے انہیں آسمان پر حد نگاہ

تک جاتا دیکھتی رہی۔ میں نے شکر کے سجدے کئے۔ میرا خواب یہاں پر ختم نہیں ہوا بلکہ جاری رہا۔ میں نے دیکھا کہ حبیب اوپر کے کمرے میں ہیں میں دوڑی دوڑی اوپر گئی اور حبیب کو خوشخبری سنائی۔ حبیب فرشتے چلے گئے۔ میں خوب زور سے ہنسی۔ بچوں کو خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جانے کب سے میں نے اپنے بچوں کو پیار نہیں کیا ہے۔ حبیب خوب ہنسے۔ خواب ختم ہوگیا میری آنکھ کھل گئی مگر اس خواب سے مجھے اس بات پر اور زیادہ یقین ہوگیا کہ اللہ پاک کا ہر کام ایک خاص مصلحت کی بناء پر ہے۔ یہ خاص مصلحت اس شئے کے اندر کام کرنے والی فطرت کا تقاضہ ہے۔ فطرت بدلی نہیں جا سکتی۔ اس لئے کہ یہ اسمائے الٰہیہ کی صفات ہیں۔ ہر فرد کے اندر رونما ہونے والی ہر حرکت کو نظام قدرت نے اس کی فطرت کے مطابق رکھا ہے۔ جب اس میں تبدیلی لائی جاتی ہے تو نظام چل نہیں سکتا۔

میں نے حبیب سے کہا کہ اللہ کتنا مہربان ہے اس نے ہمارے اعمال کو ریکارڈ کرنے کے لئے فرشتے رکھے ہیں مگر وہ خفیہ کام کر رہے ہیں۔ اگر اعلانیہ کرتے تو ہر شخص خوفزدہ رہتا اور یہ خوف اسے بزدل بنا دیتا۔ وہ فرشتوں کو اپنے سے افضل سمجھ لیتا اور خود کو ان کا غلام سمجھتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر کی صلاحیتیں ابھرتی نہیں بلکہ اور زیادہ دب جاتیں اور آدمی مٹی کے بت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ اپنے اعمال پر نظر رہتی تو اگر وہ انہیں خراب دیکھتا تو اللہ سے ناامید ہو جاتا جب کہ ناامیدی کفر ہے اور اگر درست دیکھتا تو اپنے

ہی اعمال پر نظر ہوتی۔ اللہ کی رحمت اور قدرت پر نہیں۔ بلاشبہ اللہ کا ہر کام بے نقص ہے۔

اس کے بعد میرا ذہن اور زیادہ روحانی علوم سیکھنے کی جانب لگ گیا۔ میں اور زیادہ قرآن کا مطالعہ کرنے لگی اور اس کی آیات میں چلتے پھرتے ہر وقت غور کرنے لگی۔ خصوصاً" حروف مقطعات کے اسرار جاننے کا بڑا ہی شوق تھا۔ غیب میں سفر کا بڑا شوق تھا۔ دل کا تقاضہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ میں اللہ سے کہتی کہ اللہ میاں سوائے آپ کے اور قرآن کے اور کوئی میرا رہبر نہیں ہے۔ آپ ہی مجھے سکھا سکتے ہیں۔ مجھے وہ علوم سکھا دیں جو آپ نے اپنے خاص بندوں کو عطا کئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میری زندگی چار بچوں کے ساتھ بڑی ہی مصروف تھی۔ پھر حبیب کا سارا کام میں خود کرتی تھی اور اس طرح کرتی تھی کہ کبھی انہیں کسی کام کے لئے کہنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ پھر بچوں کو اسکول لانا لے جانا' گھر کا سودا لانا سب کام میرے ذمہ تھا۔ مجھے کبھی محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں اتنی مصروف ہوں کیونکہ ہر دم میرا ذہن اللہ سے لگا رہتا۔ ذہن قرآن کی کوئی نہ کوئی آیت دہراتا رہتا اور میں اس پر غور کرتی رہتی۔ باقی گھر کے سارے کام بڑے آرام سے ہو جاتے۔ نماز میں بڑا جی لگتا۔ پانچوں وقت کے علاوہ جب بھی تھوڑا سا بھی ٹائم ملتا میں نفل پڑھ لیا کرتی تھی۔ بس یہی میری زندگی تھی اور میں اس میں اس قدر خوش تھی کہ جیسے جنت میں ہوں۔

اکثر سسر کے خط آتے، جس میں حبیب کو زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی ترغیب ہوتی کہ پیسے سے ہی آدمی کی عزت ہے۔ پیسے کے بغیر دنیا میں کوئی نہیں پوچھتا۔ ساری محبت اور عزت پیسے سے ہے۔ بس تم صرف پیسہ کمانے کی طرف دھیان دو۔ یہ طرز فکر اس طرز فکر سے بالکل ہی الٹ تھی جس میں میں پیدا ہوئی اور جوان ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ نے تو ہمیشہ یہی کہا تھا کہ بیٹا تقدیر کا رزق تو مل کر ہی رہتا ہے۔ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے اور دنیاوی دولت تو دنیا تک ہی ہے۔ آدمی اپنے ہی سوچنے کے انداز کو دنیا سے منسوب کر دیتا ہے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہے۔ ہمارا تجربہ یہی کہتا ہے کہ دنیا آدمی کو اس کے اعمال اور اس کی سیرت کے حوالے سے ہی یاد رکھتی ہے۔ ابا کہا کرتے بیٹا ذرا سوچو تو آج بھی دنیا فرعون کا نام لیتی ہے مگر کیا تم نے کبھی کسی ایک آدمی کے منہ سے بھی فرعون کے لئے حضرت، مولانا یا ایسا ہی کوئی عزت کا لفظ اس کے نام کے ساتھ سنا ہے۔ ہر شخص سینکڑوں ہزاروں سال سے اسے برا ہی کہہ رہا ہے۔ بیٹا دنیا ہمیشہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا ہی کہتی ہے۔ اگر کوئی برے کو اچھا کہتا ہے اس کی زندگی میں تو ضرور اس میں کوئی دنیاوی مصلحت ہوتی ہے کہ اس کے شر سے بچنے کے لئے دنیا اس کے راستے سے کترا کے چلنا چاہتی ہے۔ اپنے اندر اللہ کی لگن پیدا کرنی چاہئے۔ دنیا کی نہیں۔ اللہ خود ہی جو کچھ تقدیر میں ہوتا ہے دے دیتا ہے۔

میں سوچتی کتنے ناعاقبت اندیش ہیں وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کو زیادہ

سے زیادہ دنیا میں مشغول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی ضرورت سے زیادہ عیش و آرام انہیں دنیا سے تو قریب کردے گا مگر اپنے رب سے دور لے جائے گا۔ میں ہمیشہ حبیب کو سمجھاتی کہ مجھے پیسے کی کوئی خواہش نہیں ہے بس گھر میں محبت اور سکون ہی میرے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔ میں نے کبھی حبیب سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ حتی کہ کبھی بچوں کی ضروریات کے لئے بھی خود سے نہیں کہا۔ بس جو کچھ ہوا اسی میں خوشی خوشی گزارہ کرلیتی۔ میرا ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں تھا بلکہ میں تو ہر وقت یہی دعا کرتی رہتی تھی کہ یااللہ زیادہ پیسہ مت دینا۔ بس اتنا دینا کہ کسی کی محتاجی نہ رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر بہت زیادہ پیسہ آگیا تو کئی معاشرتی خرابیاں میرے گھر بھی آجائیں گی۔ میرے بچے تباہ ہوجائیں گے۔ اللہ کا کرم ہے کہ رب نے میری کوئی بات نہیں ٹالی۔

مجھے ہر روز خواب میں مختلف مقامات کی سیریں کرائی جاتیں۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر خواب میں میں اپنے آپ کو بالکل معصوم دیکھتی۔ اکثر ندائے غیبی بھی مجھے خواب میں یہ کہتی کہ تم معصوم ہو۔ میں ہر خواب آنکھ کھلتے ہی حبیب کو سنا دیتی تھی۔ مجھے اس بات کی حیرانی ہوتی کہ میرے چار بچے ہوچکے ہیں۔ اب میری عمر بھی تقریباً" چھبیس سال کی تھی۔ میں معصوم کیسے ہوئی۔ معصوم تو بچے ہوتے ہیں۔ میں حبیب سے بھی یہی پوچھتی کہ روز روز مجھ سے یہ کہا جاتا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

پھر میں سوچتی کہ شاید مجھے یہ بتایا جا رہا ہے کہ ابھی تمہارا ذہن غیب کے علوم سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ معنی پہنا کے اور بھی زیادہ میری لگن بڑھ گئی۔ میں تو ہر وقت یہی دعا کرنے لگی کہ میں اتنی بڑی تو ہو گئی ہوں۔ میرے چار بچے ہو گئے ہیں۔ میں گھر کا ہر کام ٹھیک ٹھاک کرتی ہوں۔ بال بچوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں اب بچی کہاں ہوں۔ مجھے قرآن کے اسرار و رموز جاننے کا بڑا ہی شوق ہے۔ میں ضرور جلدی سے سیکھ جاؤں گی انشاء اللہ۔ آپ سکھا تو دیں۔ پھر میں سب کو بتاؤں گی آخر یہ علوم انسان کو سیکھنے ہی چاہئیں۔ آپ نے انہیں بھیجنے کا اتنا اہتمام کیا ہے تو لوگوں پر بھی تو یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انہیں سیکھیں۔ سچ سچ بتاؤں مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں مجھے معصوم سمجھ کے اور احساس دلا کے مجھے ان علوم سے نہ محروم رکھا جائے۔ میری تو زندگی کا مقصد ہی یہ علوم سیکھنا تھا۔ میں ہر دم اپنے ذہن میں غیب کے متعلق سوچتی رہتی اور سب سے زیادہ جنون کی حد تک جو مجھ کو شوق تھا وہ اللہ کی قربت کا تھا۔ یہ خواب کا سلسلہ تھا جو مہینوں چلتا رہا۔

کچھ عرصے بعد پہلے مجھے محسوس ہوا پھر یقین ہو گیا کہ مجھے روحانی علوم کے لئے چن لیا گیا ہے۔ میں اللہ سے دعا مانگتی کہ میرے گھر کا سکون اسی طرح برقرار رکھنا اور مجھے نیک کام کی توفیق دینا۔ ادھر میں ہر روز کے خواب اور کیفیات حبیب کو سناتی رہتی۔ مجھے روح کی زندگی پر بہت رشک آتا وہ پرندے کی طرح جہاں چاہتی اڑ کر چلی جاتی۔ جس سے چاہتی اس سے مل لیتی اور میں

اس مٹی کی دیواروں میں کیسی بے بس ہوں۔ ہزار چاہوں تب بھی انہیں توڑ نہیں سکتی۔ میرا احساس عجیب دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس کا ایک پاؤں خوشیوں سے لہلہاتی پھلواری میں تھا اور ایک پاؤں حسرتوں کے دلدل میں تھا۔ دونوں احساس اپنی انتہا پر تھے۔ روح کی خوشیاں اس کے قہقہے۔ اس کے عیش و طرب سامنے تھے اور روح کے سراپا میں سما جانے کی حسرتیں بھی دل میں پوری شد و مد کے ساتھ تھیں۔ میں چپ چاپ گھر کے کام کاج کرتی رہی۔ اپنے آپ کو تسلی دے کر بہلاتی رہی۔ کبھی تو یہ زندگی گزرے گی ہی۔ تین دن تک مسلسل یہی حالت رہی۔ حبیب کو میں نے بتایا کہ آج کل یہ ہو رہا ہے۔ وہ بچارے اندر اندر کافی فکرمند ہوئے کہ شاید تنہا بچوں کے ساتھ پردیس میں رہتے ہوئے اس کا دماغ کچھ چل گیا ہے۔ بات بھی درست تھی۔ ایسی بڑی بڑی اور عجیب و غریب باتیں ان دنوں کس نے سنی تھیں۔ مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہ کہا مگر میری بڑی بہن کو فکرمندانہ خط لکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میں رات کو کام پر ہوتا ہوں۔ شامہ کی حالت عجیب ہے سب کام تو ٹھیک ہے مگر باتیں عجیب عجیب کرتی ہے۔ اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً پانچ سال ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے واپس بھیج دوں۔ کچھ عرصے بعد میں بھی آجاؤں گا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ حبیب ایسا سوچیں گے اور پھر خط بھی لکھ دیں گے۔ تین دن کی ان کیفیات کے بعد میں نارمل ہو گئی۔ اصل میں بہت جلدی جلدی ایسے الہامی پیریڈ مجھ پر آنے لگے تھے جو کئی کئی دن تک

رہتے۔ ان کی کیفیات میں حبیب کو بتا دیتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ گھبرا
گئے۔ مجھے کیا پتہ تھا میں یہ سمجھتی تھی کہ وہ مجھ پر یقین رکھتے ہیں مگر دراصل
ایسی باتیں کبھی سنی نہ ہوں تو آدمی پریشان ہو ہی جاتا ہے۔ خط آیا کہ شامہ کو
بھجوا دو۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ حبیب نے اس طرح خط لکھ دیا ہے۔ میری
بہن تو میری روحانی حالت جانتی تھی مگر بہنوئی کے لئے یہ باتیں نئی تھیں۔ جس
کی وجہ سے میں ذرا پریشان ہوئی۔ میں نے سوچا چار بچوں کے ساتھ میں اکیلے
کیسے جاؤں گی۔ پھر وہاں کہاں رہوں گی۔ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی
کہ مجھے الہامی کیفیات میں حکم دیا گیا کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ میں تقدیر کے
اس فیصلے پر دم بخود رہ گئی۔

آخرت

مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ کہیں ایسے حالات نہ ہو جائیں کہ مجھے حبیب
سے الگ ہونا پڑے۔ حبیب میرا شوہر ہے میرے بچوں کا باپ ہے۔ اس کی
محبت قدرتی بات ہے۔ میرے ذہن میں محبوبیت کی فکر کے ہمیشہ دو رخ رہے۔
ایک رخ میں کبھی کوئی تغیر نہ آیا۔ یہ رخ اللہ کی جانب تھا اللہ کو دیکھنے اللہ کو
پانے اور اس کے تخلیقی رموز کو جاننے کی خواہش میں بچپن سے لے کر آج
تک کبھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ دوسرا رخ دنیا کی جانب تھا۔ اس رخ میں
محبوبیت کی فکر شعوری تقاضوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی تھی۔ پروان کے ہر
دور میں تصور فکر کی روشنیوں کو کسی نہ کسی خاکے میں ڈھال کر نگاہ کے
سامنے لے آتا۔ تصور کا خاکہ ماں تھی۔ پھر بہن اور بھائی بنے پھر اسکول کی
ایک ٹیچر بنی پھر ایک سہیلی بنی اور پھر تصور کا یہ خاکہ دل کے تمام تقاضوں کے
ساتھ رنگین ہو کر حبیب کی صورت میں سامنے آگیا۔ دل نے سارے رنگ
اس تصویر میں بھر دیئے۔ اب کوئی رنگ باقی نہ تھا۔ نگاہ کے سامنے ایک
تصویر ٹھہر گئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ دنیا ایک پردہ ہے اس پردے پر تصویریں

آتی جاتی رہتی ہیں۔ کوئی تصویر ہمیشہ نہیں رہتی۔ ابدی زندگی اللہ ہی کے ساتھ ہے مگر ابدی زندگی کے خاکے دنیاوی خاکوں سے کیسے مل گئے اگر مل نہ گئے ہوتے تو تصویر ٹھہر کیسے جاتی دل ہر وقت اپنے رب کی بارگاہ میں درخواست کرتا۔ تیری کوئی صورت نہیں ہے تیری کوئی حاجت نہیں ہے مگر میں حاجت مند ہوں بغیر ضرورت کے دیکھنے کا تقاضہ پورا نہیں ہوتا۔ نظر جسے چاہتی ہے تو بھی اس پر محبت کی نظر ڈال تاکہ یہ سنگم ابدی ہو جائیں۔

مجھے معلوم تھا کہ ابدی زندگی دو ذہنوں کا میل ہے۔ میں اپنی روح کے تقاضوں سے خوب اچھی طرح واقف تھی۔ روح کے غیب میں داخل ہونے کی تڑپ کو نہ میں بدل سکتی تھی نہ ہی بدلنا چاہتی تھی۔ البتہ میری شدید خواہش تھی کہ حبیب بھی اپنی روح کے اس تقاضے کو پہچان لیں اور ہم دونوں اس دنیا کی طرح ابدی زندگی کے بھی ہمراہی بن جائیں۔ میں جانتی تھی حبیب کے لئے اس فکر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کے سامنے اس دنیا کے تقاضے ہیں۔ حج کے لئے بھی ان کا نظریہ یہ تھا کہ بار بار حج کرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ حج کے ان پیسوں سے کسی غریب کی شادی کرادو۔ کیا اس کا زیادہ ثواب نہیں ہوگا؟ لیکن میرے نزدیک اللہ کا حکم بندے کی سوچ پر فضیلت رکھتا ہے۔ میں کہتی جو بات اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کی ہے اس میں ضرور بندوں کے لئے ایسی منافعت ہے جس کا بدل نہیں ہوسکتا۔ وہ کہتے نماز روزہ اور دیگر فرائض کی بجا آوری کافی ہے۔ آخرت کے متعلق اور کیا سوچنا

ہے۔ اللہ نے جو مقرر کیا ہے وہی ہونا ہے۔ میں کہتی ہونا تو وہی ہے جو وہ چاہتا ہے مگر وہ کیا چاہتا ہے ہمیں بھی تو اس کی پسند کا پتہ لگنا چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب آسکیں۔

بہرحال ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے بندہ بے بس ہے۔ طے یہ پایا کہ میں بچوں کو لے کر چلی جاؤں۔ بہن کے یہاں رہ کر ان کے برابر والی زمین پر جو ہماری تھی دو کمرے بنوالوں۔ بعد میں حبیب بھی آجائیں گے۔ مجھے پتہ تھا حبیب کے بغیر میں ایک لمحہ بھی خوش نہ رہ سکوں گی مگر قدرت کے فیصلے کے آگے سر جھکانے پر مجبور تھی۔ اب روزانہ حبیب پریشان کن خواب دیکھنے لگے۔ ہم دونوں اپنی جگہ پریشان تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ بہرحال میں بچوں کے ساتھ پاکستان آگئی اور بہن کے یہاں رہ کر اپنی زمین پر دو کمرے بنوانے میں لگ گئی۔ بہن کے یہاں ہی تھی۔ ابھی آئے ہوئے ایک دو ماہ ہی گزرے تھے کہ رمضان آگئے۔ شروع روزوں سے ہی مجھ پر الہامی کیفیات طاری ہوگئیں۔ یہ ایسا دور تھا کہ لاشعور مجھ پر غالب آجاتا تھا اور میری زندگی روحانی اور جسمانی دونوں رخوں میں یکساں طور پر چلتی تھی۔ میری بڑی بہن اور میرے والدین ان چیزوں کو سمجھتے تھے۔ روزوں میں میں روزانہ دیکھتی کہ میری روح کیا کر رہی ہے۔ روح کبھی جنت دیکھتی، کبھی دوزخ دیکھتی۔ روح جب دوزخ دیکھتی تو اللہ تعالیٰ سے دوزخیوں کی بخشش کے لئے دعا کرتی۔ جب لاشعور غالب ہوتا ہے تو آدمی سب کچھ دیکھتا ہے مگر شعور معنی نہیں پہناتا بلکہ

لاشعور معنی پہناتا ہے۔ شعور اس ساری کاروائی کو ایک اطلاع کے طور پر دیکھتا ہے اس کے اندر شعوری حواس شامل نہیں ہوتے بلکہ شعور کو اطلاع بھی لاشعوری حواس میں ملتی ہے۔

آخری عشرہ شروع ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ فلاں فلاں رات کو شب قدر ہے۔ اس دن سارے گھر والوں کو جمع کرلو۔ مجھے یہ تو پتہ تھا کہ کچھ ہونے والا ہے مگر کیا ہونے والا ہے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں نے بڑی بہن کو کہہ دیا۔ انہوں نے دوسری بہنوں کو کہلوادیا۔ امی ابا کو بھی بلوانے کا انتظام کرلیا گیا۔ شام ہی سے مجھے غسل کر کے پاک صاف کپڑے پہن کر تیار رہنے کے لئے کہا گیا۔ دن میں جب امی ابا کو لینے کے لئے بہن نے کسی کو بھجوایا تو تھوڑی دیر بعد سارا سین میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو پہلے تو میں یہ سمجھی کہ امی ہیں مگر پھر صورت جو دیکھی تو امی کے کپڑوں میں چھوٹی بہن تھی۔ اس نے امی کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ امی ابا گھر آگئے تو میری بڑی بہن نے لانے والے سے پوچھا کہ دروازہ کس نے کھولا تھا تو وہ بولا پہلے تو میں سمجھا کہ آپ کی امی ہیں مگر پھر دیکھا تو آپ کی بہن تھیں۔ انہوں نے آپکی امی کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ امی ہمیشہ سفید ململ کی پتلی باڈر والی ساڑھی پہنتی تھیں۔ تو وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا میری سماعت نے اسے بھی ایک اطلاع کے طور پر قبول کیا۔

مجھ پر تو شروع رمضان سے ہی ایسی حالت طاری تھی کہ میں سوائے

ضروری بات کے کچھ نہیں بولتی تھی۔ میں یہ سن کر چپ رہی مگر دل نے کہا یہ سب تو مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ عقل اس تصدیق کی وجہ سے کچھ اور بھی مرعوب ہوگئی اور اس کا یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔ میں جانتی تھی کہ غیب کی چیزیں دکھا کر میرے سامنے کسی نہ کسی ذریعے سے شعوری طور پر اس کی تصدیق اس وجہ سے کرائی جاتی ہے تاکہ میری عقل میں کسی قسم کا شک اور وسوسہ پیدا نہ ہو۔ میرے ساتھ تو بچپن ہی سے ایسے واقعات ہورہے تھے جس کی وجہ سے ہر دفعہ میری عقل ان واقعات کو ایک نئے زاویئے سے دیکھتی اور جب میں الہامی کیفیات سے باہر نکلتی تو ان واقعات کی تشریح ایک نئے انداز سے میرے سامنے آجاتی۔

ہر آدمی اپنے اندر کی کیفیات کو خوب جانتا ہے۔ مجھے کبھی خیال بھی نہ گزرا کہ خدانخواستہ میرا دماغ چل گیا ہے یا ایسی کوئی بات ہے بلکہ وقتاً فوقتاً" الہامی کیفیات میرے یقین اور عقل و شعور کو مضبوط کرنے میں مددگار ثابت ہوتی اور غیب کو جاننے کا اشتیاق پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ غیب میں معنی پہنانے کا فہم بھی بڑھ جاتا۔ بہرحال امی ابا بھی آگئے۔ سب لوگ ایک کمرے میں جمع ہوگئے۔ اس کمرے میں ایک جانب بڑا پلنگ تھا جس پر امی بیٹھی تھیں باقی کمرے میں فرش بچھا دیا گیا۔ اب میرے ذہن میں کمرے کا پورا نقشہ آگیا۔ میں ایک جانب کھڑی تحکمانہ لہجے میں بڑی بہن کو ہدایت دیتی جاتی کہ اس طرح بچھاؤ۔ یہاں جائے نماز بچھاؤ۔ یہاں یوں

کرو یوں کرو۔ میرا لہجہ تحکمانہ تھا اور بڑی بہن جو مجھ سے کم از کم سات آٹھ سال بڑی تھیں اور میں ان کا بے حد ادب کرتی تھی نارمل حالت میں ہرگز بھی ان سے اس لہجے میں گفتگو کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی ان سے کسی کام کا کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کی خدمت کریں نہ کہ بڑے چھوٹوں کی مگر اس وقت میرے ذہن میں اس کا بالکل ہی الٹ تھا۔ مجھے تمام بڑے بہن بھائی سب اپنے سے چھوٹے محسوس ہو رہے تھے یہاں تک کہ اس لمحے میرے ماں باپ بھی مجھے اس طرح لگے جیسے یہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ مجھے ہی انہیں بتانا ہے۔ اس لمحے بڑے چھوٹے کی درجہ بندی میرے اندر علمی اعتبار سے تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں یہ لوگ نہیں دیکھ رہے۔

میری نگاہ وقت کی آنے والی ساعت کے اندر دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمرے کے اندر سب سے پہلے پانچ عدد جاء نمازیں برابر برابر قبلہ رخ بچھوائیں۔ بہن نے پوچھا یہ کس کے لئے ہے۔ میں نے انہیں گھور کے دیکھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ اس وقت سوال کرنا مناسب نہیں ہے۔ پھر اس کے بالکل پیچھے درمیان میں ایک جاء نماز بچھوائی۔ پھر باقی سارے فرش پر سفید چادر تو پہلے ہی بچھی ہوئی تھی سب سے کہا کہ آپ سب لوگ اس چادر پر بیٹھ جائیں۔ اس وقت بڑے بہنوئی دوسرے کمرے میں تھے۔ ان کی والدہ کا کچھ ہی عرصہ ہوا انتقال ہوا تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ آگئیں وہ نہایت ہی

نیک بی بی تھیں۔ میں نے انہیں اعراف میں بڑی اچھی حالت میں دیکھا۔ میرے قدم خود بخود بہنوئی کے کمرے کی جانب اٹھ گئے۔ وہ بیٹھے تھے میں نے بہنوئی کی والدہ کو بس ایک دو بار ہی دیکھا تھا کیونکہ وہ دوسرے شہر میں اپنے دوسرے بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان سے بہت ہی کم میری ملاقات رہی۔ دوسرے لفظوں میں میں انہیں اچھی طرح جانتی ہی نہیں تھی۔ میں نے بہنوئی سے کہا کہ آپ کی والدہ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ پہلے تو میں نے ان کا حلیہ بتایا اور ان کی موجودہ حالت بتائی پھر ان کا پیغام ان ہی کے الفاظ میں دیا جس میں بہنوئی کے بچپن کے کچھ خاص القاب بھی تھے جسے سن کر بہنوئی رونے لگے۔ میں نے کہا آپ اب دوسرے کمرے میں آجائیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹھیک اس ٹائم پر شب قدر کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ وہ کہنے لگے تم چلو میں ابھی وضو کر کے آتا ہوں۔ اس وقت رات کے تقریباً" پونے نو بج رہے تھے میں نے سب سے کہا کہ ٹھیک نو بجے عشاء کی نماز پڑھائی جائے گی۔

نو بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے اس وقت کمرے میں بچے بھی موجود تھے۔ میرے چاروں بچے جن کی عمریں سات سال سے لے کر سوا سال تک کی تھی۔ بہن کے بچے بارہ سال، گیارہ سال اور چھ سال کے تھے۔ میں نے اپنے چاروں بچوں کو اور بہن کی چھ سالہ بچی کو نام کے ساتھ آواز دی۔ آواز دیتے وقت مجھے قطعی یہ احساس نہ تھا کہ یہ میرے بچے ہیں یوں لگتا تھا جیسے بس یہ

بچے ہیں اور بچکانہ فطرت کے مطابق یہ ہمارے پروگرام میں رکاوٹ کا باعث بن سکتے ہیں۔ میں نے نہایت ہی رعب دار آواز میں ایک ایک بچے کا نام لیا اور پکار کر کہا کہ یہاں آؤ وہ آواز سنتے ہی میرے پاس آتے گئے۔ میں انہیں حکم دیتی۔ پلنگ پر لیٹ جاؤ۔ سرہانے کی جانب امی ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں۔ بچوں کو میں ایک ایک کر کے پلنگ پر آڑا آڑا لٹاتی چلی گئی۔ تمام بچوں کی نظریں میری جانب لگی تھیں اور وہ بالکل بے حس آنکھیں کھولے سیدھے لیٹے ہوئے مجھے تک رہے تھے۔ جب سب لیٹ گئے میں نے داہنے ہاتھ کی کلمے والی انگلی سے ایک ایک بچے کی جانب اشارہ کیا اور نہایت رعب دار تحکمانہ لہجے میں ایک ایک بچے کا نام لے کر حکم دیا سوجاؤ۔ جیسے ہی میں انگلی کے اشارے سے نام لے کر کہتی فلاں تم سوجاؤ اس کی آنکھیں بند ہوجاتیں۔ اس سارے عمل کو مشکل سے دو منٹ لگے۔

پانچوں بچوں کی گہری نیند میں گہری گہری سانسوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اب میں پیچھے مڑی تو دیکھا کہ سارا خاندان بھونچکا۔ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے مجھ پر اس قدر لاشعور کا غلبہ تھا کہ میں ان کی اندرونی کیفیات کو خوب اچھی طرح دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی مگر بس یہ علمی حد تک تھا میرے اوپر اس کے شعوری احساس غالب نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے میرے اوپر مسلسل ایک سی کیفیت طاری تھی جیسے میرا جسم ایک روبوٹ ہے یا مشین ہے جو حرکت کررہا ہے۔ خوشی یا غم کا کوئی اور احساس نہ تھا جس کی

وجہ سے چہرے پر مستقل متانت طاری تھی۔ اب میں پہلی رو کی پانچ عدد جاء نمازیں خالی چھوڑ کر اس کے پیچھے بچھی ہوئی ایک جاء نماز پر جا کھڑی ہوئی اور سب کو کہا کہ اپنی اپنی صفیں درست کرلو۔ اب عشاء کی نماز ہونے والی ہے۔ سب لوگ بالکل ہی چپ چاپ تھے۔ اپنے پیچھے میں نے ابا جان کو کھڑا کیا۔ بڑی بہن اور بڑے بہنوئی برابر میں تھے۔ پھر ان کے پیچھے والی صف میں دوسری بہنیں تھیں پھر اس کے بعد والی صف میں بہن کے بڑے بچے تھے اس طرح پورا کمرہ بھر گیا۔ ٹھیک نو بجے عشاء کی نماز شروع کی۔ نماز عشاء ختم کرنے کے بعد سب لوگ اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

سحر کا وقت ہوچکا تھا۔ رات کے تقریباً" تین سوا تین بجے تھے۔ سارے ہی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ میں جو جو دیکھ رہی تھی وہ زبان سے بھی خودبخود نکلتا جا رہا تھا۔ اس پوری رات سے مجھ پر اس حد تک لاشعوری غلبہ تھا کہ اس وقت خودبخود میرے منہ سے نکل رہا تھا کہ میرا نام شامہ ہے۔ میرے شوہر کا نام حبیب ہے میرے چار بچے ہیں۔ میں دنیا میں رہتی ہوں۔ ہر تھوڑی دیر بعد زبان ان الفاظ کو دہرا کر میرے اندر شعوری سکت پیدا کرتی تھی۔ میری بڑی بہن میری حالت کو خوب سمجھ رہی تھیں۔ وہ میری پشت سہلاتیں اور کہتیں ہاں ہاں تمہارا نام شامہ ہے۔ مجھے صاف محسوس ہورہا تھا کہ اس وقت شعور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے پوری پوری جدوجہد کررہا ہے۔ کئی دفعہ یہ جملے دہرانے کے بعد میرے ذہن میں

ایک لمحے کو خیال گزرا کہ مجھے اپنے بال بچوں کے لئے شعوری حالت درست رکھنی ضروری ہے۔ مجھے خیال آیا کہ ہر شب قدر میں فرشتے زمین پر اترتے ہیں۔ یہ تمام فرشتے گروہ جبریل ہیں جو زمین پر اتر کر اس مقدس رات میں بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور اس مقدس رات میں عبادت کرنے والوں کی اللہ پاک کے حضور اور بارگاہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور ان کے لئے رحمت کی درخواست کرتے ہیں۔ میں نے اس رات ان مقرب فرشتوں کے واسطے سے دعا کی کہ میرے ماں باپ پر خصوصی نظر ہو۔

دعا کے بعد بہن نے سحری کا انتظام کیا جو پہلے ہی تیار تھی بس گرم کر کے لگا دیا گیا۔ مجھ سے کہا کہ کھالو۔ میں چپ چاپ ایک جانب بیٹھی تھی مجھ پر پوری طرح جذب طاری تھا میں اپنے آپ کو پوری طرح ظاہری طور پر دیکھ رہی تھی مگر وہ صورت مختلف تھی میرا پورا سراپا قطعی طور پر بدلا ہوا تھا۔ نہ وہ دنیاوی لباس تھا نہ وہ رنگ و روپ میری بہنیں اور میرے دوسرے گھر والے آپس میں چپکے چپکے ایک دوسرے سے کہتے سنائی دیتے۔ شامہ کو دیکھا تم نے یہ تو بالکل ہی تبدیل ہوگئی ہے۔ سب مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ میری بڑی بہن بولیں۔ شامہ تم نے اپنی صورت دیکھی ہے۔ آئینہ لاؤں۔ تم تو بے حد حسین لگ رہی ہو۔ ہمیں تو کسی طرح یقین نہیں آتا۔ وہ بار بار کہتیں۔ آئینہ لاؤں تم اپنی صورت تو دیکھ لو۔ میں صرف مسکرا دی اور

ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کردیا۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ میری نگاہ اندر باہر خوب دیکھ رہی ہے۔

ابھی سحری ختم ہی کی تھی کہ ایک دم بیٹھے بیٹھے میں تیزی سے اٹھ کر باہر صحن میں آگئی۔ سارے میرے پیچھے پیچھے آگئے۔ میں آسمان پر دیکھنے لگی مجھے سارے آسمان پر نور ہی نور پھیلا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی بے ساختہ اللہ اکبر اور سبحان اللہ کہنا شروع کردیا۔ یہ نور آہستہ آہستہ پھیلتا گیا۔ میری نگاہ آسمان کو نہایت ہی وسیع دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نور کے جمال کے رنگ دکھائی دیئے۔ بہن نے پوچھا کیا دیکھ رہی ہو۔ ہمیں بھی بتاؤ۔ میں نے بتایا کہ نورانی نظارے نگاہ کے سامنے ہیں۔ دعا کرو سب لوگ دعائیں کرنے لگے۔ میں تو صرف نظارے میں گم تھی۔ میرے اندر کسی قسم کا تقاضہ نہ تھا۔ نہ کوئی خیال تھا۔ بس نظر دیکھنے میں مشغول تھی۔ اسی وقت میری بڑی بہن بولیں۔ شامہ اللہ سے اسم اعظم مانگو۔ انہوں نے نہایت ہی شوق میں یہ بات کہی میں تو بس دیکھنے میں گم تھی۔ یہ نظارہ بہت دیر تک نگاہ کے سامنے رہا۔ کئی منٹ کے بعد جب نور آنکھوں سے چھپ گیا تو میں اندر آگئی اور پھر اسی کونے میں بیٹھ گئی۔ میری بہن میرے پاس بیٹھ گئیں اور پھر نہایت ہی اصرار کے ساتھ کہا۔

شامہ اللہ پاک سے اسم اعظم مانگ لو۔ انہوں نے دو تین بار اصراراً کہا۔ میں اسی طرح جذب کی حالت میں تھی بالکل چپ چاپ اپنی کیفیات میں

گم سم بیٹھی تھی کہ اچانک ان کے کہنے کے فوراً" بعد ہی مجھے ایک روشنی سی دکھائی دی اس روشنی کا وزن بھی تھا اور اتنا زیادہ تھا کہ میری پشت اس کے بوجھ سے زمین سے جا لگی۔ شدید درد کے مارے میری سانس رکنے لگی۔ کراہتے ہوئے میرے منہ سے نکلا، بہن کا نام لیتے ہوئے میں نے کہا۔ آہ یہ تم نے کیا مانگ لیا۔ یہ بڑی بھاری چیز ہے مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری گردن اور پشت پر ایک انتہائی بھاری بوجھ لادا گیا ہے۔ جس کی تکلیف اور وزن سے میرے اعصاب ٹوٹے جا رہے ہیں۔ میری تکلیف دیکھ کر میری بہن سخت شرمندہ بھی ہوئی۔ وہ بار بار معافی مانگتیں کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنی بھاری چیز ہے ورنہ نہ کہتی۔

چند منٹ کے بعد میری سانسیں بحال ہوئیں۔ درد کی شدت میں کمی ہوئی اور وزن پشت سے ہٹا لیا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے نور میرے وجود میں سما گیا ہے۔ میری بہن نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ اسم اعظم کیا ہے۔ میں اسی طرح جذب میں بیٹھی رہی۔ انہوں نے پھر کہا اسم اعظم نور ہے؟ میں نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں انہیں اسم اعظم بتا بھی دوں تو انہیں اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسم اعظم تو اللہ کا نور ہے۔ یہ نور جب آدمی کے اندر منتقل ہو جاتا ہے تو آدمی کی باطنی صلاحیت بن جاتا ہے۔ اگرچہ میرے دل میں یہ خیال تھا مگر اثبات میں سر ہلتے دیکھ کر میری بہن بہت خوش ہوئیں۔ مجھے ان پر بے حد پیار آیا اور میں اندر ہی اندر ان

کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے روح کی تحریک میں حصہ لیا۔ اب نماز فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ سب لوگ نماز پڑھنے لگے۔ میں مشاہدہ میں گم بیٹھی رہی میرا تو عالم ہی اور تھا۔ اندر اندر ہاتف غیبی یہ اطلاع دے رہا تھا کہ اب سب کچھ آہستہ آہستہ ہوگا۔

روزے ختم ہوئے تو میری حالت بھی نارمل ہوگئی۔ وہ جذب کی کیفیت ختم ہوگئی۔ جیسے ہی میں نارمل ہوئی۔ مجھے سب سے پہلے حبیب کا خیال آیا۔ کاش وہ بھی یہاں ہوتے۔ میں جن حالات سے گزری ہوں انہیں بھی اس کا علم ہوتا۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مجھے انگلینڈ سے اسی لئے بھیجا گیا تاکہ ان کیفیات سے گزارا جائے۔ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو حبیب بھی میرے ساتھ ہوتے۔ مجھے معلوم تھا کہ سب کچھ اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے مگر اس کے باوجود بھی مجھے بڑی تکلیف اس بات کی تھی کہ حبیب ایسی متبرک رات میں ساتھ نہ تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ حبیب سے دین و دنیا کی کوئی نعمت نہ چھوٹے۔ اللہ پاک کو دیکھنے، ان کو جاننے اور پہچاننے اور ان کی قربت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ میری دوسری سب سے بڑی خواہش اگر تھی تو بس یہ کہ حبیب میرا ابدی ساتھی بن جائے۔ میری روحانی کیفیات و واردات سے بھی وہ پوری طرح آگاہ رہے تاکہ اگلی دنیا میں ہماری ذہنی ہم آہنگی رہے۔ مجھے بار بار خیال آتا اگر میں یہ ساری کیفیات انہیں لکھوں بھی تو وہ انہیں سمجھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ مجھے معلوم تھا انہیں

روحانیت سے اتنی دلچسپی نہیں ہے ان کی تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کوئی بندہ اللہ پاک سے محبت کیسے کرسکتا ہے۔ محبت تو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اللہ پاک کو آنکھوں سے دیکھے بغیر کوئی کیسے محبت کرسکتا ہے۔

میری اکثر اس بات پر اس سے بحث ہوتی' میں کہتی ہم اپنی ماں سے محبت کرتے ہیں اس لئے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا پالا پوسا۔ باپ سے محبت کرتے ہیں کہ ہماری کفالت کی ذمہ داری اٹھائی۔ بہن بھائیوں سے محبت کرتے ہیں کہ دکھ درد میں شریک رہے۔ پڑوسیوں سے محبت کرتے ہیں کہ شادی و غم میں اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ اللہ جو ماں' باپ' بھائی بہن' پڑوسی ہر ایک سے زیادہ خیال رکھنے والا ہے اس سے محبت کا خیال کیوں نہیں آتا۔ اس ہستی کو دیکھنے کی تڑپ کیوں نہیں پیدا ہوتی جب کہ ماں باپ یا بچوں وغیرہ کے آنکھ سے اوجھل ہونے پر انہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر دنیا کی کسی بھی ہستی سے کیسے محبت ہوسکتی ہے۔ میرا جی چاہتا حبیب بھی میری طرح اللہ سے محبت کرنے لگ جائیں۔ ان کی بھی روحانی صلاحیتیں ابھر آئیں۔ ہم دونوں غیب کی دنیا میں ساتھ ساتھ سفر کریں۔

میں ہر وقت سوچتی رہتی کہ اب انہیں قرآن پڑھ کر کون سناتا ہوگا۔ تلاوت تو وہ بہت خوش الحانی کے ساتھ کرتے تھے مگر میں تو انہیں ترجمہ پڑھ کر سناتی تھی اور اس میں غور و فکر کے بعد جو میری سمجھ میں آتا وہ بھی انہیں

بتاتی تھی۔ اب انہیں کوئی بھی بتانے والا نہ ہوگا۔ وہ وہاں کے ماحول میں گم ہوکر سب کچھ بھول جائیں گے۔ رات کو جب تنہائی ہوتی میں خوب روتی۔ صبح ہوتی تو بال بچوں میں مصروف ہوجاتی۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ بہن بہنوئی اور تمام رشتے دار مجھے اور بچوں کو بہت چاہتے۔ ہمارا خیال رکھتے۔ رات کا کھانا سب ایک دسترخوان پر کھاتے۔ ماحول بڑا خوشگوار ہوتا۔ ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔ ہنسی مذاق بھی ہوتا۔

ایک دفعہ کھانا کھانے کے دوران پانی کی ایک باریک سی دھار مجھ پر پڑی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس بچے وغیرہ بیٹھے تھے۔ چھوٹی تین بہنیں بھی تیں۔ بہنوئی دسترخوان کے دوسرے کنارے پر تھے جو مجھ سے دوسرے کونے میں تھا۔ میں نے ان کی صورت دیکھی تو ان کی شرارت کا اندازہ ہوگیا کہ ضرور انہوں نے ہی پانی پھینکا ہے ورنہ چھوٹوں کی تو مجال نہیں تھی کہ مجھ سے ایسی شرارت کرتے۔ مجھے پتہ تھا کہ بہنوئی منہ میں پانی لے کر دانتوں کے درمیان سے دھار نکالتے ہیں مگر کبھی دیکھا نہ تھا۔ میں نے سوچا ضرور بھائی نے ہی پھینکا ہوگا۔ اب جو ادھر ادھر دیکھنے لگی تو بہنوئی بولے کیا ہوا۔ میں نے مسکرا کے کہا کہ آپ نے پانی پھینکا ہے۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہنے لگے نہیں تو مجھے کیا ضرورت تھی۔ میں نے کہا خیر جس نے بھی پھینکا ہے ہے بہت بڑا آرٹ۔ اتنی دور پھینکنا بڑی مہارت کی بات ہے۔ فوراً" بولے میں تو اس سے بھی دور پھینک سکتا ہوں۔ میں زور سے ہنس پڑی

کہ چوری پکڑی گئی۔ سب ہنس دیئے۔ بہنوئی ہنس کر کہنے لگے تعریف آدمی کی
کمزوری ہے تعریف سن کر چپ نہیں رہ سکتا۔

ان دنوں ابھی میں نے مکان بنانا شروع نہیں کیا تھا۔ بس چار دیواری
بنی ہوئی تھی۔ درمیان میں دونوں گھروں کے صحن میں ایک دروازہ تھا۔
ہمارے پلاٹ پر سبزیاں اور شریفوں کے درخت بوئے ہوئے تھے۔ میرے
چھوٹے چھوٹے لڑکوں نے انگلینڈ میں کبھی چیونٹی بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ
چیونٹیاں اور مکوڑوں کو دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تینوں کے تینوں ان کے پاس
بیٹھ جاتے اور خوش ہو ہو کر ہارسی ہارسی Horsey کہتے۔ بارش آئی تو چھوٹے
چھوٹے مینڈکوں سے صحن بھر گیا۔ میرا بڑا لڑکا جو چار سال کا تھا وہ بڑا شریر
تھا۔ اسے پتہ تھا کہ امی ایسی چیزوں سے ڈرتی ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں مینڈک
بھر لیتا اور میرے اوپر چھوڑ دیتا کبھی میرا بھانجا گرگٹ کی دم پکڑ کر میرے پیچھے
آتا۔ میں آگے آگے وہ پیچھے پیچھے۔ اس صحن سے اس صحن میں خوب
دوڑتے۔ بڑا ہی مزا آتا۔ شام بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے گزر جاتی مگر رات
کو خیالات کا دھارا پھر حبیب کی جانب بہہ نکلتا۔

سچ تو یہ ہے کہ دن ہو یا رات۔ حبیب کا خیال تو ہر وقت ہی رہتا تھا مگر
دن کی مصروفیات اور لوگوں کی موجودگی دل کے معاملات کسی پر افشا نہ ہونے
دیتی مگر رات آتی تو دل اپنے سارے دروازے کھول دیتا۔ کبھی میں سوچتی'
حبیب کو اپنے کپڑے بھی خود دھونے پڑتے ہوں گے۔ وہ اپنے جوتوں پر پالش

بھی خود کرتے ہوں گے۔ کھانا بھی پکاتے ہوں گے۔ میں بے بسی سے رو پڑتی۔
کاش انسان اتنا بے بس اور کمزور نہ ہوتا۔ کاش اس کے پاس ایسی قوت ہوتی
کہ لمحوں میں دور دراز کا سفر کر لیتا۔ دل کے ہر دروازے سے تقاضے اندر
آنے لگتے۔ دل حسرتوں کے ہجوم میں تلملا کر رہ جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے کوئی
دھیرے دھیرے میری جان نکال رہا ہے۔ جانکنی کی یہ تکلیف بڑی جان لیوا
ہوتی۔ ہر روز رات کے دو تین بجے تک یہی سلسلہ چلتا رہتا پھر نیند آجاتی۔

محافظ

چار پانچ ماہ بعد حبیب نے مجھے اتنے پیسے بھجوا دیئے کہ مکان کے دو کمرے بن سکیں۔ میں نے بہنوئی کی مدد سے مکان کی تعمیر شروع کردی۔ مجھے شروع ہی سے ہر کام خود کرنے کا شوق رہا۔ ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ دوسروں کا احسان کم سے کم اٹھایا جائے اور نہ ہی میں نے کسی سے توقعات قائم کیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی تھوڑا سا بھی میرے لئے کرتا تو اپنے اوپر اس کے احسانوں کا بوجھ محسوس ہوتا اور میں جلد سے جلد اتارنے کی کوشش میں لگ جاتی اور اب میں سمجھتی ہوں کہ یہ عادت بہت اچھی ہے۔ اس طرح ایک تو یہ فائدہ ہے کہ آدمی عملی زندگی گزارنے کا عادی ہوجاتا ہے اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں اسے عملی تجربہ حاصل ہوجاتا ہے۔ جس سے ذہنی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں اور عقل میں وسعت آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے سے توقعات نہ ہونے کی وجہ سے کبھی مدد نہ ملنے پر قطعی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ جس سے آپس کے تعلقات بھی دوستانہ رہتے ہیں۔

بچپن ہی سے ہمارے ماں باپ نے ہماری اس طرح تربیت کی تھی کہ

ہر کام خود کرنا چاہئے اور زندگی کے کٹھن سے کٹھن لمحات میں بھی ہمت و استقلال سے کام لینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب بہن بھائیوں نے مصائب و آلام کو بھی زندگی کا ایک جز سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کبھی آپس میں نہ کیا۔ نہ کبھی کسی بہن بھائی نے ماں باپ سے اپنے دکھوں کی کوئی بات کی۔ اصل میں ہمارے نزدیک تو زندگی کا نام ہی غم اور خوشی دونوں کا ہے۔ اسی وجہ سے کبھی اپنے دکھوں کا بوجھ دوسرے پر لادنے کی کوشش نہ کی۔ خصوصاً" مجھے تو ہر وقت یہی احساس رہتا کہ سب لوگ مجھ سے اس قدر محبت رکھتے ہیں میری ہر پریشانی سے وہ بھی پریشان ہوں گے یہی احساس ذاتی پریشانیوں کو کسی پر بھی ظاہر نہ ہونے دیتا مگر ہمیں بھی معلوم تھا کہ صبر و ضبط ہی آدمی کی قوت و سکت کو بڑھا سکتا ہے اور آدمی کے اندر جتنی زیادہ سکت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اتنا ہی زیادہ قریب ہوتا ہے۔ میری ماں اکثر کہا کرتی تھیں کہ بیٹے اللہ کی محبت کو برداشت کرنے کے لئے بھی بندے میں بے پناہ قوت ہونی چاہئے اور یہ قوت زندگی کی مصیبتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

مجھے اپنے مکان کی تعمیر کی بے حد خوشی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی دو تین کمرے رہنے کے لئے بن جائیں گے تو حبیب واپس آجائیں گے۔ میں نے بڑی خوشی خوشی کام شروع کیا۔ مزدوروں کے ساتھ جاکر سیمنٹ لاتی اور بھی جو کام ہوتا حتی الوسع خود کرنے کی کوشش کرتی۔ برابر میں بہن بہنوئی

کی وجہ سے بہت آرام تھا۔ وہ سب مجھ سے بچوں سے حد درجے محبت کرتے
تھے۔ دو کمرے، برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ بن کر تیار ہو گئے۔ زمین
بہت بڑی تھی ارادہ یہی تھا کہ حبیب یہاں آکر باقی مکان آرام سے بنوالیں
گے۔ کمروں میں دروازے لگنے باقی تھے۔ مجھے مزید پیسوں کا انتظار تھا۔ حبیب
نے لکھا کہ ابھی کچھ دن لگیں گے۔ مجھے بہن کے یہاں رہتے ہوئے تقریباً" نو
ماہ ہو چکے تھے۔ ماں باپ کا گھر دور ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں نہیں رہ
سکتی تھی کیونکہ میری بیٹی اسکول جاتی تھی جو قریب ہی تھا۔ پلاٹ پر چار
دیواری اور لوہے کے گیٹ تو لگے ہی ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اللہ سے بڑھ
کر اور کون اپنے بندوں کی حفاظت کر سکتا ہے۔ دروازے کھڑکیوں پر پردے
لٹکا کر اپنے گھر میں منتقل ہو گئی۔ بہن بہنوئی نے بڑی مشکل سے اس کی
اجازت دی کہ سخت غیر محفوظ ہے۔ تم چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلی
کیسے اس طرح رہو گی۔ کوئی بھی باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر آسکتا ہے۔ یہ
ہے وہ ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے مزید احسانات اٹھانا نہیں چاہتی
تھی۔ میں نے انہیں یہی کہا کہ مجھے اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ پھر آپ
لوگ بھی تو برابر میں ہیں۔ بہرحال بڑی مشکل سے میں نے انہیں اس بات کا
یقین دلایا کہ اللہ کی نظر آپ سب سے زیادہ مجھے دیکھ رہی ہے اور وہ یقیناً"
میری اور بچوں کی حفاظت کرے گا سب چپ ہو گئے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ
جب میں کسی کام کا ارادہ کر لیتی ہوں تو کوئی بھی مجھے نہیں روک سکتا۔ میں نے

تھوڑا سا ضروری سامان لیا اور منتقل ہو گئی۔ اپنے گھر آکر مجھے بڑا ہی سکون
اور خوشی ہوئی۔ دونوں کمروں کے آگے لمبا سا برآمدہ تھا۔ میں نے پلاٹ کی
پچھلی جانب کے دو کمرے بنوا لئے تھے۔ برآمدے کے تھوڑا سا نیچے صحن تھا۔
مجھے جھولے کا شوق بچپن ہی سے رہا ہے اس لئے میں نے برآمدے میں چھت
میں جھولے کے لئے دو لوہے کی کڑیاں چھت بنتے وقت ہی لگوائی تھیں اور
اس میں جھولا ڈال دیا تھا۔ بڑا ہی مزہ آتا۔ صبح فجر کی نماز برآمدے میں ہی پڑھ
کر میں جھولا جھولنے لگ جاتی اور خوب گانے گاتی۔ اس وقت حبیب کی بہت
یاد آتی۔ ہر گانا فراقیہ راگ بن جاتا۔ پیسے ختم ہو گئے تھے اس لئے تعمیر بھی
روک دی تھی۔ میں نے ایک بڑی سی دری رکھی تھی نماز کے لئے۔ میں نماز
پڑھتی اور چھوٹے بچے کو ایک جانب دری پر بٹھا دیتی۔ وہ وہیں سو جاتا۔ مجھے
رات کو کبھی ڈر نہیں لگا اب چاندنی راتیں ختم ہو گئیں اور اندھیری راتیں
ہونے لگیں۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے سارے پلاٹ پر اندھیرا ہوتا۔ میں بس
ایک لالٹین کمرے میں روشن رکھتی تھی۔ ان دنوں آبادی بھی نہ تھی گھر بھی
دور دور تھے۔ ایک رات عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹی بچے ابھی جاگ رہے تھے
کمرے میں لالٹین کی روشنی میں کھیل رہے تھے۔ چاند نہ ہونے کی وجہ سے
باہر گھپ اندھیرا تھا۔ میں جھولے پر جا بیٹھی اور خوب زور زور سے پینگیں
بڑھانے لگیں اور حسب عادت گانے بھی لگی۔ تھوڑی دیر بعد میرے پاؤں پر
ایک کنکری سی لگی۔ میں نے چونک کر گانا بند کر دیا اور جھولا ذرا سا روک کر

ایک لمحے کو اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ میں نے وہم سمجھ کر دوبارہ جھولے کی پینگ بڑھا دی اور اسی ترنگ میں گانے لگی۔ اب کے سے پہلے کی نسبت زیادہ زور سے کنکری پیٹھ پر لگی۔ میں چونک گئی۔ جلدی سے جھولا روکا۔ خیال آیا کہ کوئی اکیلی عورت جان کر تنگ کر رہا ہے۔ میں نے فوراً" زور سے آواز لگائی منے کے ابا ذرا بندوق تو لانا۔ میں بار بار زور زور سے یہی جملہ دہرائے جاتی۔ اندر سے میں سخت خوف زدہ تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ نظر تو آتا نہ تھا۔ بس یہی ذہن میں تھا کہ جو بھی ہے اسے یہ پتہ چل جائے کہ میں اکیلی گھر میں نہیں ہوں۔ بندوق لئے منے کے ابا بھی گھر میں موجود ہیں۔ باہر میں نے قطعی خوف کا مظاہرہ نہیں کیا کیونکہ میں جان گئی تھی کہ جو بھی ہے وہ مجھے دیکھ رہا ہے اگر میں ذرا بھی ڈری تو میرا اکیلے رہنا مشکل ہو جائے گا۔ میں زور دار کڑکتی ہوئی آواز میں تھوڑی دیر بعد کہتی رہی۔ منے کے ابا ذرا دیکھنا تو کس نے کنکری ماری ہے۔ ذرا بندوق تو لانا۔ ساتھ ساتھ کمرے میں سب بچوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ چھوٹے کو گود میں لیا دوسرے کے ہاتھ پکڑے اور آہستہ آہستہ انہیں خاموش رہنے کو کہا کہ چلو برابر میں آنٹی کے یہاں چلتے ہیں۔ پھر میں سب کو لے کر بہن کے یہاں آ گئی۔ دن رات میں دس دفعہ آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا میں نے بچوں کو اتارا اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے سوچا اگر میں نے انہیں بتایا تو پھر میں اکیلی گھر میں نہیں رہ سکوں گی۔ چند منٹ بعد بہنوئی اپنے کمرے سے

باہر نکلے اور نکلتے ہی بالکل میرے لہجے میں اسی طرح میرے الفاظ دہرائے۔ منے کے ابا ذرا اپنی بندوق تو لانا اور پھر جو ہنسی کے فوارے چھوٹے ہیں بس کیا بتاؤں میں نے کہا اچھا تو یہ آپ تھے۔ کہنے لگے میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم چیختی چلاتی فوراً" بے ہوش ہو جاؤ گی تم تو بہت بہادر نکلیں۔ میں نے کہا تو آپ کیا سمجھ رہے تھے کہ فوراً" گھر چھوڑ دوں گی۔ ویسے بعد میں بہنوئی نے میرا خوب ریکارڈ لگایا۔ مدتوں تک جو آتا اس کے سامنے اس قصے کو دہراتے۔ سارا خاندان مجھے منے کے ابا اور بندوق کے نام سے چھیڑتا۔ زندگی بڑے مزے کی تھی مگر دل میں جو پھانس گڑی تھی اس کی چبھن تنہائی میں خون کے آنسو رلاتی۔ میرا کوئی لمحہ حبیب کی یاد سے خالی نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو ہر شئے میں اس کی صورت دکھائی دیتی۔ میں گھبرا گھبرا کے اور زیادہ عبادت کی طرف اپنے آپ کو مشغول رکھنے کی کوشش کرتی۔

ایک ڈیڑھ ماہ تک دروازے کھڑکیاں اور بجلی بھی لگ گئی۔ مجھے امید تھی کہ حبیب جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ بچے بھی اپنے پاپا کو بہت یاد کرتے تھے۔ مجھے آئے تقریباً" ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے گھر کو دیمک لگ گئی ہے اس کی ساری دیواریں کھوکھلی ہو کر گر گئی ہیں۔ صرف ایک چھت باقی رہ گئی ہے۔ میں سخت پریشانی میں گھر کو دیکھ رہی ہوں اور اللہ سے دعا کر رہی ہوں۔ صبح اٹھی تو پہلے تو خواب دیکھ کر تھوڑی سی فکر لگی کہ کیا ہونے والا ہے۔ پھر خود ہی دل اندر سے کہنے لگا میں

حبیب کو جانتی ہوں اسے مجھ سے میرے بچوں سے انتہائی محبت ہے۔ یقیناً ”یہ شیطانی وسوسہ ہے یہ کہہ کہ فوراً“ ہی میرے ذہن سے خواب مٹ گیا۔ کچھ دنوں بعد خواب دیکھتی ہوں کہ میرا گھر ہے۔ یہ بہت بڑا کمرہ ہے۔ دروازہ بند ہے۔ میرے چاروں بچے اور میں اندر ہیں۔ دروازے کے باہر کچھ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں برتنوں میں آگ کے دہکتے انگارے ہیں۔ وہ میرے بڑے لڑکے کو آواز دیتے ہیں کہ دروازہ کھولو اور یہ آگ لے کر گھر کے اندر ڈال دو۔ بڑا لڑکا دروازہ نہیں کھولتا۔ پھر دوسرے سے کہتے ہیں وہ بھی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ میں کمرے کے وسط میں بیٹھی ہوں اور فکرمندانہ نظروں سے یہ تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ آوازیں سن کر چھوٹا لڑکا جو بہت ہی چھوٹا ہے گھٹنوں چل کر دروازے کے قریب جاتا ہے جیسے بچے آواز سن کر لپکتے ہیں تو وہ لوگ دروازے کی دراڑ میں سے جھانکتے ہوئے اسے بلاتے ہیں۔ میں اٹھ کر بچے کو گود میں اٹھا لیتی ہوں اور بچے کو پیار کرتی ہوں کہ بیٹا تم کو نہیں معلوم کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔ پھر میں دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو کر کمرے کے اندر کی جانب دیکھتی ہوں جہاں سب بچے بیٹھے ہیں۔ میں زور سے کہتی ہوں۔ اے میرے رب یہ ظالم لوگ میرے گھر کو جلانا چاہتے ہیں تیرے سوا اور کون ہمیں بچا سکتا ہے۔ اس لمحے میں دیکھتی ہوں کہ فرش کی چھت تک نور کا ایک تار بندھا ہے جو دروازے سے لے کر کمرے کے بیچوں بیچ تک ہے۔ کمرے کے وسط والا سرا چھت سے ملحق ہے اور دروازے والا سرا میرے پاؤں کے

قریب ہے۔ میں نیچے سے اوپر نگاہ ڈالتی ہوں۔ چھت پر تار سے ایک مہر لٹکی ہے یہ مہر سرخ چمڑے کی اس صورت کی ہے ”ن“ اس مہر پر سنہری نور سے اوپر سے نیچے کی جانب اللہ محمد نقش ہے۔ میں بہت غور سے اس مہر کو دیکھتی ہوں۔ مجھے اس سے بڑا ہی سکون ملتا ہے اور اس وقت ذہن سے یہ بھی مٹ جاتا ہے کہ لوگ باہر کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد آواز سنائی دیتی ہے۔ شمامہ تمہارے گھر پر مہر لگی ہوئی ہے تم ذرا بھی مت ڈرو۔ کوئی تمہارا گھر تباہ نہیں کر سکتا۔ اس ندائے غیبی نے جیسے میرے اندر ایک قوت بھر دی۔ میں نے اس وقت گھر کا دروازہ کھول دیا۔ بے بی میری گود میں تھی۔ باقی تینوں بچے میری ٹانگوں کے ساتھ چمٹے تھے۔ میں نے باہر کھڑے لوگوں کو للکار کر کہا لو آؤ اور پھینکو میرے گھر میں آگ۔ آگے بڑھو۔ تم معصوم بچوں کو کیا پھسلاتے ہو لو میں دروازہ کھولتی ہوں آگے بڑھو دیکھتی ہوں تم کیا کر سکتے ہو۔ تم کیا تمہاری ساری قوم بھی مل کر میرا گھر نہیں جلا سکتی۔ ان سب نے میرے جلال کو دیکھا۔ سارے جیسے دم بخود رہ گئے۔ پھر ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔

خواب سے جاگی تو حبیب کا خیال آیا کہ جانے کن آزمائشوں میں پڑا ہو گا۔ میں ہر وقت اس کے لئے دعا کرتی کہ اللہ پاک اسے بری صحبت سے بچا کر رکھنا۔ میں جانتی تھی کہ اسے اپنے بال بچوں سے حد درجے محبت ہے مگر کبھی کبھی یہ محرومی بھی آدمی کو کمزور بنا دیتی ہے۔ ڈیڑھ سال ہو گیا میں اسے

آنے کا لکھتی تو وہ لکھتا کہ وہاں آکر کیا کروں گا۔ تم آجاؤ۔ آخر میں نے جانے
کا ارادہ کیا تو مجھے روک دیا کہ ابھی نہ آؤ۔ میرے اندر اس کا عشق دن بدن
بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں پریشان ہوجاتی کہ مجھے تو شروع ہی سے اللہ سے ملنے کا
شوق ہے پھر درمیان میں ایک آدمی کا اس قدر عشق کیوں ڈالا گیا ہے۔ مجھے
کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔

میں سوچتی مجھے اللہ کے سوا کسی سے ایسے محبت نہیں کرنی چاہئے۔
شاید یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ اسی لئے دور کردیا ہے۔ پھر میں اندر
ہی اندر اللہ میاں کو کہتی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں مگر شوہر سے محبت
کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ میں شوہر سے جس روحانی بندھن کی خواہش
رکھتی ہوں اس میں اس کی سکت نہیں ہے۔ جب بھی مجھے حبیب کے متعلق
کوئی ایسا ویسا خیال آتا مجھے محسوس ہوتا کہ مجھے اس کی محبت سے ہٹایا جا رہا
ہے۔ میں اندر اندر خوب شکوہ کرتی کہ شیطان مجھے ورغلا رہا ہے۔ یہ حالت
چند لمحوں بعد ختم ہوجاتی۔ مجھے حبیب سے اس قدر عشق تھا کہ ہر وقت اس
عشق کی کیفیت مجھ پر چھائی رہتی۔ ایک عجیب جانگسل کیفیت جیسے میں شمع
کی مانند آہستہ آہستہ جلتی جا رہی ہوں۔ جیسے میرے اندر سے کوئی دھیرے
دھیرے جان نکال رہا ہے۔ جیسے میری رگوں سے خون نچوڑا جا رہا ہے۔ میرا
جی چاہتا میں ساری دنیا سے پردہ کرلوں کوئی مجھے نہ دیکھے۔ میرا دل کہتا جو عشق
مجھے اللہ سے کرنا چاہئے وہ ایک بندے سے کررہی ہوں۔ پھر مجھے وہ لمحہ یاد آتا

جب اس کا عشق میرے سینے میں انڈیلا گیا تھا۔

کچھ عرصہ سے میرے رشتہ داروں کو بھی خاصی تشویش ہونے لگی تھی
کہ حبیب واپس کیوں نہیں آتا۔ اس کے خطوں میں وہ پہلی سی بات نہ تھی۔
ہر بار جب خط آتا میرے اندر حبیب کے ساتھ بندھا ہوا ایک تار ٹوٹ جاتا۔
فطرت نے میرے دل کے سارے تار حبیب کے ساتھ باندھ رکھے تھے۔ میں
اسے اپنی زندگی سمجھتی تھی۔ میں ہر وقت ڈرتی رہتی تھی کہ اس سے رشتہ
ٹوٹنے پر میں مرجاؤں گی۔ میں اس رشتہ کو اپنی خوشیوں کی بنیاد سمجھتی تھی۔
میری اب بھی راحتوں کا انحصار اس بندھن پر تھا۔ مجھے ہر وقت ایسا محسوس
ہوتا کہ عشق میری روح ہے اور روح میری زندگی ہے۔ اس زندگی کے دو رخ
ہیں۔ اس ظاہر باطن کا مجموعہ میری ذات ہے۔ کسی ایک رخ سے تار ٹوٹنے پر
میری ذات کی تکمیل نہ ہوسکے گی۔ انسان انجانے میں کیا کچھ نہیں سوچ لیتا مگر
قدرت کا قانون اپنی جگہ اٹل ہے۔ عشق کا مرکز ذات باری تعالیٰ ہے۔ عاشق
کے دل اس محور کے گرد طواف کرتے ہیں مگر میرے ذہن میں یہ بات بھی آتی
کہ میرے عشق کو ابدیت اس وقت نصیب ہوتی جب حبیب کا محور بھی ذات
خداوندی ہوتا لیکن وہ ان روحانی گلی کوچوں سے واقف نہ تھا جس پر میں
سرگرداں تھی۔ میرے پاس دعا کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا لیکن جوں جوں
دن گزرتے جا رہے تھے آہستہ آہستہ میرے ذہن میں یہ بات آتی جا رہی تھی
کہ روح کی ابدی زندگی کا انحصار صرف اور صرف ذات خداوندی پر ہے۔

بالآخر دو سال دو ماہ کے بعد حبیب نے مجھے اس شرط پر واپس انگلینڈ بلا لیا کہ ایک بیٹے اور بیٹی کو پاکستان میں چھوڑدوں اور دو بچوں کو ساتھ لے آؤں۔ باقی دو کو بعد میں بلالیں گے۔ حبیب کے اس فیصلے پر مجھے یوں محسوس ہوا کہ قدرت میری محبت کو مزید آزمانا چاہتی ہے۔ ساڑھے چار سال کے بیٹے اور نو سالہ بیٹی کو چھوڑتے وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے دل سے بندھے ہوئے تاروں کو کاٹ رہا ہے۔ اس اذیت ناک لمحے میں میں بار بار اللہ سے یہی دعا کرتی کہ دل کے ٹوٹے تاروں کو روح کے ساتھ جوڑے رکھنا۔ تو ہی جوڑنے والا ہے۔

سفر کے دوران میں یہی سوچتی رہی کہ بندے کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنی چاہئے۔ اللہ کی محبت میں دنیا کو شریک کرلینا نفس کے لئے سخت اذیت ناک ہے۔ گھر جا کر مجھے پتہ چلا کہ اتنے عرصے کی دوری نے ہمارے ذہنوں کو اور زیادہ ایک دوسرے سے دور کردیا ہے۔ میرے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوگیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخرت میں حبیب کے ساتھ سے محروم ہو جاؤں۔ اس اندیشے نے میرے دل پر گہرے گھاؤ ڈال دیئے۔ میں اسے جتنا نکالنے کی کوشش کرتی وہ اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا۔ اب میں اسے اپنی کیفیات بتاتے ہوئے بھی ڈرتی تھی کیونکہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ عام طور سے لوگ اگلی زندگی کے لئے ایسا نہیں سوچتے جس طرح میں سوچتی ہوں۔ میری ماں نے مجھے مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق یہی بتایا تھا کہ

مرنے کے بعد کی زندگی دائمی زندگی اور وہاں بھی لوگ یہاں کی طرح رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں وہاں کی زندگی میں حبیب کا ساتھ چاہتی تھی مگر مشکل تو یہ تھی کہ یہ خواہش میری روح کا تقاضہ بن گئی تھی۔ وہ دور میری روحانی تربیت کا دور تھا۔ روح کا تعلق تو اللہ سے ہے اور اللہ کے سوا غیر کا تقاضہ نفس کی کمزوری ہے۔

روحانی تربیتی سلسلہ میں مجھے اس کمزوری کا مشاہدہ کرایا گیا۔ میری روح مطمئن تھی وہ اللہ کی محبت میں سچی تھی۔ جب ایسی حالت مجھ پر طاری ہوتی کہ دل پر تیز چھری سے زخم لگائے جاتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ حبیب کی محبت میرے قلب سے کھرچ کھرچ کے نکالی جا رہی ہے۔ روح اس صورت حال سے مطمئن رہتی مگر نفس سے تکلیف برداشت نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ سے شکوہ کی بات ذہن میں آنے لگتی۔ میں رو رو کے اللہ تعالیٰ سے کہتی کہ میری روح تجھ سے ہی عشق کرتی ہے یہ سب کچھ تو نفس کی ضرورت ہے۔

حبیب کے ساتھ روحانی تعلق قطعی طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ بس میرا شوہر تھا۔ میری زندگی نہ تھا۔ ایک دن اسی حالت میں میں نے دل کی جانب دیکھا اس پر اس قدر گھاؤ تھے کہ اب کہ لکیر کے برابر بھی جگہ نہ تھی۔ دل نے عاجز ہو کر کہا اب کہاں چھری چلاؤ گے۔ زخم تو پہلے ہی بہت ہیں۔ گھاؤ پر گھاؤ لگانا کون سی جوان مردی ہے اور درد تو درد ہی ہے خواہ وہ ایک

پھانس چبھنے کا ہو یا سارے بدن کا ہو۔ تب میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اب مجھ میں مزید سکت نہیں ہے۔ اب میں نئے سرے سے زندگی کا آغاز چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرمایئے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کیلئے مجھے حبیب کو چھوڑنا ہوگا۔ اگر آپ یہ ضروری سمجھتے ہیں تو میں اس کیلئے تیار ہوں۔ حواس کی گہرائی کے اس لمحے میں مجھے ندائے غیبی دل کے اندر سنائی دی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تمہیں حبیب سے جدا نہیں ہونا ہے۔ میں نے کہا اگر میری زندگی حبیب کے ساتھ ہی گزرنی ہے تو پھر میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔ صدا آئی تم کیا چاہتی ہو؟ میں نے کہا سب سے پہلے تو یہ کہ ان اذیت ناک لمحات کے اور میرے درمیان ایک پردہ ڈال دیا جائے اور مجھے اس اذیت سے ہمیشہ کیلئے رہائی دلائی جائے۔ دوم یہ کہ محبت میری زندگی ہے میرے دل میں حبیب کی محبت پہلے کی طرح ڈال دی جائے اور میرے لئے روحانی راستوں پر چلنے میں آسانی عطا کی جائے۔ ندا آئی تمہاری گزارشات منظور کرلی گئی ہیں اب ایسا ہی ہوگا۔ اسی وقت ان لمحات کے اور میری نگاہ کے درمیان ایک پردہ ڈال دیا گیا۔ اسی وقت میں اپنے پورے شعور میں آگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بالکل پہلے کی طرح خوش باش ہوں۔ میرے اندر پہلے کی طرح زندگی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اللہ میاں کتنے اچھے کتنے مہربان ہیں۔ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں ورنہ پہلے تو یہ حال تھا کہ ہزار کوشش کے باوجود بھی ذہن سے شکایت نہیں

جاتی تھی۔ نفس کو اللہ تعالیٰ کی رحیمی و کریمی سے شکوہ ہونے لگا تھا کہ باوجود قادر مطلق ہونے کے وہ لوگوں کے تقاضوں کو کیوں پورا نہیں کرتے۔ اللہ کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ سب کچھ موجود ہونے کے باوجود حاجت مند کو خالی ہاتھ لوٹانا کون سی سخاوت ہے۔ جب بھی نفس میں ایسی الٹی سیدھی باتیں آتیں تب ہی میں اللہ میاں سے زمین پر ماتھا ٹیک کر دعا کرتی تھی کہ نفس اپنی کمزور فطرت کی وجہ سے مجبور ہے اس طرف سے نظر ہٹا لے۔

اسی دن سے میں بالکل ہی بدل گئی۔ وہی پہلے کی سی خوشیاں اور شوخیاں واپس لوٹ آئیں۔ حبیب کے کاموں میں اس کی اور بچوں کی خدمت میں میرا خوب دل لگنے لگا۔ پھر پہلے کی طرح میں قرآن ترجمہ کے ساتھ پڑھتی اور حبیب کو بتاتی رہتی۔ حبیب کو بھی قرآنی علوم میں آہستہ آہستہ دلچسپی ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ انسان کس قدر خودغرض ہے اور کس قدر اپنی خواہشات میں بے بس و مجبور ہے۔ اسے تو اللہ کا غلام ہونا چاہئے نا کہ اپنی خواہشات کا غلام۔ اب میرا ذہن اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کی جانب متوجہ ہونے لگا۔

میں بار بار سوچتی اور غور کرتی کہ آخر اللہ تعالیٰ نے مجھے کس کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ میرے ساتھ جو غیرمعمولی واقعات بچپن سے رونما ہورہے ہیں تو اس کی کیا حکمت ہے۔ میں نے اپنے دل میں اللہ میاں سے عہد کیا کہ اے میرے رب تو ہی ہر شے کا مالک و مختار ہے میرے دل و دماغ کو ہر طرف

سے ہٹا کر بس اپنی جانب ہی لگا دے تاکہ تو راضی رہے۔

اب میرا دل اور ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ سے زیادہ یکسو ہونے لگا۔ جس طرح چوبیس گھنٹے ہر وقت میرے حواس پر حبیب چھایا رہتا تھا اس میں کمی آ گئی۔ مجھے بچوں کا خیال بھی رہتا جنہیں میں بہن کے یہاں چھوڑ آئی تھی۔ وہ وہاں خوش تھے۔ مگر میں اس بات سے اکثر پریشان ہو جاتی کہ اتنے عرصے دور رہنے کی وجہ سے ان کے دل میں یہ بات نہ آ جائے کہ ان کے ماں باپ ان سے محبت نہیں کرتے۔ میں اپنی ہر پریشانی اللہ کے سامنے رکھ دیتی اور دعا کرتی کہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی راستہ نکال دے۔

میرا جی چاہتا زندگی کے دن پر لگا کر اڑ جائیں۔ میں اپنے رب کے پاس پہنچ جاؤں اس کی آغوش میں سر چھپا کر دنیا سے ہمیشہ کے لئے پردہ کرلوں۔ نہ حبیب ہو نہ بچے ہوں۔ کوئی بھی نہ ہو۔ بس میں ہوں اور میرا رب۔ قرآن پڑھتی تو ان کیفیات میں گہرائی آ جاتی۔ دل چاہتا کہ میں ہر شے سے اپنے دل کو ہٹا کر بس اللہ سے محبت کروں۔ پہلے میں سوچتی تھی کہ بندہ جو چاہتا ہے اسے مل جاتا ہے۔ مگر اب میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ سب کچھ اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے بندہ قدرت کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے۔ ہر بندے کے لئے اللہ نے زندگی کا ایک خاص پروگرام رکھا ہے اب میری سوچوں میں مزید گہرائی آ گئی۔ اب اور زیادہ مجھے یہ خیال رہنے لگا کہ اللہ پاک مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

میری زندگی کے معاملات پہلے کی طرح تھے۔ گھر کے کام کاج اور

فرصت کے اوقات میں قرآن کا باترجمہ مطالعہ اور اس کی آیات میں غور و فکر کرنا۔ ایک دن تو میرے اوپر الہامی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کیفیت میں مجھے کہا گیا کہ ہم تمہیں روحانی علوم دینا چاہتے ہیں۔ تم انہیں لکھ کر اپنی بہن کو پاکستان میں بھیج دیا کرو۔ اس کیفیت میں مجھے غیب کے مشاہدات ہوتے۔ میں انہیں لکھ لیتی۔ مجھے کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اچھے اچھے الفاظ استعمال کرو۔ اب جب میں مشاہداتی واردات کو تحریر کرتی یوں لگتا جیسے یہ الفاظ ذہن میں اوپر سے اتر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا تقریباً" ڈیڑھ دو سال تک۔ میں جو کچھ تحریر کرتی حبیب کو ضرور پڑھاتی۔ حبیب کا رجحان بھی اب آہستہ آہستہ اس طرف ہونے لگا۔ اس عرصے میں ہم نے اپنی بیٹی کو واپس بلا لیا تھا۔ بیٹا ابھی وہیں تھا۔ وہ سب میرے لڑکے سے حد درجے محبت کرتے تھے۔ پھر چند ماہ بعد ہم نے اپنے بیٹے کو بھی بلا لیا۔

حبیب کی کسی کے ساتھ ریسٹورینٹ میں پارٹنر شپ تھی۔ ایک دن کام سے آئے تو بتایا کہ پارٹنر نے مجھ سے کہا ہے کہ یا تو تم لے لو یا میں لے لوں۔ پارٹنر شپ ختم کرنا ہے۔ وہ کہہ آئے کہ ٹھیک ہے تم ہی لے لو مگر ساتھ ہی ساتھ فکر مند بھی تھے کہ آئندہ کیا کریں گے۔ میں نے کہا فکر نہ کرو۔ مجھے سلائی آتی ہے تم کٹائی کرنا میں سلائی کروں گی۔ ہم لیڈیز ٹراؤزر بنائیں گے۔ ہم نے سلائی مشین خریدی اور بہت بڑا سا تھان خرید لیا۔ کپڑا خریدنے سے پہلے ہم نے عورتوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔ اتفاق سے زیادہ تر عورتیں براؤن

ٹراؤزر پہنے نظر آئیں۔ ہم اس کام میں بالکل نئے تو تھے ہی ہم نے سوچا کہ بس انگریز عورتیں صرف براؤن ٹراؤزر ہی پہنتی ہیں۔ یہ سوچ کر ہم نے صرف براؤن رنگ کا ہی ڈھیر سارا کپڑا خرید لیا۔ چند دن میں اس کی خوب ساری ٹراؤزر سی لیں اور مارکیٹ میں جا کر اسٹال لگالیا۔ مارکیٹ اوپن تھی سردی بے تحاشا تھی۔ حبیب اور میں دونوں اسٹال پر تھے اب جو عورت بھی اسٹال پر آئے وہ براؤن کے علاوہ دوسرا رنگ مانگے۔ جب ہم کہیں کہ ہمارے پاس تو صرف براؤن رنگ ہی ہے تو ہنس کر چلی جائیں۔ دو چار گاہکوں کے آنے پر ہی اندازہ ہوگیا کہ ہم سے کیسی حماقت ہوئی ہے۔ ہنسی بھی بڑی آئی کہ یہ کیا ہوا ایک رنگ کے علاوہ دوسرے رنگ کا تصور ہی نہ آیا۔ دوپہر تک سخت سردی میں کھڑے ہم واپس چلے آئے۔ اس مضحکہ خیز تجربے کو ہم یاد کر کے بہت دن ہنستے رہے مگر اس احمقانہ تجربہ نے ہمیں بازار کی صحیح عقل سمجھا دی۔ بعد میں ہم نے بڑی محنت سے بڑا صحیح صحیح کام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کی محنتوں میں برکت بھی خوب ڈالی ماشاء اللہ۔

میرے اندر تو شروع ہی سے یہ ذہن میں تھا کہ اللہ پاک ہمیں ہماری اولاد کی صحیح تربیت و پرورش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس بات میں حبیب کی بھی یہی خواہش اور کوشش شروع ہی سے تھی کہ اولاد نیک اور فرمانبردار ہو اسے حلال کی کمائی اور محنت کی روزی کا بہت زیادہ خیال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے معاملے میں کبھی اس کی نیت میں کوئی فتور نہ آیا۔ اس نے بچوں

کو بھی شروع ہی سے محنت اور ایمانداری کی پریکٹس کرائی۔ سلائی کا کام چونکہ گھر کا تھا لہٰذا ہم سب ہی اسے مل جل کر کرتے تھے۔

بچے اسکول سے آتے تو میں انہیں کھانا دیتی اور پھر وہ ہمارا ہاتھ بٹاتے۔ لڑکی بڑی تھی وہ استری کرتی لڑکے چھوٹے تھے وہ دھاگہ کاٹتے غرضیکہ ہم نے کبھی بچوں پر ترس نہیں کھایا کہ ابھی بچے ہیں ان سے کام نہ لیں بلکہ ہم یہ سوچتے کہ بچپن ہی سے ان کی ایسی ٹریننگ ہونی چاہئے کہ وہ زندگی میں اپنی ضرورت کے مطابق سب کام کرسکیں۔ کام کے دوران جب ہم سب اکھٹے ہوتے تو کبھی ہم انہیں اپنے دین و مذہب کی اور اپنے پیغمبروں اور اپنے اسلاف کی اچھی اچھی باتیں سناتے۔ کبھی کہانی سناتی کبھی سب مل کر گانا گاتے۔ زیادہ تر وہ انگلش کی وہی Poem ہوتی تھیں جو بچوں کو اسکول میں سکھائی جاتی۔ ہم ان سے کہتے گاؤ۔ جب وہ گاتے تو ہم بھی ان کے ساتھ آواز ملا دیتے۔

حبیب کو بچوں کی پڑھائی کا بھی بے حد خیال تھا۔ تعلیم کا شوق تو مجھے بھی اپنے والدین سے ملا تھا۔ میری امی تو اس معاملہ میں ایسی سخت تھیں کہ کبھی اسکول سے ناغہ نہ کرنے دیتیں۔ جب تک کوئی بہت سیریس شکایت نہ ہو۔ ہمیں بھی اسکول جانے میں بڑا ہی مزہ آتا۔ اکثر بچوں کی ہر سال 100% حاضریاں ہوتیں اور انہیں اس پر میرٹ ملتے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں قرآن پڑھانے کے لئے مولوی صاحب کے پاس بھجواتے۔ غرضیکہ ہم سے جتنی بھی

ہوسکتی تھیں بچوں کی تربیت میں توجہ دیتے۔ اللہ کا کرم ہے کہ تعلیم کے دوران بچوں کی کبھی کوئی شکایت نہ آئی۔

حبیب اور میں ہمیشہ Parents Evening میں ضرور جاتے اور بچوں کی ٹیچر سے ملتے اور ان کی رپورٹ دیکھتے۔ اس سلسلے میں ٹیچر بھی ہمارے ساتھ پورا تعاون کرتے اور اس بات پر خوش ہوتے کہ ہمیں ہماری اولاد کی صحیح تربیت کا پورا پورا خیال ہے۔ تعلیمی دور میں چاروں بچوں میں سے صرف ایک واقعہ ہماری نظر سے گزرا۔ ہوا یوں کہ میرا ایک بیٹا ان دنوں پرائمری اسکول میں تھا۔ اس کی عمر تقریباً دس گیارہ سال کی ہوگی۔ ایک دن اسکول سے ہیڈ مسٹریس کا فون آیا کہ مسز حبیب میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ یہاں آجائیں تو بہتر ہوگا۔ میں فوراً پہنچی۔ مسز حبیب آپ کو پتہ ہے کہ بچوں کو اسکول میں صرف دس پینس لانے کی اجازت ہے۔ میں نے کہا کہ میڈم ہم نے آج تک اپنے بچوں کو دس پینس سے زیادہ نہیں دیا۔ ہمیں اسکول کے اصولوں کا بہت خیال ہے۔ وہ فوراً بولی میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ اور مسٹر حبیب اسکول کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے فوراً آپ کو بلالیا۔ بات یہ ہے کہ آج جب ہاف ٹائم ہوا جس میں بچے سامنے کی دکان سے جا کرسپ یا چاکلیٹ لاتے ہیں تو میں نے دیکھا کہ آپ کے بیٹے نے دس پینس کے بجائے پچاس پینس کی چاکلیٹ خریدیں۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دیکھیں۔ وہ دوسرے لڑکوں کو دے رہا

تھا۔ میں نے سوچا پہلے میں اس سے پوچھنے کی بجائے آپ سے معلوم کروں کہ کیا آپ نے اسے پچاس پینس نہیں دیتے تھے جو کہ مجھے یقین تھا کہ آپ نے نہیں دیئے ہوں گے۔ کبھی کبھی بڑے لڑکے چھوٹے لڑکوں پر دباؤ ڈال کر ایسی حرکتیں ان سے کرا لیتے ہیں۔ اب آپ گھر تشریف لے جائیں۔ میں اسے بلا کر خود پوچھ لوں گی اور جو بھی اسے تنگ کر رہا ہے اس کی خبر لوں گی۔ اس نے میرے جانے کے بعد لڑکے کو بلایا اور بعد میں مجھے فون پر بتادیا کہ ایک بڑے لڑکے نے اسے ڈرایا دھمکایا تھا کہ کل پچاس پینس لے کر آنا تو اس نے اپنے پاپا کی جیب سے بغیر بتائے لے لئے تھے۔ کیونکہ بتا کر تو وہ نہیں لے سکتا تھا۔ اب ہیڈ مسٹریس نے اس پر سختی سے نوٹس لیا کہ کوئی بھی چھوٹے بچوں کو اس طرح ڈرائے دھمکائے نہیں جب لڑکا گھر آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے بغیر بتائے کیوں لئے تھے۔ ہم سے کیوں نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے اس فعل پر سخت شرمندہ ہوا کہ وہ بار بار رو کر کہتا امی میرا یہ ہاتھ کاٹ دیں تاکہ میں آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کروں۔ میں نے اسے پیار کیا اور بہت تسلی دی کہ بیٹے غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے مگر آئندہ اس کا خیال رکھنا اور جو بھی شکایت ہو فوراً مجھے یا اپنی ٹیچر کو بتانا تاکہ تم ہر پریشانی سے حفاظت میں رہو۔ پھر اللہ پاک کا حد درجے فضل و کرم ہمارے اوپر رہا کہ بچوں کی شادیاں ہونے تک کسی بچے کی کوئی شکایت نہ آئی بلاشبہ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

غیب

سردیوں میں انگلینڈ کے دن بہت ہی مختصر ہوتے ہیں مگر گرمیوں میں دن اٹھارہ گھنٹے کا بن جاتا ہے۔ گرمیوں میں حبیب مارکیٹ سے واپس آتے تو پانچ بجے کے بعد بھی تقریباً" چار پانچ گھنٹے خوب روشنی رہتی۔ وہ ہمیں پہلے ہی کہہ دیتے کہ تیار رہنا۔ کھانا وغیرہ ساتھ رکھ لینا ہم باہر کہیں پکنک پر چلیں گے اور کھانا بھی وہیں جا کر کھائیں گے۔ بڑا ہی مزا آتا۔ راستے بھر ہم سب مل کر گاتے جاتے۔ بچوں کو اردو گانے تو قطعی آتے نہ تھے بس اسکول کی انگلش پوئم گاتے گاتے راستہ گزر جاتا۔ ہم سب کو ایک پوئم بہت پسند تھی جو ہم کورس میں گاتے اور خوب قہقہے لگاتے وہ یہ تھی۔

One Green Bottle Hanging on the Wall

اب میں اس کا دوسرا مصرعہ بھول گئی ہوں مگرون سے ٹو اور تھری ہو کر ہر مصرعے میں بوتلوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ جب Bottle کا لفظ آتا تو حبیب زور سے آواز نکالتے۔ ہم سب بے تحاشہ ہنس پڑتے۔ ساری گرمیاں اسی طرح گزرتیں۔ ہفتے میں تین چار دن تو ہم ضرور ہی باہر جاتے۔ بہت ہی

مزا آتا۔ ذرا سی بھی تنہائی ملتی تو میں اپنے رب سے اس بات کا شکر ادا کرتی اور ساتھ ساتھ دعا بھی کرتی رہتی اور دل ہی دل میں اللہ میاں کے سامنے اپنی صفائی بھی پیش کرتی جاتی کہ اللہ میاں بے شک آپ کی محبت سب سے اول ہے مگر رشتے بھی آپ نے ہی بنائے ہیں۔ اگر میاں بیوی میں محبت نہ ہو تو بچوں میں بھی نہیں رہتی۔ گھر کا ماحول درست رکھنے کے لئے میاں بیوی میں محبت ہونی لازمی ہے۔ غرضیکہ اب میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی کہ حبیب کی محبت میں کسی بھی طرح پرستش کا رنگ نہ آنے پائے۔

مغرب کے وقت چونکہ سب گھر میں ہوتے تھے تو حبیب ہمیشہ مغرب کی نماز باجماعت پڑھاتے۔ وہ بڑی خوبصورت قرات کرتے۔ سب بچے بڑے شوق سے نماز پڑھتے۔ رمضان میں حبیب اور میں پورے روزے رکھتے اس وجہ سے بچوں کو بھی شروع سے ہی روزے رکھنے کی عادت ہوگئی۔ بچے سحری میں اٹھ کر قرآن پڑھتے۔ غرضیکہ اللہ کے فضل و کرم سے گھر کا ماحول نہایت ہی پرسکون تھا۔ پھر میں بچوں کو آہستہ آہستہ ان کی سمجھ کے مطابق بتاتی رہتی کہ جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی کام کررہی ہے اور روح غیب میں دیکھ سکتی ہے۔ روح کی آنکھ سے ہم فرشتے اور اللہ تعالیٰ کا وہ نور جو غیب میں پھیلا ہوا ہے دیکھ سکتے ہیں۔ میرے بچوں کو احساس تھا کہ ان کی ماں کو غیب سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور ہے۔

پاکستان سے واپس آکر بھی ہمارا یہی ارادہ رہا کہ وہاں جس مکان کی تعمیر

شروع کی تھی اسے مکمل کرالیں اور جیسے ہی حالات بہتر ہوں واپس مستقل چلے جائیں۔ وہاں سے آنے کے تین سال بعد ہمارا مکان مکمل ہوگیا چونکہ برابر میں بہن بہنوئی رہتے تھے انہوں نے اس میں ساری محنت کی۔ مکان تیار ہوگیا تو انہوں نے کرائے پر چڑھا دیا۔ چند ماہ بعد گرمیوں میں ہم نے بہن کی بڑی بیٹی کو یہاں سیر تفریح کے لئے بلایا۔ اس نے اسی سال بی اے کیا تھا۔ دراصل ہم کسی نہ کسی طرح بہن بہنوئی کے حسن سلوک کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سوچا اور تو ہم کچھ نہیں کرسکتے ان کی بیٹی کو بلا کر انگلینڈ کی سیر ہی کرادیں۔ وہ یاد بھی بہت آتی تھی۔ میری بھانجی صرف چھ ہفتوں کے لئے آئی تھی گرمیوں کے لمبے لمبے دن' جولائی اگست میں یہاں چوبیس میں سے کم از کم بیس گھنٹے تو روشنی رہتی ہی ہے۔ سیر تفریح کے لئے یہ دن نہایت موزوں ہوتے ہیں۔ روزانہ شام کو کنٹری سائڈ گھومنے نکل جاتے اور اتوار کو جب حبیب کی سارے دن کی چھٹی ہوتی تو کہیں دور نکل جاتے۔

ایک دن گھومتے گھماتے پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے وہاں ہمیں ایک بورڈ پر Blue Johu Mine لکھا ہوا دکھائی دیا۔ یہ قیمتی پتھر کی کان ہے۔ یہ اسٹون زیورات میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم میں سے کسی نے بھی کبھی کان نہیں دیکھی تھی۔ طے یہ پایا کہ بس آج کا دن یہیں گزارا جائے۔ ہم سب کو کان کے اندر جانے کا اشتیاق ہوا۔ پہاڑ کے اندر نیچے ہی نیچے تقریباً" تین سو گیارہ یا تین سو تیرہ سیڑھیاں اتر کر کان آتی تھی۔ اندر پہنچے تو جگہ گیلی اور

بہت ہی پھسلن والی تھی۔ گائیڈ ہمارے ساتھ ساتھ ہمیں بتاتا جاتا اور دکھاتا جاتا تھا۔ پھسلن کی وجہ سے ہم سب ساتھ میں لگی ہوئی رسی کو پکڑ پکڑ کے سنبھل سنبھل کے چل رہے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں کوئی گر نہ جائے۔ اسی وقت میں نے زور سے سب کو کہا۔ بچو ذرا سنبھل کے چلو۔ ابھی جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اگلے ہی لمحے میں خود زمین پر چاروں شانے چیت پڑی تھی۔ گائیڈ اور حبیب نے فوراً" اٹھایا تکلیف کا تو قطعی احساس نہ ہوا البتہ ہنسی ضبط نہ ہوسکی۔ سارے بچے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بھانجی بولی آنٹی آپ نے اپنے آپ کو سنبھل کر چلنے کی نصیحت نہیں کی تھی۔ غرض یہ کہ بہت مزا آیا۔ میرے سارے کپڑے چکنی مٹی میں لتھڑ پتھڑ ہوگئے ہم اسی طرح گھومتے رہے اور ہنستے رہے۔ کان سے باہر نکلے تو ہماری ٹانگیں اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنے پر ہل ہل کر احتجاج کرنے لگیں۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ ہرے بھرے پہاڑوں پر صاف ستھری ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور سنہری دھوپ نے جہاں ہماری تھکن کو دس پندرہ منٹ کے اندر مٹا دیا وہیں میرے کپڑوں کو بھی سکھا دیا۔ بس اب صرف کپڑوں پر چکنی مٹی کے دھبے رہ گئے تھے جو رنگین کپڑوں پر بہت ہی نمایاں تھے۔ دن ابھی بہت باقی تھا۔ گھر بہت دور تھا۔ برطانوی معاشرے کا ایک وصف یہ ہے کہ کوئی کیسے بھی حلیے میں باہر نکل آئے کوئی ذرا بھی مذاق نہیں اڑاتا۔ یہی سوچ کر میں نے کہا چلو اب کہیں اور چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم کسی اور جگہ نکل آئے۔ شام تک اسی طرح گھومتے

پھرتے رہے۔ حبیب زیادہ تر ایسے مقامات پر لے جاتے جہاں تفریح کے ساتھ
ساتھ معلومات بھی حاصل ہوں جیسے میوزیم' آرٹ گیلری' پرانی عمارتیں اور
محلات۔ اس کے علاوہ خوبصورت پارک ہمارے پسندیدہ تفریحی مقام تھے۔
فطرت کے خوبصورت مناظر' جھیلوں اور پہاڑوں پر جانے کے لئے تو سب ہی
ہروقت تیار رہتے۔ پہاڑوں پر چڑھنے میں بڑا مزا آتا۔

یہ چھ ہفتے اس طرح گزرے جیسے چھ دن۔ بھانجی کے بہانے ہم نے بھی
انگلینڈ کا چپہ چپہ چھان مارا۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ بھانجی کو بی ایڈ کرنا تھا۔ اس
لئے وہ اور نہ رک سکی۔ ہمارے ذہن مطمئن تھے کہ رشتہ داروں کے نیک
سلوک پر ہم نے بھی اپنی جانب سے حتی الامکان انہیں خوش کرنے کی کوشش
کی ہے۔ دنیا میں ایک دوسرے سے تعلقات تو اسی طرح درست رہ سکتے ہیں
کہ دونوں جانب سے ایک دوسرے کا خیال رکھا جائے۔ اس لحاظ سے حبیب
بھی میرے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے رشتے
داروں کی عزت کرتے اور نہ ہی حبیب نے اپنے رشتہ داروں کا ضرورت سے
زیادہ خیال کیا نہ ہی میں نے۔ آج بھی میرا یہی نظریہ ہے کہ انسان کو تمام
رشتہ داروں کے ساتھ ایک بیلنس کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے چاہئے۔ اس
طرح سب کے ساتھ دوستی قائم رہتی ہے اور کسی کو شکایت نہیں رہتی۔

بھانجی کے جانے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد رمضان کا مہینہ شروع ہوگیا۔
حبیب کا معمول تھا کہ وہ سب سے پہلے سحری میں اٹھتے۔ پھر مجھے جگاتے اور پھر

ہم بچوں کو اٹھاتے۔ ان دنوں میری بیٹی چودہ سال کی تھی۔ رمضان سے کوئی
چھ ماہ پیشتر اس نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے چہرے کرخت ہیں وہ
بہت ہی حاسدانہ نظروں سے ان کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ بیٹی کو کچھ خبر نہیں
ہے وہ بیٹھی اپنا کام کررہی ہے اتنے میں ایک نور آکر بیٹی کو اپنے احاطے میں
لے لیتا ہے۔ یہ نور آسمان سے اترتا ہے اور جیسے ہی یہ نور میری بیٹی کے
اطراف میں پھیل جاتا ہے تو بیٹی کی توجہ اس طرف ہوتی ہے اس نور سے
آواز آتی ہے کہ دعائے جمیلہ کا نور تمہاری حفاظت کررہا ہے۔ تم ہر روز
دعائے جمیلہ پڑھا کرو۔ اس دن سے میری بیٹی ہر روز دعائے جمیلہ پڑھنے لگی۔
اسے اس پر بڑا اعتقاد ہے۔

ہاں تو اس رمضان میں یوں ہوا کہ ایک رات سحری میں حبیب جاگے۔
بیٹی کا کمرہ باتھ روم کے برابر تھا۔ باتھ روم سے واپس آئے تو مجھے جگایا۔ میں
نے کہا بیٹی کو اٹھایا کہنے لگے دروازے کے نیچے روشنی دکھائی دے رہی ہے وہ
اٹھی ہوئی ہے میں نے کہا اچھا۔ اب میں باتھ روم گئی میں نے بھی دیکھا کہ
بیٹی کے کمرے کے دروازے کے نیچے سے ٹیوب لائٹ کی طرح خوب روشن
لائٹ نظر آرہی ہے۔ مجھے بھی یہی خیال آیا کہ جاگ گئی ہے۔ میں نے اور
حبیب نے وضو کر کے پہلے تہجد کے نفل پڑھے پھر نیچے کچن میں جانے لگی تو
حبیب نے کہا کہ آواز نہیں آرہی۔ ذرا دیکھو تو کہیں لائٹ جلا کے دوبارہ تو
نہیں سوگئی۔ ہم دونوں اپنے کمرے سے باہر نکلے سامنے چند قدم پر ہی اس کا

کمرہ تھا۔ ہم دونوں اس کے کمرے کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے کے نیچے
سے مرکری جیسی لائٹ نکل رہی تھی۔ ایک لمحے کو ہم نے غور سے دیکھا۔
حبیب چونک کر بولے شامہ یہ کیسی لائٹ ہے میں بھی ایک دم سن سی ہوگئی پھر
مجھے خیال آیا کہ ہمارے یہاں تو کسی کمرے میں بھی ٹیوب لائٹ نہیں ہے۔
حبیب نہایت تیزی سے آگے بڑھے میں چپ چاپ اپنی جگہ کھڑی رہی انہوں
نے آہستہ سے دروازہ کھولا کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ بیٹی کے گہری نیند میں
زور زور سے سانس لینے کی آوازیں آنے لگیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ
سے دوبارہ دروازہ بند کردیا۔ میرے پاس آئے کہنے لگے وہ تو گہری نیند میں ہے
کمرے میں بالکل اندھیرا ہے میرے اندر سے آواز آئی یہ دعائے جمیلہ کا نور
تھا۔ میں نے حبیب سے کہا کہ دعائے جمیلہ کا نور اس کی حفاظت کررہا ہے۔

بعد میں میں نے سب بچوں کو بتایا کہ جب ہم اللہ کا کلام پڑھتے ہیں تو
اس کا نور ہمارے اندر داخل ہوجاتا ہے اور یہ نور ہر وقت ہماری حفاظت
سوتے اور جاگتے میں کرتا ہے۔ حبیب اس مشاہدہ پر بہت خوش ہوئے اور بعد
میں بیٹی سے اکثر پوچھتے رہتے کہ تم نے دعائے جمیلہ پڑھی وہ کہتی پاپا وہ تو میں
نے کب کی یاد کرلی ہے۔ اسے تو میں کبھی نہیں بھولتی۔ حبیب خود بھی اس دعا
کو اب اکثر پڑھنے لگے۔ اب دھیرے دھیرے ان کی سمجھ میں آنے لگا کہ ہر
انسان کے اندر روحانی صلاحیتیں موجود ہیں اور اگر کوشش کی جائے تو ان
صلاحیتوں سے کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ باطنی صلاحیت کو پہچاننا اور ان کا

استعمال محض مخصوص لوگوں یا صرف اولیاء اللہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ
اولیاء کرام ہمارے رہبر اور گائیڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے روحانی
تجربات ہمارے لئے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔

اس سال رمضان کے بعد مسلسل مجھ پر الہامی کیفیات طاری رہنے
لگیں۔ ان کیفیات کو میں قلمبند کرلیتی اور پاکستان میں بہن کو بھی بھجوا دیتی۔
غیبی مشاہدات کو اب میری عقل پہلے کی نسبت زیادہ بہتر سمجھنے لگی۔ مجھے اب
اپنی زندگی بامقصد دکھائی دینے لگی۔ دل کو یقین آگیا کہ غیب کو جاننے اور
روح کو پہچاننے کا تقاضا ایک نہ ایک دن ضرور پورا ہوگا۔ قرآن کے مفہوم
اور زیادہ سمجھ میں آنے لگے۔ میری تمام تر توجہ بال بچوں کی نگہداشت اور
روحانی علوم سیکھنے کی جانب ہوتی۔ لوگوں سے ملنے ملانے میں میرا قطعی دل نہ
لگتا۔ حبیب کا وقت بھی کام کے علاوہ گھر میں ہی گزرتا تھا۔

ہم دونوں کو بچوں کی صحیح تربیت کا بے حد خیال رہتا۔ اس سلسلے میں
مجھے اپنی ماں کا یہ قول کبھی نہیں بھولا کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اولاد
کی صحیح تربیت کرنا اس طرح ہے جیسے امانت کو احسن طور پر اس کے مالک
تک پہنچا دینا۔ اس کے علاوہ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں روحانی طرز فکر کا
بھی ہمیشہ دخل رہا۔ اس سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا ہے وہ بھی آپ کو سناتی
چلوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں انگلینڈ نئی نئی آئی تھی۔ یہاں آتے
ہی جلدی جلدی بچے ہوگئے۔ اس وقت اپنے لوگ بھی بہت کم تھے۔ خصوصاً

فیملی والے بہت ہی کم تھے۔ چند ایک گھر تھے بھی تو میں ان سے کم ہی ملتی تھی کیونکہ بال بچوں اور گھر کے کاموں سے جو وقت ملتا وہ قرآن پڑھنے اور نماز میں گزار دیتی۔ اس لئے میں خود کسی کے گھر نہ جاتی تھی۔ پھر سردیوں میں بچوں کو لے کر نکلنا بھی مشکل لگتا تھا۔ گاڑی بھی نہیں تھی۔ ان دنوں زندگی کی اتنی سہولتیں نہیں تھیں۔ کوئی بچہ سنبھالنے والا نہ تھا۔ اس لئے ہم اکٹھے کم ہی باہر جاتے تھے۔ ان دنوں ایک مرتبہ حبیب کے ساتھ مجھے باہر جانا پڑا۔ بچوں کو تنہا گھر میں چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ اس زمانے میں گھروں کو گرم رکھنے کے لئے کوئلے جلائے جاتے تھے۔ فائر پلیس کے سامنے لوہے کی جالی کی گارڈ بچوں کی حفاظت کے لئے لگا دی جاتی تھی۔ مجبوراً" میں نے کمرے میں بچوں کو اس طرح چھوڑا کہ چھوٹی بے بی کو پرام میں بٹھایا۔ دو لڑکوں کو بڑے سے ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر انہیں کہہ دیا کہ یہیں بیٹھے رہنا۔ لڑکی کو ان کے سامنے کرسی پر بٹھادیا۔ یہ ذرا بڑی تھی تقریباً" چھ سال کی۔ اسے ہدایت کر دی کہ بچوں کو ٹیبل سے اترنے نہ دینا۔ دو تین گھنٹے جب تک ہم باہر رہیں سارا وقت مجھے یوں لگا جیسے میں کمرے میں بچوں کو دیکھ رہی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ کمرے میں آگ جل رہی تھی۔ آگ بجھا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ شدید سردی تھی۔ ان مجبوریوں کے تحت انہیں اللہ کے سپرد کر کے چلے گئے۔ بلاشبہ اللہ سے بڑھ کر اور کوئی اپنے بندوں کی حفاظت کرنے والا نہیں ہے۔ گھر واپس آئے تو سب اسی طرح بیٹھے تھے جیسے چھوڑ گئی تھی۔ ہم

نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ایک دو مرتبہ اور اس قسم کا واقعہ ہوا مگر اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ہمیشہ حفاظت کی۔ مجھے یوں لگتا جیسے اپنی غیر موجودگی میں میں بچوں کو دیکھ رہی ہوں۔ اب میں سوچتی ہوں کہ بندے کا یقین ہی نظر بن کر غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ انسان نظر کے دونوں رخوں کو بیک وقت استعمال کر سکتا ہے۔ اگر اس کے اندر یقین کا پیٹرن بن جائے۔ زندگی کا اصل لطف اسی وقت آتا ہے جب زندگی کا ادراک ظاہر اور باطن دونوں رخوں میں ہوتا ہے۔ اب چاروں بچے اسکول جانے لگے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ مکان تو بن ہی چکا ہے۔ چند سالوں میں کچھ اور پیسے جمع کر کے مستقل طور پر پاکستان چلے جائیں گے۔ اس نظریے کے تحت میں گھر کے علاوہ باہر کے کاموں میں بھی پورا حصہ لیتی۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا روحانی واردات و کیفیات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ وارداتیں واضح طور پر غیب کے عالمین کی سیر تھیں۔ وارداتوں کا سلسلہ کچھ عرصہ چلتا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے لئے بند ہو جاتا تھا پھر خود بخود شروع ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ جب شروع ہوتا تو میری روح اس قدر خوش ہوتی کہ جی چاہتا کہ کبھی بھی بند نہ ہو۔ مگر جب رک جاتا تو مجھے سخت تکلیف ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے میرے اور اللہ کے درمیان ایک پردہ آگیا ہے۔ میں نماز اور قرآن پڑھتی مگر وہ مزہ نہ آتا۔ ایک مرتبہ مسلسل کئی دنوں تک لاشعوری حواس مجھ پر غالب رہے۔ ان دنوں مجھے یہ محسوس ہوا جیسے مجھ سے حساب کتاب لیا جا رہا ہے۔ تین دنوں تک میں اپنی روح کو حساب کتاب میں

دیکھتی رہی۔ اس سے اب تک کی زندگی کا حساب کتاب لیا جا رہا تھا۔ خاص خاص باتیں خاص واقعات جو زندگی کے لئے اہم تھے ان اہم امور میں ارادے کے فیصلوں کی پوچھ گچھ کی گئی۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب میری روحانی تربیت کا ایک دور ہے۔ اس دور میں مجھے آئندہ زندگی میں پیش آنے والے مراحل سے گزارا جارہا ہے تاکہ شعور ان مراحل کو پہچان لے۔ اس وقت ان روحانی واردات کا میں نے یہ مفہوم لیا کہ روح کی نظر لوح محفوظ کی تحریر کو پڑھتی ہے اور لوح محفوظ کے احکامات پر عمل کرتی ہے تین دن بعد جب یہ مرحلہ ختم ہوا تو مجھ پر سے لاشعوری حواس کا غلبہ بھی کم ہوگیا۔

ان دنوں میں جتنی سنجیدہ تھی اب اتنی ہی خوشی محسوس کرتی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ غیب کو جاننے کی خواہش اب آہستہ آہستہ پوری ہو رہی ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوتا سب سے پہلے حبیب کو بتاتی اور پھر پاکستان بہن کو خط میں لکھ دیتی۔ ان واردات و مشاہدات سے متعلق قرآن میں آیات تلاش کرلیتی کیونکہ قرآن کے حوالے سے بہت جلد عقل میں بات آجاتی ہے اور سمجھائی بھی جاسکتی ہے۔ اب اکثر دن میں جب کوئی بھی گھر میں نہ ہوتا میرے سوائے تو ان روحانی مشاہدات و واردات میں تیزی آجاتی۔ کبھی شعور پر تجلیات و انوار کا نزول اس طرح ہوتا کہ ایک لمحے کو شعوری حواس اپنی سکت کھو بیٹھتے۔ کبھی سارے گھر میں فرشتے دکھائی دیتے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ میں جانتی تھی کہ غیب کے علوم جاننے کے لئے شعوری سکت کا

ہونا بے حد ضروری ہے۔ بس میری ہر وقت دعا یہی تھی کہ حبیب اور بچوں کے سامنے بالکل نارمل رہوں۔ اس کے لئے میں پوری پوری کوشش کرتی تھی اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ میرے اندر کیا قیامت برپا ہے۔

عام طور سے یہ ہوتا کہ جیسے ہی مجھ سے کوئی بات کرتا فوراً" ہی میرے دل کے اندر سے روح کی آواز آتی جو اس بات کا جواب دیتی پھر میں زبان سے وہ بات کہتی جو لوگوں کے ذہن اور شعور و مزاج کے مطابق ہوتی۔ مجھے اس بات کا بے انتہا خیال رہتا کہ کوئی میری بات سے رنجیدہ نہ ہوجائے۔ اس طرح بہت سی وہ باتیں جو حقیقت تھیں میں چھپا جاتی۔ مجھے اس وقت یہ احساس ہوجاتا کہ اس وقت اس بات کا افشا دوسرے کے لئے فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہ بات بھی ذہن میں آتی کہ روح کی یہ صلاحیت اور یہ شعور ہر کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے مجھے وہی بات کرنی چاہئے جو لوگوں کے ذہن کے مطابق ہے۔ مگر جب آپ کو یہ معلوم ہوجائے کہ کوئی آپ کی زبان نہیں سمجھ رہا ہے تو آپ اپنے آپ کو دوسرے کی موجودگی میں بھی تنہا محسوس کرتے ہیں۔ تنہائی کا یہی خیال ہر وقت اللہ تعالیٰ سے منسلک رہنے پر اکساتا ہے۔ کیونکہ انسان تنہا رہ ہی نہیں سکتا۔ پھر تصور میں جس کا خیال ہوگا اس کی انس و محبت ہی دل میں جاگزیں ہوگی۔

حبیب جب سے انگلینڈ آئے تھے پاکستان نہیں گئے تھے۔ انہیں پندرہ سال ہوچکے تھے ہم نے ارادہ کیا کہ اب مستقل طور پر وہاں جاکر رہتے ہیں۔

اس کے لئے تمام انتظامات کرلئے اور یہاں کا مکان کرائے پر دے کر واپس روانہ ہوئے۔ ہم نے سوچا کہ ایک دفعہ کوشش کر کے دیکھیں اپنے وطن اپنے رشتہ داروں میں رہنے کی تمنا تو سب کو ہی ہوتی ہے۔ ہمیں پوری امید تھی کہ ہم وہاں جا کر سیٹ ہوجائیں گے۔ پھر بھی ہم ذہنی طور پر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ لہٰذا ابتداء یہ ہوئی کہ ہمارے مکان کا آدھا پورشن کرائے دار خالی نہ کرتے تھے اس کے لئے حبیب نے بڑی حکمت عملی سے کام لیا اور بالاخر چند ماہ میں مکان خالی کرالیا۔ گو اس میں ہماری عزت نفس پر خاصی ضربیں لگیں مگر ہمیں پتہ چل گیا کہ زمانہ کتنا آگے نکل چکا ہے اور ابھی تک ہم پندرہ سال پہلے کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں۔

مکان خالی کرانے کی بھی ایک دلچسپ اسٹوری ہے جو ہماری زندگی کا ایک کٹھن تجربہ تھا۔ قصہ یوں ہے کہ کرایہ دار نہایت اچھے عہدے پر معمور بااثر و رسوخ آدمی تھے۔ انہیں تقریباً" ایک سال پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ مکان خالی کرنا ہے۔ ہر ماہ انہیں یاد دہانی کرائی جاتی کہ فلاں ماہ میں مکان خالی چاہئے کیونکہ مالک مکان کا اب مستقل رہنے کا ارادہ ہے وہ بہت فراخ دلی کے ساتھ اقرار کرتے رہے کہ ہم بروقت مکان خالی کردیں گے۔ جب ہم یہاں سے سمیٹ سماٹ کر وہاں گئے تو انہوں نے قطعی انکار کردیا بلکہ دھمکی دی کہ کرلو جو کچھ کرنا ہے۔ مکان تم ہم سے خالی نہیں کراسکتے۔ عجیب صورت حال تھی۔ ہم کچھ دن برابر میں بہن کے یہاں ٹھہرے۔ پھر چند دن بعد پیچھے کے دو

کمروں میں نہایت شریف لوگ تھے جنہوں نے وعدہ کے مطابق مکان خالی کردیا۔ ہم اس میں آن بیٹھے۔ مگر ان لوگوں کو یہ بھی گوارہ نہ تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ نہایت ہی تیز طرار خاتون تھیں۔ وہ ٹھیک صبح دس بجے سے شروع ہوجاتیں اور نہایت ہی نستعلیق زبان میں گالیاں دینی شروع کردیتیں۔ ان کی آواز ماشاء اللہ خود لاؤڈ اسپیکر تھی۔ پہلے دن جب ہم نے لب لعلین سے یہ گلہائے رنگین جھڑتے سنے تو ذہن نے قبول ہی نہ کیا کہ یہ خاطر و مدارات ہم جیسے خاک نشینوں کے لئے ہے مگر پھر دوسرے دن تیسرے دن جب ٹھیک دس بجے ان کا رنگا رنگ پروگرام شروع ہوجاتا اور محلے کی کھڑکیوں سے لوگ جھانکتے دکھائی دیتے تو پتہ چلا کہ یہ ساری عنایات ہمارے ہی اعزاز میں ہیں۔

زندگی کا پہلا پہلا تجربہ تھا۔ پتہ چلا کہ پندرہ سال انگلینڈ میں رہ کر ہم اردو زبان کے بہت بڑے ذخیرے کو بھلا چکے ہیں۔ ادھر ان کی دشنام طرازیاں شروع ہوتیں ادھر ہمیں یوں لگتا جیسے ایک ایک کر کے ہماری سننے والی حسیں بند ہوتی جارہی ہیں۔ ہم چپ چاپ کمرے میں بند ہوکر بیٹھ جاتے۔ ہمارے تمام حواس جیسے سن ہوجاتے۔ میری بہن اور کئی پڑوسیوں نے مشورہ دیا کہ آپ کیوں اس قدر ڈرتے ہیں۔ گالیوں کا جواب گالیوں سے کیوں نہیں دیتے۔ میں اور حبیب مسکرا دیتے اور یہی کہتے کہ اگر ہم نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے جو الفاظ ہمارے شیشہ دل پر تازیانہ بن کر برستے ہیں تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔ کبھی نہ کبھی تو ان کی بھڑاس نکل ہی جائے گی۔

تقریباً چار پانچ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ میرا تو اب یہ عالم تھا کہ جب ان کی گالیوں کی آواز کان میں آتی تو دل کہہ اٹھتا اے حوا کی بیٹی! اے میری ماں جائی! یہ آزمائش صرف میری ہی نہیں تیری بھی ہے۔ قدرت تو دونوں کے زور بازو آزما رہی ہے۔ رب کی نگاہ سب پر یکساں ہے۔ ان چار پانچ ماہ میں حبیب نے پورے محلّہ والوں سے دوستانہ تعلقات بڑھا لئے۔ شریف طبع تو وہ شروع سے ہی تھے۔ اس معاملہ میں انہوں نے نہایت ہی عقل مندی اور ٹھنڈ مزاجی کا ثبوت دیا۔ سارے محلّہ والے جان گئے کہ یہ بالکل بے ضرر سے لوگ ہیں۔ اب تمام محلّہ والوں نے ان کو کہنا شروع کردیا کہ ایسے شریف لوگوں کو گالیوں سے نوازنا کہاں کی شرافت ہے۔ اب خود وہ بھی اس یک طرفہ کاروائی سے اکتا چکی تھیں۔ اب ان کے اس روٹین پروگرام میں کچھ کچھ بے قاعدگیاں ہونے لگیں۔ گالی گفتار کچھ کم ہوگئی۔

ایک دن بروز جمعرات صبح صبح چاروں بچے اسکول گئے۔ میں ابھی بیٹھی ہی تھی۔ حبیب بھی باہر چلے گئے تھے کہ اچانک میرے اوپر الہامی کیفیات طاری ہوگئیں۔ مجھے حکم ہوا کہ اسی وقت اٹھو اور دو رکعت نماز پڑھو۔ پہلی رکعت میں ۱۰۰ دفعہ سورہ اخلاص اور دوسری رکعت میں ۱۰۰ دفعہ سورہ کوثر پڑھو۔ میں نے اسی وقت وضو کیا اور نفل پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ نماز میں سارا وقت مجھے حضوری کی سی کیفیت رہی۔ جیسے اللہ پاک نہایت ہی قریب سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ نماز کے فوراً ہی بعد مجھے حکم ہوا کہ بی بی فاطمہؓ کے نام

کی نیاز آج ہی بانٹ دو۔ اس کے بعد مجھے گھر میں ہر طرف نور دکھائی دیا۔ کھلی آنکھوں سے روح کی نگاہ ہر طرف نور کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف گھوم کر اس نور کا زبان سے اقرار کیا۔ اس کے فوراً بعد میری زبان جیسے بند ہوگئی۔ حکم ہوا بس اب تم تین دن تک کسی سے بات نہیں کروگی اور مسلسل تین دن روزہ رکھو گی۔ ان تین دنوں میں ضرورت کے تحت اشاروں میں بات کرسکتی ہو یا لکھ کر۔ یہ تین دن تمہارے اعتکاف کے ہیں۔ میں نے اسی وقت ایک پرچہ پر لکھا تاکہ برابر سے جب بہن آئے تو انہیں یہ پرچہ تھما دوں اور وہ میرے بال بچوں کی ضرورت کا انتظام کردیں اور مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ پردے کے لئے چادر تان لی اور اعتکاف میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں بہن ملنے آئیں۔ برابر میں گھر ہونے کی وجہ سے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ آئیں تو میں نے پرچہ انہیں تھما دیا۔ اس میں لکھ دیا کہ بال بچوں کے لئے کھانے پینے کا انتظام ان تین دنوں میں کرلینا۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور اللہ کا شکر ادا کیا اور تسلی دی کہ تم فکر نہ کرو۔ سب کام ہوجائے گا۔ میں بچوں کو ان تین دنوں میں اپنے گھر رکھوں گی تاکہ تم اطمینان سے عبادت کرسکو۔ اسی دوران میں نور کا مشاہدہ کرتی رہی۔

آخری دن روزے کی افطاری میں بہن نے کافی اہتمام کیا۔ سب لوگ بے حد خوش تھے۔ بہن کھانا پکا کر میرے گھر ہی لے آئیں۔ ان کے خاندان اور میرے بال بچوں نے سب نے مل کر کھایا سب بہت خوش تھے۔ مجھ سے تو

کچھ کھایا نہ گیا۔ بس ذرا سی پتلی کھچڑی اور جوس پی سکی۔ اس وقت میری بیٹی نے بتایا کہ امی جس دن آپ نے روزہ شروع کیا اس رات میں نے خواب میں حضرت بی بی فاطمہؓ کی زیارت کی۔ میں نے بہن کو اسی دن لکھ دیا تھا کہ بی بی فاطمہؓ کے نام کی نیاز بانٹ دیں۔ انہوں نے فوراً بانٹ دی۔ اب میں نے بھی اعتکاف سے فارغ ہو کر ان کے نام کی نیاز بانٹی اور اللہ پاک کی نظر کرم کے لئے شکر ادا کیا۔

دوسرے دن حبیب کہنے لگے کہ میں آج پھر ان کرایہ دار کے پاس جاتا ہوں اب وہ کیا کہتے ہیں۔ حبیب ان کے پاس گئے تو اس مرتبہ وہ صاحب خاصی نرمی سے پیش آئے۔ بولے ہمارا مکان بن رہا ہے مکمل ہو جائے تو چلے جائیں گے۔ اگلے تین ماہ حبیب نے ان کے مکان کو بنوانے میں لگا دیئے۔ اس طرح وہ جو جو بہانہ کرتے کہ یہ نہیں ہے وہ نہیں ملتا، فرصت نہیں، حبیب اور میرا بھانجا مل کر ان کے لئے دوڑ دھوپ کر کے وہ کام کر دیتے۔ میرے بہن بہنوئی اور ملنے جلنے والے سخت حیران تھے کہ انگلینڈ سے آکر بچارے کن دھندوں میں پڑ گئے۔ مگر حبیب کہتے کہ میں نے وکیل سے بھی بات کر لی ہے وہ یہی کہتا ہے کہ کورٹ کے ذریعے مکان بیس سال میں بھی خالی نہ ہو سکے گا۔ وہ شخص قانون کی تمام موشگافیوں سے واقف ہے اور پھر اثر و رسوخ والے بندے کے لئے تو اکثر ناجائز کام بھی جائز ہو سکتا ہے۔ اس لئے سوائے دوستانہ ماحول کے اور کسی حالت میں مکان خالی کرانا ممکن نہیں ہے۔

ہم سب کو پورا یقین تھا کہ اللہ پاک اپنا فضل کرنے والے ہیں۔ ان کا مکان بن گیا تو کہا کہ پنکھے لگیں گے تو جائیں گے۔ خیر حبیب نے زور لگوا کر خود اپنے ساتھ لے جا کر پنکھے دلوائے تو اب انہیں فکس کرنے والا الیکٹریشن نہیں ملتا تھا۔ حبیب نے اور میرے بھانجے نے مل کر خود ہی پنکھے لگائے۔ کچھ نہ پوچھیں کیا کیا نہ کرنا پڑا۔ روز روز جانے اور ملنے سے حبیب کی دوستی ان لوگوں سے ہو گئی۔ دوستی بھی مجبوری تھی۔ حبیب اس قدر محبت اور نرمی سے پیش آئے کہ وہ لوگ بھی مجبور ہو گئے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے۔ سارے محلے میں خبریں پھیل گئیں۔ بہرحال حبیب نے انہیں مکان چھوڑنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ ہر شخص اب یہی کہتا کہ نو مہینے میں مکان خالی کرا لینا واقعی آپ کا کمال ہے۔ حتیٰ کہ وکیل نے بھی یہی کہا کہ اس کیس کو میں پندرہ سال تک بڑی آسانی سے کھینچ سکتا تھا مگر سچ تو یہ ہے کہ اللہ حق ہے اور حق کی پاسداری کرنا اس کا کام ہے۔

شکر

اپنا مکان خالی کرانے کے سلسلے میں نو ماہ مسلسل ذہنی دباؤ سے نجات پا کر ہم نے سکون کا سانس لیا۔ ہم دونوں اس بات پر بہت مطمئن تھے کہ ہم نے کبھی ان سے ترش کلامی کا جواباً" ارادہ نہیں کیا۔ میں سوچتی کارخانہ قدرت میں سب اپنا اپنا کردار نبھا رہے ہیں۔ سب پر اللہ کی نظر ہے۔ کوئی اللہ کی نظر سے نور کی لطافت و ٹھنڈک جذب کرتا ہے۔ کوئی اللہ کی نظر سے اس کے جلال و عظمت کی تپش جذب کرلیتا ہے۔ نور کی لطافت بندے کے اندر سکت پیدا کرتی ہے اور جلال کی روشنی بندے کے حواس پر دباؤ ڈالتی ہے۔

میں سوچتی ہم حقیقت کو جانتے ہوئے بھی حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے ظاہر باطن دونوں پر اس کی نظر یکساں طور پر کام کررہی ہے۔ پھر اس کی موجودگی کو ہم کیسے نظرانداز کردیتے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے دلوں کو اس کی موجودگی کا پختہ یقین ہوتا تو اس کی رضا کے خلاف اعمال پر کیوں قائم رہتے۔

ہمارے لئے یہ واقعہ قدرت کی جانب سے یقین اور بے یقینی کا عملی اور تجرباتی درس تھا۔ قدرت ہمیں مزید آزمائشوں سے گزارنا چاہتی تھی۔

گھر تو سیٹ ہوگیا تھا مگر ملک کے ناگفتہ حالات نے کاروبار سیٹ نہ ہونے دیا۔ ڈیڑھ سال کے اندر تمام سرمایہ ختم ہوگیا۔ تو ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اب یہاں سیٹ ہونے کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ ہمارے لئے انگلینڈ بہتر رہے گا۔ طے یہ پایا کہ پہلے حبیب اور بڑا لڑکا جائیں گے۔ پھر میں اور تینوں بچے آجائیں گے۔ انگلینڈ کا مکان کرایہ پر دیا تھا۔ جو چند ماہ میں خالی ہونے والا تھا۔ پہلے دونوں باپ بیٹے گئے۔ یہاں پر مکان کا دو سال کا کرایہ جمع تھا اس سے ایک چھوٹا مکان خریدا اور پہلے والا مکان مزید ایک سال کے لئے کرائے پر دے دیا اور حبیب نے ہم سب کو بلالیا۔ تین چار ماہ بعد ہم سب ہی واپس آئے۔ یہ مکان بہت چھوٹا تھا۔ اس میں فرنیچر بھی نہیں تھا۔ کارپٹ بھی نہیں تھے۔ آتے ہی سارے بچے خود ہی بغیر بتائے سارے سچویشن کو سمجھ گئے۔ سب نے اسکول سے آکر شام کے وقت پارٹ ٹائم جاب کرلی۔ میں نے بھی ایک جگہ نوکری ڈھونڈلی۔ اس طرح ہم سب یہاں دوبارہ سیٹ ہونے کے لئے مل کر کوشش کرنے لگے۔

ابھی آئے ہوئے تین چار ہفتے ہی ہوئے تھے۔ ایک دن ایک بیٹا بڑی حسرت سے کہنے لگا امی وہاں ہمارا کتنا بڑا گھر تھا۔ کتنے اچھے صوفے تھے۔ یہاں تو بیٹھنے کو ایک کرسی بھی نہیں ہے۔ بیٹے کی بات سن کر میں ایک انجانے خوف

سے لرز اٹھی۔ میں نے چاروں بچوں کو پاس بلایا۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ
بیٹے جب ہم پہلے دن وہاں گئے تھے تو وہاں بھی سامان نہ تھا۔ فرنیچر کارپٹ
وغیرہ نہیں تھے۔ پھر ہم نے خریدے۔ گھر سیٹ ہوگیا۔ اب یہاں آئے ہیں تو
پھر وہی حال ہے ہم محنت سے کام کریں گے۔ جمع کر کے ضرورت کا سامان
خرید لیں گے۔ زندگی تو ایسے ہی چلتی رہتی ہے۔ لیکن اگر تم لوگ گذشتہ
چھوڑے ہوئے سازوسامان کو یاد کرتے رہو گے تو موجودہ زندگی میں ملنے والی
نعمتوں کو حقیر سمجھنے لگو گے۔ ذرا سوچو۔ اگر ہمیں فوراً" یہ مکان اللہ نہ دیتا تو
ہم اس سے بھی زیادہ پریشان ہوتے۔ خبردار آج کے بعد وہاں کا ذکر نہ کرنا۔
جو چھوٹ گیا۔ چھوٹ گیا۔ جو پاس ہے وہی سب کچھ ہے۔ ان نعمتوں کے لئے
اللہ کا شکر کرتے رہو۔ اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس دن کے بعد پھر کبھی
بچوں نے اس گھر کا ذکر بھی نہ کیا۔ جیسے سب کچھ ان کے ذہن سے نکل گیا
تھا۔ ہم سب نے مل جل کر بہت جلد یہاں بھی گھر سیٹ کرلیا۔

سال بعد اپنا پرانا گھر خالی ہوگیا۔ بچے اپنی اپنی پڑھائی میں لگ گئے۔
حبیب نے اپنی دکان سنبھال لی۔ زندگی پھر اپنے ٹریک پر چلنے لگی۔ میں اکثر
سوچتی کہ گھر میں سکون کی فضا ہو تو زندگی کتنی آسان ہوجاتی ہے۔ اس بار
پاکستان سے آکر ہم سب نے یہ بات محسوس کی کہ انسان ہر جگہ اور ہر حال
میں پرسکون رہ سکتا ہے۔ حبیب کا بھی یہی کہنا تھا کہ ہمارے بچے ایسٹ اور
ویسٹ دونوں ماحول سے مانوس ہوچکے ہیں۔ دونوں کے فرق سے آگاہ ہوچکے

ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ اب بجائے اس کے کہ بچوں کی طرز فکر صرف مغربی
ہوجائے اور وہ مغربی ماحول میں پوری طرح گم ہوجائیں ان کی طرز زندگی میں
مشرقیت بھی گھل مل گئی ہے۔ اس طرح وہ اپنے نسلی افتخار اور مذہبی وقار کو
قائم رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں گذشتہ ناکامیوں کا ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ ہمارے
لئے زندگی کی ہر حرکت ایک عملی تجربہ تھی اور ہماری نگاہ اس تجربے سے
حاصل ہونے والے نتیجے کی جانب رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم سب ہر حال
میں خوش باش رہتے تھے۔

پاکستان سے واپس آکر تقریباً" ایک سال تو ہم سب کی توجہ زیادہ تر
دنیاوی ضروریات کی جانب لگی رہی جو اس وقت کے تقاضے کے عین مطابق
تھا۔ رمضان کا مہینہ آیا تو عملی طور پر ذہن زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی جانب
لگ گیا۔ اس دوران پھر وہی کشف واردات ہونے لگیں مگر یہ مستقل نہ
تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ہفتے میں چھ دن صبح سے شام تک Job
پر ہوتی تھی۔ ارادے میں یہی تھا کہ پھر پہلے کی طرح سیٹ ہوجائیں تو دھیان
بھی اسی طرف رہتا تھا۔ مگر اب میرے دل کو پکا یقین تھا کہ اللہ پاک مجھے جو
خصوصی علوم عطا کرنا چاہتے ہیں اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اور اب سے
دس بارہ سال پہلے جو پیشگوئیاں کی گئی تھیں ان کے پورے ہونے کا وقت
قریب آگیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بال بچوں سمیت پوری توجہ گھر بار
سیٹ کرنے میں لگا دی تھی تاکہ بعد میں اطمینان سے سارا دھیان اور وقت

ان علوم کے سیکھنے میں صرف کردوں۔ میرا جی ہر وقت یہی چاہتا کہ جلدی سے یہ کام ختم ہوں اور میں پوری توجہ پھر روحانی علوم کی جانب لگادوں۔ رمضان بھی گزر گیا بقرعید بھی گئی اور محرم آگیا۔ یہ ماہ میرے لئے نہایت ہی مبارک ثابت ہوا۔ ویسے بھی اب حالات معمول پر تھے اور چھ دن کام کرنے کے باوجود میرا ذہن مطمئن تھا اب میں نے دوبارہ قرآن باترجمہ پڑھنے اور اس میں غور و فکر کرنے کا روٹین بنالیا۔ ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو روحانی صلاحیتوں کے بارے میں بتاتی رہی کہ ہر انسان کے اندر یہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اللہ نے انسان کو اسی لئے دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ ان پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ یہ صلاحیتیں اسی وقت بیدار ہوتی ہیں جب ذہن و قلب شفاف آئینے کی طرح صاف اور پاک ہو۔ قرآن پڑھ کر مفہوم بھی ذہن میں آتے وہ تو میں ہمیشہ ہی حبیب کو بتاتی تھی۔

اب روزانہ کا پھر دوبارہ یہی معمول بن گیا۔ دل کو تسلی ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے روح کے کندھوں سے دنیا کا بوجھ کم ہوگیا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہی ہے۔

محرم کے مہینے میں ایک دن قرآن کی آیات میں غور کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں بار بار خیال آرہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضور پاکؐ کا رتبہ کیا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ حضور پاکؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں مگر میرا جی چاہتا تھا کہ میں آپؐ کے اندر موجود انوار و تجلیات کا

مشاہدہ کروں۔ میرے اندر شدت سے یہ بات جاننے کا تقاضہ پیدا ہوا کہ اللہ نے جو ایک بندے کو اپنا محبوب کہا ہے تو محبوبیت کی عظمت کیا ہے۔ میرا جی چاہتا کاش میں اس عظمت کو جان لوں۔ مجھے اب بھی وہ لمحہ واضح طور پر یاد ہے جب رات کے وقت میں قرآن پڑھ رہی تھی۔ سورہ نجم میں حضور پاکؐ کے معراج کا ذکر ہے۔ اس کے اندر حضور پاکؐ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے سے قریب تر کرلیا تھا اور آپؐ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کی تھیں۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے عشق کی ڈور سے بندھا پایا تھا۔ میں قلبی طور پر اس بات سے واقف تھی کہ یہی ڈور میری زندگی کا وہ راستہ ہے جس پر چڑھ کر مجھے اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے۔ عشق کی تکمیل وصال محبوب ہے اور جب تک وصال نصیب نہیں ہوتا۔ عاشق کا گزر آگ کے شعلوں کے درمیان سے ہے۔

قرآن میں محبوبؐ سے راز و نیاز کا ذکر پڑھ کر عشق کی سلگتی آگ ایک جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑی۔ دل بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگیا۔ روح نے عظمت حبیبؐ کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیئے اور ادب کے مقام پر سوال کیا۔ اے میرے رب محبوبیت کی شان دکھلا۔ یہ ایک عجیب تقاضہ تھا۔ شاید میری روح رحمت اللعالمینؐ کے انوار سے اپنے عشق کی آگ بجھانا چاہتی تھی۔ وہ محبوبیت کے آداب اپنے پیغمبر سے سیکھنا چاہتی تھی۔ روح کا بادی تو پیغمبر ہی ہے اس لمحے حقیقت رسول اکرمؐ دل پر ظاہر ہوئی۔ آپؐ کی نگاہ شوق ذات

باری تعالیٰ کے نور کی بلندیوں کو چھوتی دکھائی دی۔ میری روح اور میرے دل نے اعتراف کیا کہ آپؐ کی شان عظمت درحقیقت سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔

اس کے بعد مسلسل مشاہداتی تعلیم کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ماں کے رحم کے اندر بچے کی تخلیق اور اس کے حواس کے مختلف مراحل دکھائے گئے۔ قرآن میں غور کرنے سے جو جو سوالات میرے ذہن میں اٹھتے ان کا جواب مجھے میری عقل کی سکت کے مطابق مل جاتا۔ میں جان گئی کہ مجھ پر اللہ پاک کے محبوبؐ کی رحمت نے احاطہ کرلیا ہے۔ تیسرے دن مجھے روزانہ تہجد کے وقت عبادت کرنے کا حکم دیا گیا اور روزے رکھنے' زیادہ دیر تک جاگنے کا حکم دیا گیا۔ اس مرتبہ حبیب پہلے سے کہیں زیادہ میری ان روحانی کیفیات میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا تعاون کیا۔

ان دنوں میں مسلسل لاشعوری حواس میں رہتی۔ رات کے بارہ بجے میں نیچے ایک مخصوص کمرے میں آجاتی اور تیسرے دن سے مجھے مشاہدہ کرایا گیا۔ ہر روز رات کو صبح فجر تک یہی سلسلہ چلتا۔ مجھ پر روزن ایک ایک کر کے کھولے جاتے اور ان روزن سے انوار شعور میں منتقل اور جذب کئے جاتے اور ان انوار و تجلیات کی صفات اور شناخت سے آگاہی کرائی جاتی۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں مردہ ہوں۔ میرے شعور میں کوئی خیال نہ آتا۔ ذہن قطعی طور پر خالی رہتا۔ بس لاشعوری طور پر یہ تعلیمی سلسلہ

جاری رہتا۔ اس دوران مجھے یہ بات بتائی گئی کہ تمہاری ماں کو نور کی حقیقت جاننے کا بہت اشتیاق تھا۔ اسی لگن میں وہ نور نامہ بہت شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔ ان ہی کی دعا سے تمہیں یہ علوم دیئے جا رہے ہیں۔ ان علوم کے دوران کئی مرتبہ مجھے یہی بات بتائی گئی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ ماں باپ اولاد کے اندر اپنی فکر کے بیج بوتے ہیں۔ گر بیج اچھا اور زمین زرخیز ہو تو تخلیق کا عمل اپنے مراحل طے کرتا ہوا تناور درخت بن جاتا ہے۔ وگرنہ نشوونما راستے میں ہی رک جاتی ہے۔ ماں کے رتبے کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کو بہت بڑا درجہ دیا ہے مگر اب یہ حکمت معلوم ہوئی کہ ماں کا رتبہ کیوں بڑا ہے۔ اس لئے کہ ماں بچے کے اندر اپنی فکر اور ارادہ منتقل کرتی ہے۔ پھر یہی فکر تکمیلی مراحل کو پہنچ کر بچے کے ذریعے ظہور میں آجاتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر پھر ایک بار میرے دل نے عہد کیا اے ماں میں انشاء اللہ تیری خوشبو سے سارے جہاں کو مہکا دوں گی۔ میں ہی وہ خوشبو دان ہوں جو تیری خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ میرا دل ماں کے احسانوں کے آگے جھک گیا۔

میں نے حبیب کو اور بچوں کو ماں کے رتبے اور درجات کے متعلق بتایا کہ ماں باپ کو خوش رکھنے سے ماں باپ اولاد کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دعائیں اللہ کے یہاں مقبول ہو کر اولاد کے لئے نجات کا باعث بنتی ہیں۔ حبیب یہ سن کر فوراً" بول اٹھے۔ ضرور میری ماں نے مجھ سے خوش ہو کر کبھی

مجھے اچھی سی دعا دی ہوگی۔ جس کے نتیجہ میں مجھے تم ملیں۔ میں خوشی سے ہنس پڑی۔ سارے بچے خوش ہوگئے۔ مجھے یوں لگا جیسے ہماری مائیں بھی ہماری خوشی میں شامل ہیں۔

اس نور کے علوم کے ساتھ ساتھ مجھے سانس کی مشقیں بھی کرائی جاتیں۔ رات کے بارہ بجے سے میں نیچے کمرے میں آجاتی۔ پھر جس طرح عبادت کرائی جاتی اسی طرح کرتی۔ یوں لگتا جیسے میری عقل یا ارادہ بالکل سلب ہوچکا ہے۔ بس جو کچھ انفارمیشن دماغ میں آتی اس پر عمل ہوتا۔ بلکہ میری تو اس طرح سمجھ میں آتا تھا کہ میری عقل یا شعور سلب کرلیا گیا ہے اور دل کے اندر کوئی حکم دیتا جا رہا ہے اور اس حکم کے مطابق میرے تمام اعضاء عمل کررہے ہیں۔ یہ حکم اللہ کی جانب سے ہے۔ نفل نماز تو زیادہ تر صرف دو رکعت ہی پڑھتی مگر پھر مصلے پر بیٹھ کر مراقبہ میں چلی جاتی یا پھر کھڑے ہو کر اللہ پاک کی بارگاہ میں قیام ہوتا جس میں دھیان مسلسل لاشعور کی جانب لگ جاتا اور کیفیات و واردات مشاہدے میں آتیں۔ یہاں تک کہ جب جسمانی حواس کا تذکرہ آتا تو جسمانی حصوں کے ذریعے بھی مشاہدہ کرایا جاتا۔ مثلاً خوشبو، رنگ، ذائقہ، لمس وغیرہ۔

انوار کی منتقلی اور مشاہدے سے پہلے مجھے سانس لینے کے لئے کہا جاتا۔ مجھے حکم ہوتا کہ میں لیٹ جاؤں۔ میں کمرے میں بچھے ہوئے بڑے صوفے پر چت لیٹ جاتی۔ یہ سانسیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ ایسا ہوتا کہ اندر سانس

لیتی تو جیسے سانس باہر نکالنا ہی بھول جاتی۔ میں بالکل ہی ٹرانس میں چلی جاتی تھی۔ کئی کئی منٹ بعد اس طرح ہچکی نما سانس ہلکا ہلکا سا باہر آتا جیسے کسی کا سانس بند ہونے کے بعد دوبارہ جاری ہوتا ہے۔ چند بار تو سانس اتنی گہری تھی کہ میں جان گئی کہ میں مرچکی ہوں۔ جب پہلی مرتبہ ایسا تجربہ ہوا کہ میری سانس ایک دم سے منقطع ہوئی تو میرے دل سے آواز آئی میں مرچکی ہوں۔ میرے اندر ایک سیکنڈ کے چوتھائی حصے سے بھی کم خیال گزرا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ اسی لمحے میں نے دیکھا کہ میری روح کو ایک روشنی نے ڈھانپ لیا جیسے چادر اوڑھا دی۔ اس میں مجھے اللہ پاک کی بے پناہ محبت کا احساس ہوا۔ اسی وقت دل سے خطرہ ٹل گیا۔ میں اپنے جسم سے بالکل غافل ہوکر کسی اور جہاں میں موجود تھی۔ تقریباً" پندرہ بیس منٹ یہ کیفیت جاری رہی۔ اس طرح تین چار مرتبہ ہوا۔ جب بھی میرے ذہن میں موت کا خطرہ آتا فوراً" ہی دل کہہ اٹھتا۔ اللہ پاک کبھی اپنے سے محبت کرنے والوں کو ضائع نہیں کرتا۔ البتہ میں نے حبیب سے کبھی سانسوں کی مشقوں کا ذکر نہیں کیا۔ وہ ڈر جاتے اور مجھے رات بھر اکیلے کمرے میں نہ رہنے دیتے۔ میں جانتی تھی کہ ریاضتوں کے بغیر مشاہدات نہیں ہوتے۔

اب میرا یہ معمول بن گیا کہ رات بھر تنہائی میں مجھ سے ریاضتیں کرائی جاتیں۔ غیبی مشاہدات کے ذریعے علوم عطا ہوتے۔ صبح صبح فجر کی نماز پڑھ کر میں واپس کمرے میں آکر ایک ڈیڑھ گھنٹہ سوجاتی۔ پھر اٹھ کر Job پر

چلی جاتی۔ ان دنوں میں حبیب کی جگہ دکان پر کام کرتی تھی اور حبیب کہیں اور کام کررہے تھے۔ اب تمام بچے اپنی پڑھائی سے لگے تھے۔ میں روز صبح دکان پر بیٹھتے ہی رات بھر کی واردات قلمبند کرلیتی۔ لکھتے لکھتے احساس میں گہرائی آجاتی مگر بازار میں بیٹھے ہوئے تمام کیفیات کو دل کے اندر چھپانا پڑتا۔ بعض وقت عشق الٰہی کا ایسا غلبہ ہوتا کہ آنکھ میں آنسو آجاتے۔ میں بار بار آنکھیں ملتی کہ بازار میں چلنے پھرنے والے میری بھیگی پلکوں کے اسرار سے واقف نہ ہوجائیں۔

میں جانتی تھی کہ یہ سب میرے مشاہدے میں شامل ہے مگر اہل درد خوب جانتے ہیں کہ لاشعوری حواس کے غلبے میں بھرپور شعوری زندگی گزارنا کیسی مشکل بات ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی دنیا دار تن تنہا جنگل میں آن پھنسے۔ جب دل کا تقاضہ کچھ اور ہو اور حالات کا تقاضہ اس کے برعکس ہو تو ایسے میں دونوں تقاضوں کو برقرار رکھنا ہی مجاہدہ نفس ہے۔ اس بھرپور عملی و مجاہداتی دور میں میں نے رگ گلو سے قریب بسنے والی ہستی کو اپنا سب سے زیادہ دوست اور ہمدرد پایا۔ میں صبح جب دکان میں قدم رکھتی تو اللہ تعالیٰ سے کہتی۔ اے میرے رب تجھ سے بڑھ کر نہ مجھے کوئی جان سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ میں تیرے حکم پر اپنی واردات و کیفیات کو قلمبند کررہی ہوں۔ جب تک میرا کام پورا نہ ہو، میری دکان پر کسی گاہک کو نہ بھیجنا۔ روزانہ صبح نو بجے میں یہ کہہ کر لکھنے بیٹھ جاتی اور تقریباً بارہ بجے تک لکھتی رہتی۔ جب لکھ چکتی تو

کام کے لئے کھڑی ہوجاتی اور اللہ میاں سے کہتی۔ اے میرے رب اب میرے پاس گاہک بھیج تاکہ میری دنیاوی ضرورت پوری ہو۔

عام طور پر یہ ہوتا کہ صبح جاتے وقت حبیب کہتے شمامہ آج فلاں بل دینا ہے۔ اتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔ ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہوجاتے۔ میں بھانپ لیتی کیونکہ میں خوب جانتی تھی کہ کسی کے چار پیسے بھی دینے ہوں گے تو حبیب بہت ہی فکرمند ہوجاتے ہیں۔ بلوں کی ادائیگی تو وہ ہمیشہ ہی وقت سے پہلے کردیا کرتے کیونکہ جب تک ادا نہیں کرتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ یہ کہہ کر حبیب مجھ پر اپنی فکروں کا بوجھ ڈال دیتے۔ میں اپنی فکریں اپنے رب کے سامنے پیش کردیتی۔ اللہ میاں سے کہتی۔ اللہ میاں آج مجھے اتنے پیسے چاہئیں میں اپنے شوہر کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ شام کو اتنے ہی پیسے میرے پاس ہوتے۔ اکثر دو چار پونڈ زیادہ ہی ہوتے۔ میں سوچتی اللہ اور بندے میں جو قربت ہے کوئی بندہ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی کسی سے محبت نہیں کرسکتا۔ وہ دلوں کی سرگوشیاں سننے والا ہے۔ دن بدن میرا جی چاہتا میں کسی طرح اللہ تعالیٰ کو جان لوں، پہچان لوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ اسمائے الٰہیہ کے انوار کے مشاہدات کے بعد ہر وقت میرا ذہن اسی سوچ میں رہتا کہ ہر اسم الٰہی اس کی صفات کا ایک رنگ ہے۔ اپنے جمال کے ان بے شمار رنگوں کے ساتھ وہ رنگارنگ ہستی کیسی دلفریب ہوگی۔ کاش میں اسے ایک بار ہی دیکھ لوں۔

ان ہی دنوں دو دن تک مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میرے دماغ میں سبز نور ڈالا جا رہا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا جیسے سبز نور کی بالٹیاں بھر بھر کر میرے سر میں انڈیلی جا رہی ہیں اور کبھی ایسا لگتا جیسے مجھے سبز چادر میں لپیٹا جا رہا ہے اور یہ سبز چادر اللہ تعالیٰ کی حکمت کے نور کی ہے۔ مجھے میرے لاشعور کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ بچپن کی باتیں، بچپن سے پہلے کی باتیں۔ یوں لگا جیسے میری روح آزاد ہے اور وہ ہر وقت کھلی فضاؤں میں پرندے کی طرح اڑ رہی ہے۔ وہ جہاں جہاں کی سیر کرتی مجھے اپنی سیر کا حال سناتی۔ وہ مجھے شمامہ کہہ کر مخاطب کرتی۔ جیسے میں اور میری روح دو الگ الگ فرد ہیں۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جتنا وہ خوش ہوتی اتنا ہی مجھ پر سنجیدگی اور حسرت سی طاری رہتی۔ میرا جی چاہتا کسی طرح وہ غیب میں دیکھ اور محسوس کر رہی ہے میں بھی اس کی خوشی میں شامل ہو جاؤں۔ ہر لمحے مجھے یوں لگتا جیسے میرا جسمانی وجود ہی میرے اور اللہ کے درمیان ایک دیوار ہے۔ میں سوچتی اس دیوار کو پیغمبروں نے اور ان کی تعلیمات سمجھنے والوں نے جیتے جی گرا دیا۔ انہوں نے زندگی میں ہی اللہ کو پالیا۔ وہ کس طرح وہ کیسے؟ کون مجھے سمجھائے گا۔ کاش میں کسی پیغمبرؑ کے عہد میں پیدا ہوئی ہوتی۔ دو تین دن تک مسلسل مجھے یوں ہی محسوس ہوتا رہا جیسے میری روح ٹائم میں سفر کر رہی ہے۔ اتنی پرانی باتیں جو کبھی میں نے گھر والوں سے سنی تھیں میری پیدائش سے بھی پہلے کی وہ سارے مناظر میرے سامنے آجاتے۔

چوتھے دن صبح ہی سے میرے سامنے عہد الست کی فلم چلنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں حافظہ کی گہرائی میں داخل ہو گئی ہوں۔ ایک فلم کی طرح سارا منظر ذہن کے سامنے آگیا۔ جیسے ایک بہت بڑی بہت وسیع نور کی فضا ہے۔ اس فضا میں ہر طرف سبز نور چھایا ہوا ہے۔ فرش بھی سبز نور کا ہے۔ میں سارا دن شاپ میں بیٹھی یہ منظر دیکھ کر اندر ہی اندر حسرت سے سوچتی رہی۔ روح کیسی خوش نصیب ہے۔ جس نے ازل میں اللہ پاک کا دیدار کیا۔ اللہ تعالیٰ کی آواز سنی۔ پھر وہ دن کب آئے گا زندگی کب گزرے گی سارا دن حافظے کے اوپر یہ منظر چھایا رہا اور سارا دن دل حسرت و یاس کی تصویر بنا یہ سوچتا رہا۔ مجھے روح کی ہمراہی کب نصیب ہوگی۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا یہ سب میرا ایک راز ہے۔ میں یادوں کے قلعے میں بند اس حقیقت کو تلاش کرتی رہی۔ رات آئی تو تھک کر اس کی راہداری میں سو گئی۔

صبح اٹھی تو یوں لگا جیسے روح پر سخت افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ نہ وہ اڑ رہی ہے نہ وہ فضاؤں میں سیر کر رہی ہے۔ ایسا لگا جیسے ہر شئے پر ایک سکوت طاری ہے۔ نہ ہواؤں کی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے نہ پرندوں کے نغموں کی۔ بہتے جھرنے خاموش ہیں۔ پوری فضا ایک سوگوار سناٹے میں بدل چکی ہے۔ میں حیران تھی کہ روح کو کیا غم ہے؟ جس نے ساری کائنات سے خوشی کی لہر چھین لی ہے۔ روح اب بھی مجھے ایک الگ فرد کی حیثیت سے محسوس ہوئی۔ میں نے روح سے پوچھا۔ آج تیری یہ اداسی کیسی ہے؟ تیری اداسی نے

میرے دل کو بالکل ہی مضمحل کردیا ہے۔ تیرا غم میرے حواس پر پہاڑ بن کر
معلق ہے۔ اے روح مجھے بتا تیرا غم کیا ہے۔ روح نے درد بھری آواز میں کہا
آج وہ لمحہ میرے روبرو ہے جس لمحے اللہ اور روح کے درمیان خلق کا حجاب
آیا تھا اور پھر میری نگاہ حجاب میں الجھ کر رہ گئی۔ نگاہ کا ہر ٹھہراؤ میری موت
ہے۔ روح بولی اے دل دنیا کی ہر شئے اللہ اور میرے درمیان ایک حجاب
ہے۔ وہ دن میرے اندوہ کا پہلا دن تھا۔ جب مجھے حواس و ادراک کے
حجابات میں لپیٹ دیا گیا تھا۔

روح یہ کہہ کر بالکل خاموش ہوگئی۔ اس کی لمحہ بہ لمحہ خاموشی میرے
دل پر پتھر کی سلوں کے بوجھ لادتی رہی۔ دکان پر بیٹھی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے
میں نہیں بلکہ میری لاش بیٹھی ہوئی ہے۔ جس کے اندر نہ کوئی تقاضہ ہے نہ
زندگی کی حرکت ہے نہ خوشی ہے نہ غم ہے۔ بس نظر ہے جو غیب میں جانے
کہاں اٹکی ہوئی ہے مگر دور گہرائی میں فکر ازلی اس بات سے واقف تھی کہ
روح کی نگاہ حقیقت پر ہے۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ یہاں چار بجے سے اندھیرا ہوجاتا ہے۔
ساڑھے پانچ بجے دکان بند کرکے نکلی تو آدھی رات کا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔
بس اسٹاپ تھوڑی دور تھا۔ اس وقت مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے آس
پاس کیا ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نیند میں چل رہی ہوں۔ میں پوری طرح
ٹرانس میں تھی جیسے ہی اسٹاپ پر پہنچی سامنے ہی بس رکی۔ ایک نظر میں نے

اس کا نمبر دیکھا اور بس میں چڑھ گئی۔ پیسے دیئے ڈرائیور نے ٹکٹ دی اتنے
میں میرے پیچھے ایک انگریز خاتون کی زور زور سے بولنے کی آواز آئی جو برا
بھلا کہہ رہی تھی۔ بس میں ذرا جگہ نہ تھی۔ آگے ہی پانچ سات لوگ کھڑے
تھے۔ شام کا وقت رش کا تھا۔ یہاں بس میں صرف آٹھ آدمی کھڑے رہنے کی
اجازت ہے۔ اس سے زیادہ نہیں لیتے۔ وہ عورت جب زور زور سے چیخی
تب مجھے پتہ چلا کہ میں لائن میں لگنے کی بجائے یوں ہی گھس آئی ہوں مگر یہ
خیال صرف ایک سیکنڈ کے لئے میرے ذہن میں آیا۔ فوراً" ہی میرے منہ سے
نکلا سوری۔ مجھے معلوم نہ تھا اور پھر میں اسی طرح ٹرانس میں چلی گئی۔ وہ
عورت چلاتی رہی۔ ڈرائیور نے صرف ایک آدمی کو لیا اور دروازہ بند کردیا۔
وہ عورت نیچے ہی رہ گئی۔ وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ میں نے لوگوں کی
جانب دیکھا۔ سب کے چہروں پر ناگواری کے اثرات تھے۔ وہ سارے کے
سارے اس عورت کی جانب دیکھ رہے تھے اتنے میں ایک نوجوان لڑکا اپنی
سیٹ سے اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی سیٹ پر بٹھا دیا۔ میں نے اس کا
شکریہ ادا کیا۔ بس آگے بڑھی۔ اب تمام لوگوں کے چہروں پر سکون کے
اثرات تھے۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں اللہ کے سہارے پر ہوں۔ میری
ہر حرکت اسی سے وابستہ ہے۔ مجھے اپنے اردگرد اس کے تحفظ کا مضبوط حصار
دکھائی دیا۔ میرا دل اس کی مہربانیوں کے آگے سرنگوں ہوگیا۔

اس مشاہدے کے بعد شدت سے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ازل میں

روح بہت سے لمحات سے گزر چکی ہے۔ روح کا ہر لمحہ ہمارے حافظے میں بند ہے۔ ان لمحات کو کس طرح کھولا جائے اب دل یہ چاہتا تھا کہ کوئی اس راہ کا واقف مل جائے جو مجھے ان حجابات سے نکال کر ذات تک پہنچا دے۔ مگر میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں یہ بھی جانتی تھی کہ عام عالموں سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی ایسے روحانی عالم کی ضرورت ہے جو روح کے علوم سے پوری طرح واقف ہو۔ منزل رسیدہ ہو اور راہ عشق کی اونچ نیچ کو پہچانتا ہو۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ آج تک میرا معاملہ تیرے ہی ساتھ رہا ہے تو نے ہی دل میں اٹھنے والے ہر تقاضے کو اپنے طور پر پورا کیا ہے۔ اب اس تقاضے کا رخ بھی تیری ہی جانب ہے میرے لئے ایسا مرشد تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ بس میرے کام میں آسانی پیدا کر دے۔

چند دن بعد ہی مجھے الہامی طور پر حکم دیا گیا کہ اس سال حج کرو۔ میں نے حبیب سے کہا وہ فوراً ہی مان گئے۔ کہنے لگے تینوں لڑکوں کو یہیں چھوڑ دیں گے اور بیٹی کو ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے ان سے پکا وعدہ لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل میں دنیا کی کوئی شے رکاوٹ نہیں بننی چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں انتہائی خوشی بھی تھی کہ اللہ نے ہمیں اپنے گھر بلایا ہے۔ جاتے جاتے کچھ ایسے حالات بھی پیش آئے جو ہمارے جانے میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے مگر ہم نے اللہ کے حکم سے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں گے۔ غرضیکہ ہم میاں بیوی اپنی

بیٹی کے ساتھ پہلی بار حج پر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے جدہ پہنچے۔ ایک جاننے والے مل گئے جو وہیں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ عمرہ کیا اور پھر مدینے شریف چلے گئے کیونکہ حج میں ابھی کافی دن تھے۔ مدینے شریف ہم نو دن رہے۔ ہمیں روضہ مبارک سے چند بلڈنگ چھوڑ کر کمرہ مل گیا تھا۔ ہمارا زیادہ وقت روضے پر ہی گزرتا تھا یا پھر مدینہ شریف کی زیارتوں میں۔ ہمیں یہاں آئے تین چار دن گزر چکے تھے میں ہمیشہ عصر سے مغرب تک روضے کی جالیوں کے بالکل سامنے بیٹھی رہتی تھی اور روضے کو دیکھتی رہتی۔ بیٹی بھی میرے ساتھ ہوتی۔ حبیب مردانے میں ہوتے۔ ایک دن اسی طرح بیٹھی روضے کو دیکھ رہی تھی کہ خیال آیا کہ اتنے دن ہو گئے ہیں ایک بار بھی حضور پاکؐ کی زیارت نہیں ہوئی ہے میں نے دل ہی دل میں حضور پاکؐ کو پکارا۔ یا حضور پاکؐ سب کہتے ہیں کہ اپنے روضے پر آنے والوں پر آپؐ کی نگاہ ہے۔ کون جانتا ہے میں دوبارہ پھر یہاں آسکوں یا نہ آسکوں۔ اللہ نے یہاں بلایا ہے۔ اللہ کا بلانا آپؐ کا بلانا ہے۔ اب اگر آپؐ پردے میں رہے تو ہمارے یہاں آنے کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ میں تو یہاں صرف آپؐ کے دیدار کے لئے آئی ہوں۔ میری آنکھیں روضے پر لگی تھیں اور دل بار بار یہی بات دہرا رہا تھا کہ میں تو آپؐ کے دیدار کے لئے آئی ہوں اتنے میں روضے مبارک سے ایک دم آواز آئی ہم یہاں ہیں۔ میں نے دیکھا حضور پاکؐ صلی اللہ علیہ وسلم روضہ مبارک کے داہنی جانب کھڑے ہیں۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں گھبرا کر کھڑی

ہو گئی۔ بیٹی کو جلدی سے کہا کھڑی ہو جاؤ۔ حضور پاکؐ سامنے ہیں۔ دعا کرو۔ میں رو رو کر یا رسول اللہ یا رسول اللہ کہتی جاتی۔

رحمت اللعالمینؐ نے مجھ جیسے ادنیٰ اور فانی بندی کو اپنی بقا کا مشاہدہ کرادیا۔ بلاشبہ آپؐ اللہ کی صفت حی قیوم کے ساتھ زندہ اور باقی ہیں اور اللہ پاک کی صفت سمیع و بصیر کے ساتھ سننے والے اور دیکھنے والے ہیں۔ درود اور سلام ہو اس عظیم و بزرگ ہستی پر جو اللہ کی صفات کا آئینہ بن گئی۔

نویں رات ہماری مدینہ شریف کی آخری رات تھی۔ اس رات ہم سب کا دل بھرا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اب ان قدموں میں دوبارہ حاضری کا موقعہ ملے گا یا نہیں۔ عشاء کے بعد جب کافی لوگ چلے گئے تو ہم پھر روضے کے پاس آ گئے۔ موقعہ دیکھ کر جالیوں سے سر لگا کر جالیاں پکڑ کر خوب روئے۔ پتہ نہیں دل اتنا کیوں بھر رہا تھا۔ ہماری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں حبیب اور بیٹی ہم تینوں ہی زور زور سے رو رہے تھے۔ روضہ مبارک کا سپاہی ایک اسٹول پر کھڑا تھا۔ وہ بڑی پر رحم نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جانے وہ کیا سمجھا ہو گا کہ بچارے کتنے دکھی ہیں اس نیک بندے نے ہمیں کچھ نہ کہا۔ ہم کتنی ہی دیر جالیاں پکڑ کر روتے رہے۔ جب دس پندرہ منٹ بعد طبیعت ہلکی ہوئی تو خاموشی سے اس نیک بندے کا شکریہ ادا کر کے چل دیئے۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔

صبح صبح ہماری فلائٹ تھی۔ ہم جدہ اپنے عزیز کے پاس آئے۔ وہاں

سے ان کے ساتھ حج پر مکہ شریف آئے۔ حج ادا کیا اور ادائیگی حج کے بعد بھی گیارہ دن تک مکہ شریف میں مقیم رہے۔ اللہ پاک کی مہربانیوں سے ہمیں سڑک کے پار کعبہ شریف کے بالکل سامنے ہی ایک کمرہ مل گیا تھا۔ جس میں سے ہر وقت حرم شریف کا نظارہ رہتا۔ حج کے دوران حبیب نے چند مرتبہ حجر اسود کا بوسہ لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اتنے ہجوم میں واقعی بڑا مشکل تھا۔ مجھے بھی حجر اسود کا بوسہ لینے کا بڑا ہی شوق تھا۔ دراصل ہمیں یہ احساس تھا کہ جانے پھر کب یہ موقعہ ملے۔ اس لئے سب کچھ دیکھ لینا ہے۔ سوچا بعد میں رکیں گے تو پھر کوشش کریں گے بعد میں بھی روزانہ کوشش کرتے مگر ہجوم اسی طرح تھا۔ کسی لمحے کم نہ ہوتا تھا۔ ادھر ہمارا شوق بڑھتا جاتا تھا۔ حج کے شاید تیسرے دن میری بیٹی نے خواب دیکھا۔ صبح سو کر اٹھی تو خوشی خوشی بولی۔ بابا میں نے خواب دیکھا ہے کہ اسی طرح کعبہ کے گرد طواف کرنے والوں کا بے پناہ ہجوم ہے ہم تینوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حجر اسود کا بوسہ لینے کے عزم کے ساتھ کعبہ کی جانب قدم بڑھاتے ہیں کہ ہمارے قدموں کے ساتھ ساتھ ہی لوگ اردگرد سمٹتے جاتے ہیں اور درمیان میں راستہ بنتا جاتا ہے۔ ہم اطمینان سے بوسہ دے کر اسی راستے سے واپس پلٹ آتے ہیں۔ یہ خواب سنتے ہی حبیب بے حد خوش ہوئے۔ اسی وقت بیٹی کی پیشانی چوم لی اور فوراً" کہا۔ بس اب جلدی چلو۔ مجھے یقین ہے کہ آج ہم بوسہ لینے میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ مجھے بھی خوشی کے ساتھ ساتھ پورا یقین تھا

کہ آج ہم ضرور بوسہ لے سکیں گے۔

ہم سوچتے تھے کہ یہ دنیا کا وہ خوش نصیب پتھر ہے کہ جس کے اوپر جانے کیسی عظیم بزرگ و برتر ہستیوں کے لبوں کے نشان ہیں۔ ہم چند ہی منٹوں میں کعبہ شریف پہنچ گئے۔ حبیب نے مجھے اپنی عینک اور بیگ دے کر ایک جانب کھڑا کر دیا کہ تم یہاں ٹھہرو۔ پہلے میں بیٹی کو لے کر جاتا ہوں پھر تمہیں لے جاؤں گا۔ کچھ دیر بعد دونوں ہنستے ہوئے آئے اور کہنے لگے ہم نے حجراسود کو چوم لیا ہے۔ اب تم چلو۔ ہجوم تو بے تحاشہ تھا سر کا دوپٹہ بھی اتر گیا۔ پاؤں زخمی ہوگئے مگر ہم بوسہ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ اللہ پاک کا شکر ادا کیا جس نے ہماری خواہش پوری کی۔ ہم روزانہ ایک یا دو عمرے کرتے۔ زیارتیں کرتے اور غار حرا پر بھی گئے۔ اب میں روزانہ یہی سوچتی کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو جو مرکزیت بخشی ہے اور حج کا حکم فرض کیا ہے تو اس کی حکمت کیا ہے۔ میں زیادہ تر نمازوں کے بعد بس کعبہ شریف کو بیٹھی تکتی رہتی اور اللہ تعالیٰ سے کہتی کہ آپ نے بلایا ہے تو کچھ مشاہدہ بھی کرائیے تاکہ میں حج کی حکمت سے واقف ہوجاؤں۔

ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ نور کی فضا میں ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ حرم شریف کی طرح اس کے بھی چار ستون ہیں اور سیڑھیاں ہیں۔ عمارت کے کونوں پر بہت اونچائی پر لائٹیں لگی ہیں۔ جن کی تیز نورانی لائٹ عمارت کے وسط میں پڑ رہی ہے اور بیچوں بیچ اس نور میں کعبہ جگمگا رہا

ہے۔ میں اس کعبہ کو دیکھتی ہوں اور دل میں یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ بیت المعمور ہے۔ میں عمارت کے ہر طرف جاکر اور گھوم کر بیت المعمور پر پڑنے والی تجلیات کا مشاہدہ کرتی ہوں۔ میرے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ یہ تجلیات ہیں۔ میں ان تجلیات کے نزول کے سسٹم کو دیکھتی ہوں کہ کس طرح آسمان سے نازل ہوکر لائٹوں کے ذریعے کعبہ پر ڈالی جارہی ہیں۔ میں یہ بھی دیکھتی ہوں کہ بے شمار حاجت مند اپنی اپنی حاجتیں لے کر بیت المعمور کے طواف کے لئے آرہے ہیں اور خوش ہوکر جارہے ہیں۔ بیت المعمور کی تجلیات و انوار ان میں جذب ہوکر ان کی تمام پریشانیاں دور کردیتی ہیں۔ تجلیات و انوار کا یہ سسٹم دیکھ کر جب میں خواب سے جاگی تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دنیا میں کعبہ شریف کے اوپر نزول ہونے والی تجلیات کا بھی یہی نظام ہے۔ اس مقام پر لوگوں کو آنے کی دعوت دینے میں شاید یہ حکمت بھی ہے کہ مرکز تجلیات و انوار سے لوگ زیادہ سے زیادہ مستفیض ہوں۔ یہ انوار کا ایک آبشار ہے جس کے نزول کا مرکز کعبہ شریف ہے۔ میں نے یہ خواب اور اس کی تشریح حبیب کو اور بیٹی کو سمجھائی اور یہ بھی کہا کہ چونکہ یہ مرکز ہے اس وجہ سے یہاں تھوڑے سے وقت میں زیادہ انوار کی فیڈنگ Feeding انسان کو مل جاتی ہے۔ اس حکمت سے باخبر ہونے کے بعد مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

جو لوگ حج پر جانے کی بجائے اس بات پر ترجیح دیتے ہیں کہ حج کے

پیسوں سے کسی غریب کی حاجت روا ہوسکتی ہے اور اس میں زیادہ ثواب ہے تو ثواب کا مطلب تو روحانی فیڈنگ ہے جو روحانی فیڈنگ براہ راست انوار کی منتقلی وانجذاب سے ہوسکتی ہے وہ کسی اور ذریعے سے کیسے ہوسکتی ہے۔ اس توجیہہ کے بعد حبیب کے بھی نظریات بدل گئے۔ وہ یہی کہتے کہ واقعی حج ضروری ہے۔ اس سے اتنی فیڈنگ ہوجاتی ہے کہ جو اور کسی نیکی سے نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حج فرض کیا ہے۔

فرشتے

حج کے بعد ہم سیدھے انگلینڈ آگئے۔ پاکستان گئے ہوئے تین سال ہوچکے تھے۔ میں نے حبیب سے کہا کہ میں ایک مرتبہ اپنی امی سے ملنا چاہتی ہوں۔ اب وہ کافی ضعیف ہوچکی ہیں۔ جانے کب اللہ کے پاس سے بلاوا آجائے۔ میں چاہتی ہوں کہ انہیں دیکھ لوں۔ حبیب نے کہا کہ تم پندرہ بیس دن کے لئے مل آؤ۔ میری سیٹ بک ہوچکی تھی۔ جانے میں چند دن رہ گئے تھے کہ ایک شام مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے کمرے میں آئی۔ ابھی میں نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس وقت کمرے میں شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میرے اٹھتے قدم ایک دم رک گئے۔ میری کھلی نگاہیں کمرے کی دھندلی فضا پر جم گئیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ چار عدد فرشتے ہیں ان سب نے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ڈال کر ایک آرام دہ نشست بنا لی ہے اور اس آرام دہ نشست پر میری امی بیٹھی ہیں۔ خربوزی رنگ کا لمبا ریشم کا گاؤن پہنے ہوئے ہیں ان کا چہرہ تروتازہ ہے۔ جوان لگ رہی ہیں بہت زیادہ خوش اور خوبصورت لگ رہی ہیں۔ میری روح نے ان

سے بے ساختہ کہا ارے امی آپ کہاں آسمان پر جا رہی ہیں۔ میں تو آپ سے ملنے آرہی ہوں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہنے لگیں۔ بیٹی میں خود نہیں جا رہی مجھے لے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا امی آپ خوش تو ہیں وہ فوراً" ہنستے ہوئے بولیں۔ بیٹی میں بہت خوش ہوں۔ میں نے ٹھنڈی سانس اندر ہی اندر لی اور بولی آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔

پھر میں نے نماز ادا کی۔ امی جان کی مغفرت کی دعا کی۔ مجھے یقین تھا کہ امی کا سفر اب پورا ہوگیا ہے۔ نماز کے بعد میں نے حبیب کو یہ سارا واقعہ بتایا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اللہ کو جو منظور ہے اس پر راضی رہنا چاہئے۔ مجھے بڑا اطمینان سا تھا کہ امی خوش ہیں۔ رات کو بستر پر لیٹے تھے بارہ بجے اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ حبیب نے لپک کر فون اٹھایا۔ میرا دل زور سے دھڑکا امی کے انتقال کی خبر تھی۔ وقت وہی تھا جس وقت میں نے انہیں آسمان پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس طرح میرے اسکول کے زمانے میں جب امی پر فالج کا اثر ہوا تھا اس کے تقریباً" ۲۶ سال بعد امی کا انتقال ہوا۔ وہ بھی اچانک چلتے پھرتے۔ بیٹھے بیٹھے تخت سے لڑھک گئیں۔ اللہ پاک ان پر اپنی رحمتیں اور نعمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

امی کے انتقال کے چند دن بعد میں پاکستان گئی اور پندرہ دن رہ کر ان کی قبر پر حاضری دے کر واپس چلی آئی۔ آنے کے دوسرے تیسرے دن ہی خواب میں دیکھا کہ میں کہیں باہر سے بہت تیزی کے ساتھ بھاگ کر اندر

کمرے میں آتی ہوں۔ کمرے میں امی بیٹھی ہیں۔ میں ان کے پاؤں کے پاس نیچے بیٹھ جاتی ہوں اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں کہ امی مجھے یاد آیا کہ جب میں بہت ہی چھوٹی سی تھی یہ اس وقت کی بات ہے جب پرائمری کی چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ تو کلاس ٹیچر مجھے کافی پسند کرتی تھیں کیونکہ میں کافی ذہین تھی۔ ایک دن کلاس میں ٹیچر کا کوئی جاننے والا آیا یہ آدمی عالم تھا اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ اس نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر میری زندگی کے آئندہ ہونے والی واقعات بتائے۔ پھر کہا کہ تم اب اپنی جگہ بیٹھ جاؤ اور اپنے سامنے اپنی ہتھیلی کو پھیلا کر رکھو اور پندرہ بیس منٹ تک لگاتار اس ہتھیلی پر نظریں جما کر رکھو۔ اپنے دل میں یہ تصور رکھو کہ تمہاری ہتھیلی پر زرد رنگ کا نگینہ ہے۔ اس سے تم کو بہت فائدہ ہوگا۔ امی کہنے لگیں شمامہ تم ایسا کرو کہ زرد رنگ کا نگینہ اپنی انگلی میں پہن لو اس سے تم کو بہت فائدہ ہوگا۔

خواب دیکھتے ہی میں نے نگینہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ خواب میں جس نگینہ کے پہننے کے لئے کہا گیا ہے وہ میرا برتھ اسٹون بھی ہے۔ یہ زرد Topaz تھا جو میں نے جلد ہی انگوٹھی میں جڑوا کر پہن لیا۔ مجھے یقین تھا کہ خواب کے مطابق اس کے پہننے سے میری روحانی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا ویسے بھی امی کے حکم کی تعمیل میرے لئے ضروری تھی۔ میرا اعتقاد تھا کہ امی اس عالم میں رہتے ہوئے بھی میری خبر رکھتی ہیں۔ مجھے ان کی

روحانی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔

اس خواب کے چار پانچ دن بعد ہی میں نے خواب دیکھا کہ میرے ہاتھ میں اخبار ہے۔ جس کے سرورق پر امی کی بہت بڑی سی تصویر چھپی ہے۔ تصویر میں امی بہت ہی خوبصورت اور جوان لگ رہی ہیں۔ ان کے سر پر ٹوپی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت بڑا سا کالم ان کی خبر سے متعلق ہے۔ میں بے حد خوشی خوشی اخبار لے کر دوڑی دوڑی آتی ہوں اور گھر کے ہر ہر فرد کو بتاتی ہوں کہ دیکھو یہ کتنی بڑی خبر امی سے متعلق چھپی ہے۔ یہ خبر ہے ہی اتنی اہم۔ جبھی تو سرورق پر تصویر کے ساتھ چھپی ہے۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اسی خوشی میں آنکھ کھلی آنکھ کھلتے ہی غنودگی کے عالم میں غیب سے آواز آئی۔

"سلامتی اور مدد کامل کے ساتھ تمہاری امی کو ولیوں کے درجہ میں رکھا گیا ہے۔"

یہ تین مرتبہ کہا گیا۔ خواب کی ہدایت کے مطابق میں روزانہ تہجد کے وقت زرد روشنیوں کا مراقبہ کرتی اور پھر اس کے بعد اسم ذات اللہ کا تصور اور مراقبہ کرتی۔ ان دنوں تہجد کے وقت میرا یہی شغل تھا۔ ان دونوں مراقبوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ چند دن بعد ہی مجھے اپنی نگاہ میں تبدیلی محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا جیسے میں جس شے پر نظر ڈالتی ہوں وہ شے مجھے کروٹ بدلتی محسوس ہوتی ہے۔ یوں دکھائی دیتا جیسے اوپر کا میلا حصہ نیچے چلا گیا ہے

اور اندر کا صاف اور چمکیلا حصہ باہر آگیا ہے۔ خود میرے اپنے اندر بھی ایسا ہی دکھائی دیتا جیسے میرے دل نے کروٹ بدل لی ہے۔ اس کے باہر والی سطح گوشت پوست کے اندر چلی گئی ہے اور اندر والی سطح روشنیوں والی باہر آگئی ہے۔ جیسے یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ سننے میں آنے لگی۔ ہر شے کے باطن میں اللہ کا نور ہے۔ اب قرآن کا مفہوم نئے زاویے سے ذہن میں آنے لگا۔

اگلے سال پھر مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ انگلینڈ میں رہتے ہوئے کچھ تحریریں میری نظر سے گزری تھیں جنہیں پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ تحریریں ضرور کسی روحانی عالم کی ہیں۔ میرے اندر ان سے ملنے کا تقاضا پیدا ہوا میں جان گئی کہ اب اللہ پاک کسی کی نگرانی میں میری تعلیم کرنا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا جب میں انہیں دیکھوں گی تو ضرور پہچان جاؤں گی کیونکہ یہ تو روح کے رشتے ہیں اور روحیں پہلے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہیں۔ میں حبیب کے ساتھ ان بزرگ کے دفتر گئی۔ نظر ڈالتے ہی ایک فلش سا ہوا۔ دل سے آواز آئی۔ اب روحانی راستوں پر انہی کے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں اور حبیب تھوڑی دیر ملاقات کے بعد واپس لوٹ آئے۔ اس کے بعد ایک دو بار اور تھوڑی دیر کو ملاقات ہوئی۔ اگلی دفعہ ان میں ایک کشش محسوس ہوئی اور تب میں نے بیعت ہونے کی خواہش ظاہر کی جو خوشی کے ساتھ منظور ہوگئی۔ ہم واپس انگلینڈ آگئے۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی وہ سال بھی گزر گیا۔

دوسرے سال بھی پہلی سہ ماہی میں میں نے خواب دیکھا۔

ہم لوگ اپنے گھر میں ہیں۔ میں بچوں کو ہدایت دیتی ہوں کہ جلدی جلدی فلاں کمرے کا سامان نکال کر کمرے بالکل خالی کردو۔ اور خوب اچھی طرح صفائی کردو جیسے اس کمرے میں کوئی تقریب ہونے والی ہے اور مہمان آنے والے ہیں۔ ہم سب بھی گھر کی صفائی میں لگ جاتے ہیں۔ پھر میں اس کمرے میں جاتی ہوں کہ دیکھوں بچوں نے کس طرح صاف کیا ہے۔ دیکھتی ہوں کہ تمام فرنیچر وغیرہ نکال کر خالی کردیا ہے اور بڑا لڑکا دیواروں وغیرہ کی جھاڑ پونچھ کر رہا ہے۔ ایک دیوار پر بہت بڑا سا ماربل لگا ہے جو دروازے جتنا ہے۔ اس کے اطراف میں لکڑی کی بڑی خوبصورت فریم لگی ہے۔ میں اس ماربل کو صاف کرتی ہوں جوں ہی میں گھڑی پر نظر ڈالتی ہوں اور کہتی ہوں کہ ساڑھے نو بج گئے ابھی تک فیکٹری کا دروازہ نہیں کھلا۔ ایک شخص آتا ہے کہتا ہے کہ ہم صفائی کررہے تھے اب دروازہ کھولتے ہیں آپ اندر آجایئے۔

یہ خواب دیکھ کر جاگی تو صبح اذان کا وقت تھا۔ اٹھ کر وضو کیا اور اتنے میں حبیب بھی جاگ گئے۔ میں نے انہیں سارا خواب سنایا اور کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔ حبیب جانتے تھے کہ اس کی پیشن گوئی سالوں پہلے ہوچکی ہے اور اب اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے۔

صبح ہوئی تو ڈاک سے مرشد کریم کا خط آیا جس میں انہوں نے یہاں

آنے کا ارادہ ظاہر کیا اور لکھا تھا کہ یہاں پر ایک روحانی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہے جس میں ہمیں تعاون کرنے کے لئے کہا تھا۔ ان دنوں میرے چاروں بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے اور میں ہفتے میں چھ دن فل ٹائم جاب کررہی تھی مگر ان سب مصروفیات کے ساتھ میری ذہنی اور روحانی مصروفیت ہر وقت کی تھی۔ ہر وقت میرے اندر اللہ پاک کو جاننے اور اسے دیکھنے کا تقاضہ رہتا۔ قرآن کے حروف مقطعات کے علوم اور اللہ تعالیٰ کے اسرار و رموز کے علوم جاننے کا شوق ہوتا۔ کبھی کبھی تو میرا بے تحاشہ جی چاہتا کہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں جذب ہوکر اس کی ہستی کا سراغ لگالوں۔

مرشد پاک نے ابھی تک مجھے کوئی سبق نہیں دیا تھا۔ اچھی طرح سے ان کے پاس بیٹھنے کا کوئی موقعہ بھی تو نہیں ملا تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ میں خود سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ اللہ ہی میرا اصل راہبر ہے اس روحانی راستوں کا۔ اسی نے جب چاہا میرے لئے مرشد کی ضرورت محسوس کی تو مجھے مرشد تک رسائی حاصل ہوگی۔ اب وہ جس طرح چاہے گا اسی طرح مرشد کے ذریعے تعلیمات و فیض کا سلسلہ بھی قائم کردے گا۔ ویسے بھی میں خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ روحانی فیض کسب سے نہیں عطا سے حاصل ہوتے ہیں۔ رب العالمین کی نگاہ کرم تمام فیوض کے چشموں کے دہانے اپنے بندے پر کھول دیتی ہے۔ مجھے اسی نظر کرم کا انتظار تھا۔

اس خط کے ملنے کے چند دن بعد ہی میں نے خواب دیکھا کہ میرے

بھائی جان میرے پاس آئے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک رنگین تصویر ہے۔ یہ تصویر درگاہ کی ہے وہ مجھے یہ تصویر دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ حضرت مخدوم پاک علی احمدؒ صابر کلیری کا مزار ہے۔ اسے اچھی طرح دیکھ لو اور اس نقشے کو ذہن نشین کرلو۔ تمہیں یہاں جانا ہے۔ میں بڑے غور سے اس تصویر کو دیکھتی ہوں تاکہ اچھی طرح پہچان لوں جہاں جانا ہے۔

خواب سے آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال آیا کہ یہ سچا خواب ہے اور میرے لئے حضرت صابر پاکؒ کی درگاہ پر حاضری دینے کا حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ صبح فجر کا وقت تھا۔ میں نے حبیب کو جگایا اور یہ خواب سنایا۔ پھر ان سے پوچھا کہ حضرت صابر پاکؒ کی درگاہ کہاں ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہوگا۔ آپ ان کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ بولے بس اتنا جانتا ہوں کہ لوگ ان کی قوالیاں گاتے ہیں اور ان کا مزار انڈیا میں ہے۔ انڈیا کا نام سن کر ہم دونوں فکر میں پڑ گئے کہ وہاں ہمارا کون ہے۔ دل نے کہا حکم اس کا ہے وسائل بھی وہی بنائے گا۔ تمہیں تو بس جی حضوری میں گردن جھکانی ہے۔ عقل دل کی بات سن کر چپکی ہو رہی۔ دو دن تک ذہن یہی سوچتا رہا کہ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ تیسرے دن صوفے پر بیٹھے ہوئے اچانک خیال آیا میں تو حضرت صابر پاک کو جانتی بھی نہیں۔ خواب جھوٹے بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اسی لمحے نہایت ہی واضح طور پر ایک بزرگ سامنے آگئے۔ نہایت ہی جلال میں فرمایا۔ تم ابھی تک شک میں ہو۔ مجھے پہچاننے میں ذرا دیر

نہ لگی کہ یہ حضرت صابر پاکؒ تھے وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میرے اندر مسلسل ایک ہی خیال و آواز آرہی تھی مجھے صابر پاکؒ کے روضہ مبارک پر جانا ہے۔ میں نے پاس ہی صوفے پر لیٹے ہوئے حبیب کو جھنجھوڑا وہ جلد ہی غنودگی سے پورے ہوش میں آگئے۔ میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ جلد ہی کہیں سے پتہ کرو کہ یہ بزرگ انڈیا میں کہاں ہیں۔ یہ کس دور کے ہیں۔ اب میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان کے متعلق سب کچھ ایک ہی لمحے میں جان جاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے جلال نے مجھے خوف زدہ کردیا تھا کہ اگر میں نے تعمیل حکم میں ذرا بھی کوتاہی برتی تو خیر نہیں ہے۔ حبیب نے مجھے تسلی دی تم گھبراؤ مت۔ میں کل ہی ان کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہوں۔

یہ مغرب کا وقت تھا میں نے وضو کیا اور نماز پڑھ کر خوب دعا کی بلکہ اندر اندر حضرت صابر پاکؒ کے تصور سے ہی گزارش کرنے لگی کہ جب آپ بلانا چاہتے ہیں تو حالات بھی سازگار کردیں اور تمام انتظامات جانے کے مہیا کردیں تاکہ آسانی سے عمل ہوسکے۔ خوب دیر تک دعا مانگ کے دل کو تسلی ہوگئی۔ اٹھی تو دل بالکل ہلکا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں اور حبیب دونوں گھر میں رکھے ہوئے رسالے اور کتابیں چھاننے لگے کہ شاید کسی رسالے یا کتاب میں حضرت صابر پاکؒ کا ذکر ہو تو ہمیں ان کے متعلق صحیح حالات معلوم ہوجائیں۔ جلد ہی ایک رسالے میں ان کا تفصیلی مضمون مل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ایسی خوشی ہوئی۔

دوسرے دن حبیب نے کلیر شریف کی ساری لوکیشن معلوم کی۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان جائیں گے اور بیٹی کی شادی کر کے پھر انڈیا روانہ ہوجائیں گے۔ رشتہ تو تھا ہی بس یہی دعا تھی کہ تمام کام درست ہوجائیں۔ یہ سارا پروگرام بنا کر میں اندر ہی اندر تصور میں حضرت صابر پاکؒ کو بتا دیا تاکہ وہ ہمارے ارادے سے آگاہ ہوجائیں مجھے پکا یقین تھا کہ ان کی کڑی نظر مجھ پر ہے۔

اس کے دوسرے تیسرے دن ہی شام کو فارغ بیٹھی تھی کہ پھر حضرت صابر پاکؒ اسی طرح دکھائی دیئے۔ آپ کا حلیہ مبارک ایک ملنگ کی طرح تھا۔ لمبی لمبی زلفیں' صرف تہبند باندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں جلال کی سرخی تھی۔ آپ کو دیکھتے ہی میری تمام تر توجہ آپ کی جانب لگ گئی۔ ذہن بالکل خالی ہوگیا۔ صرف نگاہ میں تمام حواس سمٹ آئے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے اندر سے انوار نکل کر میرے اندر جذب ہورہے ہیں۔ پھر ایسا روز ہونے لگا۔ دن رات میں کئی مرتبہ حضرت صابر پاکؒ اپنی روشنیاں میرے اندر منتقل کرتے۔ اب میرے اندر آہستہ آہستہ آپ کا خوف دور ہونے لگا اور ہر وقت ہی میری توجہ آپ کی جانب رہنے لگی۔

ایک دن آپ نے فرمایا۔ آیئے ہم آپ کو اپنے محل کی سیر کراتے ہیں اور آپ نے مجھے روحانی طور پر اپنے محل کی سیر کرائی۔ سیر کرتے وقت یوں لگا جیسے میری روح اور حضرت صابر پاکؒ دونوں گہرے دوست ہیں۔ اس کے بعد

میرے ذہن سے آپ کا جلالی تصور بالکل ہی مٹ گیا۔ اس کی بجائے ایک ایسا روحانی تعلق استوار ہوگیا جسے سوائے محبت کے کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ جیسے جیسے آپ کے انوار اور روشنیاں میرے اندر منتقل ہوتی جاتیں ویسے ویسے میرے دل میں آپ کی رحمت اور عظمت بڑھتی جاتی۔ آپ اکثر مجھے اپنے محلات کی سیر کراتے۔ اس طرح مجھ پر مرنے کے بعد کی زندگی کے حالات کھل گئے۔ اس کے علاوہ میں جان گئی کہ کس طرح انوار کی منتقلی سے روحانی علوم حاصل ہوتے ہیں۔ میں ہر طرح کے روحانی تجربات و کیفیات کا تذکرہ حبیب سے ضرور کرتی۔ وہ اس لئے کہ قرآن کی رو سے میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں مگر حضرت صابر پاکؒ کے ساتھ میرا روحانی تجربہ بالکل نیا تھا۔ میرے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ایک بزرگ جن کے وصال کو بھی صدیاں گزر چکی ہیں ان کے ساتھ میرا روحانی تعلق اس طرح پیدا ہوجائے گا۔ میرے دل میں ہر وقت آپ کا تصور رہتا۔ دل کی نگاہ سے اگر کچھ دیر آپ اوجھل ہوجاتے تو اندر ہی اندر میرا دل عشق کے شعلوں میں جلنے لگتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی قطرہ جان میرے اندر سے نچوڑ رہا ہے۔ یہ کیفیات میرے لئے کوئی نئی تو نہیں تھی۔ ان سے تو میں بچپن ہی سے گزرتی چلی آئی تھی۔ کبھی ماں کی محبت' کبھی ٹیچر کی محبت' کبھی سہیلی کی محبت اور پھر حبیب کی محبت اور اب حضرت صابر پاکؒ بھی عشق کی مالا کا ایک موتی بن گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا رب میرے لئے اپنی عطا کی مالا پرو رہا ہے۔ عشق

کی ڈوری میں پروئی ہوئی یہ مالا میری رگ سے بندھی ہے۔ اس کا ہر موتی میری جان ہے جو اس کی بخشش ہے۔ اس لڑی کا ایک موتی بھی بکھر گیا تو مالا ٹوٹ جائے گی۔ میرا ہار سنگھار اجڑ جائے گا۔ پھر وہ صاحب جمال میری طرف نگاہ کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ روح واقف اسرار تھی مگر دل کا یہ سوال بھی اپنی جگہ قائم تھا کہ مجھے کیوں سلگتی آگ میں رکھا ہوا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ صابر پاکؒ کے عشق کی آگ میرے دل میں بھڑکتی رہی۔ جی چاہتا کہ وہ دن جلدی آئے جب میں ان کے در پر حاضری دوں۔ اللہ کے نور کے اس پیکر میں مجھے اللہ کا جمال دکھائی دیتا۔ میرا دل کہہ اٹھتا کون آپ کو جلالی کہتا ہے۔ آپ تو سراسر جمالی ہیں۔ اللہ کا نور ہی آپ کا جمال ہے۔ میری نگاہ اللہ کے جمال کی متلاشی ہے۔

روحانی مسافر

پروگرام کے مطابق بیٹی کی شادی کا انتظام بھی ہوگیا۔ نکاح کی تاریخ مقرر ہوگی۔ گرمیوں میں لڑکوں کے کالج سے چھٹیاں ہوئیں تو انہیں گھر چھوڑ کر میں اور حبیب بیٹی کو لے کر پاکستان روانہ ہوگئے۔ ارادہ یہ تھا کہ شادی سے فارغ ہوتے ہی انڈیا روانہ ہوجائیں گے۔ شادی میں میرے روحانی استاد میرے مرشد کریم نے بھی شرکت فرمائی۔ آپ کی شرکت میرے لئے انتہائی مسرت کا سامان تھا۔ اسی دوران آپ سے دو مرتبہ تھوڑی دیر کو ملاقات ہوئی۔ آپ نے چند دن بعد ہی انگلینڈ جانے کا اظہار کیا کہ پروگرام بن چکا ہے اور بھی کچھ باتیں کیں۔ آپ کی بات میری تو سمجھ میں یہ آئی کہ آپ چاہتے ہیں کہ وہاں مشن کی ترویج کا کام زیادہ ہو۔ ہم نے انہیں اپنا انڈیا جانے کا پروگرام بتایا کہ پندرہ دن کے بعد ہم واپس آکر پھر انگلینڈ آجائیں گے۔ انڈیا میں حضرت صابر پاکؒ کے ہاں حاضری دینی ہے اور میرا اور حبیب کی زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ ہم کسی ولی اللہ کی درگاہ پر حاضری دینے اور کچھ دن وہاں پر گزارنے کے لئے جا رہے ہیں۔ مرشد پاک نے یہ سن کر فرمایا

پہلے تم اپنے دادا پیر سے اجازت لے لو۔ پھر جانا۔ دادا پیر میرے مرشد کریم کے شیخ تھے۔ جن کا مزار اسی شہر میں ہے۔ اس سے پہلے ان کے مزار پر حاضری دینے کا موقع ہمیں گزشتہ سال مل چکا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے ہوا یوں کہ گزشتہ سال میں اکیلی پاکستان آئی تھی۔ حبیب میرے ساتھ نہیں تھے۔ صرف دو تین ہفتے کے لئے آئی تھی۔ مرشد کریم سے ملنے کے مواقع بہت ہی کم ملے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے۔ ایک دن ان کے پاس گئی تو آپ نے کہا چلئے آپ کو اپنے شیخ کی زیارت کرالاؤں۔ میں اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ تھی۔ ان کی گاڑی میں ہم چل دیئے۔ مجھے جانے کا شوق تو ضرور تھا مگر اس وقت تک میں کبھی کسی بھی مزار پر نہیں گئی تھی۔ میرے ذہن میں مسلسل یہی خیال آنے لگے میں تو شیخ صاحب کے پاس جا رہی ہوں مگر ان کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں ان کی درگاہ پر آئی ہوں اور اگر ان کو پتہ چل بھی جائے تو مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ وہ میری حاضری کو دیکھ رہے ہیں اور میری دلی کیفیات کو جان رہے ہیں اور اگر میرا ان کا رابطہ نہ ہوا تو پھر میری حاضری کیسے ہوگی۔ سارا راستے ذہن میں یہی تکرار رہی کہ وہ تو دوسرے عالم میں مصروف ہیں انہیں کیسے پتہ چلے گا کہ کون ان کے مزار پر آ جا رہا ہے۔ ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں چلی جا رہی تھی کہ کار مزار مبارک کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ میری نگاہ دور مزار پر پڑی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ قبر مبارک پر ایک نورانی ہستی کھڑی ہے جن کا سراپا عام آدمی سے کئی گناہ زیادہ لمبا ہے۔ ایک

نظر دیکھتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ میرے انتظار میں ہیں۔ میں جان گئی کہ آپ کو میرے تمام خیالات سے آگاہی ہو چکی ہے۔ میرے اوپر آپ کی عظمت کا رعب طاری ہوگیا۔ میری حالت ہی بدل گئی۔ میں زور زور سے رونے لگی۔ گاڑی رکی میں نے انہیں سلام کیا وہ مسکرائے۔ فرمایا۔ ہم آپ کے ہی انتظار میں تھے۔ بڑی مشکل سے ہی میں نے جوتے اتارے اور قبر مبارک کے پاس پہنچ گئی۔ سارا وقت جب تک وہاں رہی میری آپ کے ساتھ حضوری رہی۔

اب جب مرشد پاک نے فرمایا کہ دادا پیر سے اجازت لے لو تو پھر میں' حبیب اور مرشد کریم ہم تینوں ان کی درگاہ پر آئے۔ اب کے میرے دل میں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ مجھے کس طرح اجازت دیں گے۔ میرا ان سے کیسے رابطہ ہوگا۔ میرے دل کو بس یہ پکا یقین تھا کہ میں ان سے ملنے جا رہی ہوں۔ جیسے کوئی زندہ آدمی کسی دوسرے آدمی سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے اور ملاقات کرتا ہے۔ جاتے ہی میں نے ان کو دل ہی دل میں سلام کیا۔ بند آنکھوں سے کیا دیکھتی ہوں کہ قبر مبارک درمیان سے دروازہ کے دو کواڑوں کی طرح کھل گئی۔ نیچے جانے کے لئے زینہ تھا۔ زینے کے پاس خادم کھڑا اندر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ زینے سے اتر کر ہم آپ کے گھر میں داخل ہوگئے۔ وہاں آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے کلیر شریف جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے درخواست پیش کی کہ روحانی علوم سیکھنے کے جس

مقصد کو لے کر کلیر شریف جا رہی ہوں وہ مقصد پورا ہونے کے لئے میرے لئے دعا کریں۔ اب میرے اندر اور بھی زیادہ حضرت صابر پاکؒ سے ملنے کا شوق ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ مرشد کریم کے توسط سے ہی اوپر والوں میں میری شنوائی ہورہی ہے۔ اللہ کا ہر کام ایک مخصوص سسٹم کے تحت ہے۔ روحانی مسافر کو بغیر مرشد کے اس راہ میں داخلہ نہیں ملتا۔ میرے اندر مرشد کے لئے ایک کشش سی محسوس ہوئی۔ میں نے اندر ہی اندر اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس نے اجنبی راہوں پر چلتے ہوئے میرا ہاتھ رہبر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سکون کی ٹھنڈی سانس نور کی طرح میرے باطن میں پھیل گئی۔ زندگی کے افق پر سورج طلوع ہوچکا تھا۔

حضرت صابر پاکؒ کی درگاہ میں تین دن تک رہے۔ اعتکاف کے دوران آپ نے مجھ پر وہ عنایت کی جس کے لئے آپ نے اپنے مزار پر آنے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے مجھے فنا اور بقا کا مشاہدہ کرایا۔ میرے قلب کی آنکھ نے دیکھ لیا کہ اصل انسان روشنی کا بنا ہوا ہے۔ جس کی بقا اللہ کے نور پر ہے۔ مٹی کا جسم اس روشنی کے انسان کا ایک لباس ہے۔ جو وہ دنیا میں آنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح زمین پر پانی ڈالو تو زمین پانی جذب کرکے گیلی ہوجاتی ہے اسی طرح جسم مثالی کی روشنیاں زمین پر مٹی کے ذرات میں جذب ہوکر اپنے آپ کو مٹی کے خول میں چھپا لیتی ہیں۔ زندگی بھر اس مٹی کے خول میں جسم مثالی کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا

آتا ہے کہ وہ اس مٹی کے بت کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے روشنیوں کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ رنگ و روشنی کا یہ عالم مجھے صدائیں دینے لگا۔ باغ کا ہر پھول جھوم جھوم کر کہنے لگا کہ اب اس ساحل حقیقت پر قدم رکھ ہی دیا ہے تو پھر یہاں سے لوٹ کر سراب کے پیچھے جانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ میرا جی چاہا کہ فنا کی اس دیوار کو ہمیشہ کے لئے توڑ دوں۔

انڈیا کے پندرہ دن کے دورے کے بعد ہم لوگ واپس انگلینڈ آگئے۔ مرشد کریم کچھ دن پہلے ہی یہاں آچکے تھے۔ آپ نے مجھے کچھ روحانی اسباق اور چلے کرنے کے لئے دیئے۔ فرمایا یہ وہ اسباق ہیں جو روحانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے اس راستے پر چلنے والے تمام لوگوں نے کئے ہیں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس نے میری روح کے تقاضوں کی تکمیل کے سامان کر دیئے۔ ساتھ ہی میں مرشد کی بھی شکرگزار تھی کہ جنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ ان اسباق کے ساتھ ساتھ میری روحانی صلاحیتیں نہایت تیزی سے بڑھنے لگیں۔ میرے مشاہدات و روحانی واردات میں نہایت تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ قرآن کی آیات کے مفہوم پہلے کی نسبت زیادہ سمجھ میں آنے لگے۔

مرشد نے مجھے روحانی وارداتیں قلمبند کرنے کے لئے کہا تھا جو میں ہر روز کرتی تھی۔ حبیب اسے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے جو بات سمجھ میں نہ آتی وہ مجھ سے پوچھتے۔ میں ان دنوں چھ دن کام کرتی تھی مگر ذہنی توجہ مسلسل

غیب کی جانب لگی رہتی۔ جیسے جیسے انکشافات ہوتے جاتے ویسے ویسے انسان کو عطا کردہ علوم اور اس کی صلاحیتوں کی عظمت کا پتہ چلتا جاتا۔ میں سوچتی اللہ نے انسان کو کس قدر زبردست صلاحیتیں اور قوتیں عطا کیں ہیں مگر ان سے لاعلمی کی وجہ سے آدمی خود اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں نہیں لاتا۔ ایسے میں علم کی اہمیت دل میں اور زیادہ بڑھتی جاتی۔ میں بڑی لگن کے ساتھ مرشد کریم کے دیئے ہوئے اسباق کرتی اور قرآن کی آیات میں تفکر کرتی۔ ہفتے میں تین دن روزے رکھتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ زندگی بہت ہی قیمتی ہے۔ اللہ پاک کی عطا کردہ ان انمول گھڑیوں کو میں یونہی گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ مرشد پاک میری روحانی رپورٹ سے مطمئن تھے۔

دنیا میں ہم بہت سی ڈوریوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتے داریاں، یہ معاشرتی ذمہ داریاں، ہمارے پیارے رسول پاکؐ نے ان سب ڈوریوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہی اپنے آپ کو اللہ کی رسی سے مضبوط باندھ لیا تھا۔ انہوں نے دنیاوی ذمہ داریوں کو بھی کماحقہ پورا کیا اور اللہ تعالیٰ کے مشن کی ذمہ داری بھی خوب نبھائی۔ حضور پاکؐ کی زندگی میرے سامنے ایک نمونہ بن کر آگئی۔ میں نے اللہ پاک سے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے اپنی محبوب ترین ہستی کی طرز فکر کا عرفان عطا فرما۔

دن گزرتے رہے۔ میں پوری کوشش کرتی کہ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مشن کی ذمہ داریاں بھی صحیح طریقے سے نبھا سکوں۔ دنیاوی اور

روحانی دونوں رخوں میں بھرپور زندگی گزارتے ہوئے اکثر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں خود ایک کتاب ہوں اور میں اپنی ہی کتاب پڑھ رہی ہوں۔ کبھی یوں لگتا جیسے شوہر ایک کتاب ہے جس کو میں پڑھ رہی ہوں۔ کبھی لگتا مرشد ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ رہی ہوں۔ میں سوچتی میں تو اللہ کو پہچاننا چاہتی ہوں اس کا قرب چاہتی ہوں پھر کائنات کی کتاب میرے آگے کیسے کھل گئی۔ تنہائی میں بچپن سے لے کر اب تک کے ادوار میری نظروں سے گزر جاتے۔ ماں کی محبت کے ساتھ ساتھ ذہن کے پردے پر اللہ کے تصور سے عشق۔ پھر سہیلی کی محبت۔ بہن بھائیوں کی محبت۔ حبیب کی محبت اور اب رفتہ رفتہ مرشد کی محبت بھی اسی ہار کا ایک موتی بنتی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا محبت تو ایک کشش کا نام ہے جو خیال کے مرکز سے ذہن کا رابطہ قائم کردیتی ہے۔ تصور کا جو بھی مرکز ہوگا محبت کی کشش بندے کے ذہن کو اس کے قریب کردیتی ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کی پہچان ہوجاتی ہے مگر ان دنوں میری یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اللہ کی پہچان کے لئے اور اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے مجھے بندوں سے گزرنا کیوں پڑ رہا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ عشق حقیقی تک پہنچنے کے لئے مجاز سے کیوں گزرنا پڑتا ہے اور میرے اندر تو عشق مجازی اور عشق حقیقی کی دونوں لائنیں ریل کی پٹڑی کی طرح متوازی چل رہی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ عشق حقیقی والی لائن پر تصور کے پردے پر بس ایک ہی عکس دکھائی دیتا تھا جو بچپن سے اب تک

میرے ساتھ چل رہا تھا اور عشق مجازی کی لائن پر عمر کے مختلف دور میں ایک نئی تصویر آتی جا رہی تھی۔ ہر تصویر اپنے مقام پر نقش دکھائی دیتی تھی۔

میرے تینوں بیٹوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ اس دوران ہمیشہ مجھے یوں لگا جیسے مرشد کی ذات ایک سورج ہے۔ جس کی کرنیں میری دنیا کو منور کر رہی ہیں۔ سورج کے بغیر زندگی کی حرکت نہیں ہے۔ میرا دل اپنی حیات کے لئے اس سورج سے وابستہ رہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس حیات کے لئے جس کی مجھے جنم جنم سے تلاش تھی۔ چاند ستاروں کے ساتھ چلتے چلتے دل یہ بھی بھول گیا تھا کہ چاند ستاروں کی روشنی بھی تو سورج سے مستعار لی گئی ہے۔ سورج کی آب و تاب نے جب چاند ستاروں کو نگل لیا تو مرشد کے تصور نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ میرے تمام حواس اس لمحہ حقیقت کی گواہی پر مستعد ہو گئے۔ زبان اس لمحے کی صداقت کا اقرار کر بیٹھی۔ مرشد کی صوت سرمدی آہستہ آہستہ میری سماعت کی گہرائیوں سے ٹکرانے لگی۔ اے بنت رسولؐ اللہ کے سوا کائنات میں اور کوئی نہیں ہے جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے۔ جہاں تم دو ہو وہاں تیسرا اللہ ہے۔ جہاں تم تین ہو وہاں چوتھا اللہ ہے۔ اللہ ہی ظاہر ہے اللہ ہی باطن ہے۔ اے بنت رسولؐ یاد رکھو نظر جب کائنات کے ڈائی مینشن سے گزر جاتی ہے تو پھر ہر شے کی نفی ہو جاتی ہے اور تصور میں صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ باقی رہ جاتا ہے۔ کائنات کے ڈائی مینشن کو قطع کرنے والی نگاہ قلب کی نگاہ ہے جو باطن میں دیکھتی ہے۔ کائنات کے تمام

ڈائی مینشن باطن میں موجود ہیں۔ روحانی راستوں پر مرشد مرید کے زاویۂ نگاہ کی درستگی کرتا ہے تاکہ اس کی نگاہ اپنے رب کو دیکھ لے۔

مجھے اپنے دل سے بندھی ہوئی بہت سی ڈوریاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جو ڈوری ٹوٹتی مرشد کے ساتھ بندھ جاتی۔ میرے دل کو یقین ہو گیا کہ مرشد کے بغیر اور کوئی مجھے اللہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ مرشد کے سوا اللہ کے ہر عکس نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ انسانوں کے اس جنگل میں کوئی تو ہم زبان نکلا جو روح کے تقاضوں سے واقف ہے۔ روح جس نے ازل میں سب سے پہلے اپنے خالق کو دیکھا اور اس کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ میں جانتی تھی کہ روح کا وہ عہد الست اللہ تعالیٰ کے عشق کا اقرار ہے۔ دنیا میں آکر روح کی نگاہ اسی مقام پر لوٹ جانے کے لئے بے قرار رہتی ہے۔ جس مقام پر اس نے اللہ کو دیکھا اور اسی سے کلام کیا تھا۔

اس موقعہ پر مجھے ایک کہانی یاد آگئی جو مختصراً" یہ ہے کہ مسافر سفر کرتا ہوا ایک ایسی وادی میں پہنچ گیا جو خوبصورت سرسبز پہاڑوں کے درمیان بہت گہرائی میں تھی۔ معصوم فطرت کی کشش نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ وادی میں اتر آیا۔ اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ساری کی ساری بستی ہی نابیناؤں کی ہے۔ جن کے لئے دن اور رات دونوں ہی برابر ہیں۔ اس نے سوچا میں ان کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہوں۔ وہ ان کے درمیان رہنے لگا۔

اسے وہاں ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ وہ اس سے خوبصورت پھولوں کی باتیں کرتا۔ چاندنی راتوں کا تذکرہ کرتا۔ شفق پر پھیلی ہوئی لالی کا ذکر کرتا۔ وہ تو رفتہ رفتہ اسے اندھیروں سے نکال کر رنگ و روشنی کی دنیا میں لانا چاہتا تھا مگر جس نے کبھی اندھیروں کے سوا کچھ دیکھا ہی نہ ہو اس کے لئے یہ باتیں کب قابل قبول تھیں۔ اس نے خوفزدہ ہوکر اپنے بزرگوں سے بات کی۔ تمام بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ ایک بزرگ دانا نے فرمایا کہ میں نے اپنے دادا سے سنا تھا کہ ایک بار ایسا ہی آدمی اس وادی میں آیا تھا وہ بھی ایسی ہی الٹی الٹی باتیں کیا کرتا تھا جب بستی کے لوگوں نے مل کر اس کی دونوں آنکھیں نکال ڈالیں تھیں تو پھر وہ بالکل ٹھیک ہوگیا تھا اور ہماری ہی طرح کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس بزرگ کی بات کو حکیم دانا کا قول سمجھ کر سب نے فیصلہ کرلیا کہ کل اس کی آنکھیں نکال دی جائیں گی تاکہ وہ ہم جیسا ہی بن جائے۔ مسافر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ صبح تڑکے جب سب سورہے تھے چپکے سے اٹھ کر وادی سے بھاگ گیا۔

جب میں نے یہ کہانی پڑھی تو دل سے آواز آئی۔ شمامہ یہ دنیا بھی اندھوں کی بستی کی طرح ہے۔ جن کی امداد کے لئے اللہ آنکھوں والوں کو بھیجتا رہتا ہے۔ میں سوچنے لگی۔ پیغمبروں نے کیسے اس دنیا والوں کے ساتھ گزارا کیا ہوگا۔ ان پر اللہ کا سلام ہو۔ بلاشبہ اللہ کی سلامتی کے دائرے میں وہ حقیقت کے منکر اور ظالم و جاہل لوگوں کے شر سے محفوظ رہے اور اللہ کے

امر کو کمال تک پہنچایا۔ کتنی درست بات ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ دنیا دل کے اندھوں کی ہی تو بستی ہے جو اللہ کے کلام کو جھٹلاتے ہیں۔ میرا دل درد سے بھر آتا۔ میں اللہ میاں سے کہتی کہ ان بے چاروں کا کیا قصور۔ یہ تو ہیں ہی کم عقل۔ انہیں معاف کردیں جیسے جیسے مرشد کی مہربانیوں سے مجھ پر حق کی نوازشات ہوتی جاتیں میرا دل خلق کے غم سے ڈوبتا جاتا اور دل کی گہرائیوں میں روح کی دہائیاں سنائی دیتیں۔

آج بھی میں یہی سوچتی ہوں کہ دنیا بھی کیسی بے وقوف اور اندھی ہے۔ سارے جہان سے محبت کی باتیں کرتی ہے اگر نہیں کرتی تو اپنے رب سے نہیں کرتی۔ سلام ہو میری ماں پر جس نے عشق کا راز مجھ پر کھولا۔ اس نے اپنے عشق کی خوشبو میرے دل میں بھردی۔ مرشد نے خوشبو سے بھری بوتل کا ڈھکنا کھول دیا۔ خوشبو کی ہر لہر میں یہ پیغام ہے۔ اے کلیو' اے پھولوں' اے رنگا رنگ بہارو' خوشبو تمہاری جان ہے۔ اپنی جان سے ہم رشتہ رہو۔ تمہارے رنگ سدا قائم رہیں گے۔

تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ عشق کی حقیقت کیا ہے؟ کیا تم نے اللہ کا کلام نہیں سنا۔

فلا اقسم بمواقع نجوم

قسم ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔

(سورہ واقعہ)

جہاں نظر کے تمام ڈائی مینشن ڈوب جائیں اسی نقطے سے عشق کا آغاز ہوتا ہے۔ اے سننے والے، عشق تو ایک خوشبو ہے۔ جو داستان عشق کے کتنے ہی مقامات پر تمہیں مل جائے گی۔ عشق کا ہر مقام ایک عالم ہے جس میں کائنات کا ہر عکس ڈوب جاتا ہے خواہ وہ عکس ماں کا ہو، سہیلی کا ہو، بھائی کا ہو، شوہر کا ہو یا مرشد کا ہو۔ عشق کی نگاہ کسی عکس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر بار سے آزاد ہے۔ اس کا محبوب تو نظر کا اولین جلوہ ہے جو روز ازل نظر نے دیکھا تھا۔ وہ کون ہے؟ وہ کیا ہے؟ یہ راز تو ان مقامات میں ڈوب کر ہی نظر پا سکتی ہے۔ جن کی قسم کھائی گئی ہے۔ ہے کوئی اس حقیقت کی کھوج لگانے والا ....

مراقبہ

شروع سے ہی مجھے غیب کے بارے میں جاننے کا شوق تو تھا ہی۔ مرشد کی رہبری میں غیب کی سیر کے مواقع حاصل ہوئے تو تقاضائے دل کم ہونے کے بجائے اور بڑھنے لگا۔ مرشد پاک نے مجھے کشف القبور کے مراقبے کے اسباق دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے غیب کو انسان کی نظر سے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ تو انسان کو غیب میں داخل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ البتہ غیب کو اللہ پاک نے شیطان کی نظر سے چھپا رکھا ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں آیا ہے کہ "ہم نے آسمانوں میں بروج بنائے ہیں اور انہیں شیطان کی نگاہ سے چھپا دیئے ہیں۔" اس موقع پر میں نے مرشد کریم سے پوچھا کہ انسان غیب سے واقف کیوں نہیں ہے۔ اتنے تھوڑے لوگ کیوں اس طرف آگے بڑھتے ہیں۔ مرشد پاک فرمانے لگے کہ لوگوں کے ذہن میں دنیا کی قدر و قیمت آخرت کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جس وقت اس کے ذہن کا مرکز دنیا کی بجائے آخرت بن جائے گا۔ وہ اپنی سکت کے مطابق آخرت کا مشاہدہ کریں گے۔ میں نے سوال کیا کہ حضور سکت کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا

قدرت کا قانون ہے کہ آدمی جس قدر کوشش کرتا ہے اسی مناسبت سے اسے اس کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ گویا کوشش کا دائرہ ہی انسان کی سکت ہے۔ آدمی جتنی زیادہ کوشش کرتا جاتا ہے اس کی سکت اتنی ہی زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جس کام کی لگن دل میں ہو اس کام میں کوشش کرنے سے سکت بہت جلد بڑھتی ہے۔ میں نے مرشد کی یہ بات گرہ میں باندھ لی اور بچپن کے شوق کو پورا کرنے میں سعی پیہم کرنے لگی۔

مراقبہ میں ہر روز نئی چیزیں دکھائی دیتیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دماغ کا ہر سیل ایک مائیکرو فلم ہے۔ مرشد کی روشنی اس مائیکرو فلم کو میرے ذہن کے پردے پر دکھاتی جا رہی ہے اور ساتھ ساتھ مرشد کی روشنی مرشد کا تفکر بن کر ان روحانی وارداتوں کی وضاحت بھی کردیتی۔ ایک دن مراقبہ میں کیا دیکھتی ہوں کہ میری نظر کے سامنے ایک خاص دروازہ کھلا۔ خیال آیا یہ بہت ہی خاص راستہ ہے جس سے میں پہلے واقف نہیں تھی میں اس راستے پر قدم رکھتی ہوں۔ اس رستے پر قدم رکھتے ہی یوں لگا جیسے یہ رات کا عالم ہے۔ جس طرح رات کے اندھیرے میں کیمرے کی آنکھ فضا Infra Red Lense کے ذریعے دیکھتی ہے اسی طرح میری آنکھ سے بھی فضا ایسے ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ پر لاشعور کا غلبہ تھا اور تمام شعور پر ایک ہی فکر غالب تھی اور اس فکر کو سوائے عشق کے کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ خواہش محبوب نے مجھے ہر شے سے غافل کر رکھا تھا۔ جیسے میں جوگن بنی دیوانہ وار محبوب کی

تلاش میں پھر رہی ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔ میرے اندر عشق کی اس قدر کسک ہے کہ میں اس درد میں ڈوبی ہر شے سے بے نیاز راستے پر بڑھتی چلی جا رہی ہوں۔ خواہش محبوب نے مجھے خود اپنی جانب سے بھی غافل کردیا تھا۔ بس سارے دماغ پر یہی ایک فکر غالب تھی کہ کسی طرح محبوب سامنے آجائے۔ ایک مقام پر پہنچ کر مجھے نور کا ایک نقطہ دکھائی دیتا ہے۔ میں انہماک کے ساتھ اس نقطے کو دیکھ رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے اور کیمرے کے شٹر کی طرح کھل جاتا ہے۔ میری نگاہ اس نقطے کے اندر دیکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے گہرا اندھیرا ہے مگر اس کا رنگ بہت گہرا سرخ ہے جس میں نیلگوں جھلک ہے۔ جیسے یہ ایک سرنگ ہے۔ اس سرنگ کے اندر دور ایک عکس دکھائی دیتا ہے مجھے سکون مل جاتا ہے۔ میرے اندر کی کسک میں ٹھنڈک سی پڑجاتی ہے۔

مرشد کے تفکر نے اس کی توجیہہ میرے ذہن میں اس طرح پیش کی کہ روح امر ربی ہے اور امر ربی اللہ پاک کے ارادے کا ایک نور ہے۔ جن مراحل سے گزر کر امر ربی اپنے عمل کا دائرہ مکمل کرتا ہے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کے درمیان ایک وقفہ ہے۔ یہی وقفہ موت کہلاتا ہے۔

انسان امر ربی کا شعور ہے۔ امر ربی کے عمل کا دائرہ انسانی شعور کا اپنے ازلی مقام تک پہنچنا ہے۔ انسانی شعور کے راستے میں موت سے متعلق جتنے بھی عوامل ہیں جیسے حشر نشر، یوم الحساب، نفخ صور، اعراف وغیرہ سب کے

سب انسانی شعور کی نشو ونما کا ایک مرحلہ ہے۔ جب روحانی راستوں پر سالک
قدم رکھتا ہے تو اس کا روحانی شعور ان مراحل سے گزر جاتا ہے تو اسے حقیقی
زندگی کا عرفان حاصل ہوجاتا ہے۔ اس روحانی مشاہدے نے میرے ذہن کو
کھول دیا۔ خیال آیا کہ قربانی کا تفکر یہ ہے کہ جس مقصد یا نیت کے ساتھ
قربانی کی جائے اس کام کے راستے میں تمام مراحل آسانی سے طے ہوجائیں
اور کام یا فکر اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
اپنی عزیز ترین چیز اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی نیت سے اپنے بیٹے حضرت
اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی۔ جسے اللہ نے قبول کر کے ان کی جگہ دنبہ رکھ
دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کی فکر کو ابدی زندگی حاصل
ہوگئی۔ اس کا نتیجہ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ قربانی کی سنت آج بھی عید
قرباں کے طور پر جاری ہے۔ حبیب کو میں نے یہ سب کچھ بتایا تو وہ بھی کہنے
لگے کہ ہاں صحیح تو ہے پہلے کبھی ایسی بات ذہن میں نہیں آئی۔ واقعی روحانی
علوم سیکھنے کے لئے شیخ کا ہونا ضروری ہے۔

دو تین دن تک پھر میرے ذہن میں مرنے کے بعد کی زندگی کو جاننے کا
تقاضہ پیدا ہوتا رہا۔ کبھی خیال آتا مرنے کے بعد اعراف میں حبیب کے ساتھ
میری زندگی کیسی ہوگی۔ کبھی سوچتی مرشد کریم جو روحانی راستوں پر قدم قدم
چلا کر مجھے غیب کی دنیا سے مانوس کررہے ہیں۔ اعراف میں میں انہیں کس
طرح پہچانوں گی۔ موت تو حواس کی تبدیلی کا نام ہے۔ اس دنیا میں آدمی ایک

دوسرے کے لئے جو محسوسات رکھتا ہے اعراف میں ان محـ سن
کیا ہوگی؟ کیونکہ زندگی کی حرکات کا حاصل ہی محسوسات ہیں۔ ایک
بچے کو جب گلے سے لگاتی ہے تو ماں اور بچے کے درمیان حواس کا ایک رابطہ
قائم ہوجاتا ہے جو جسم میں دوڑنے والی برقی رو ہے۔ دونوں کے جسموں کی
برقی رو ایک دوسرے میں ٹرانسفر ہوتی ہے جس کا ادراک ماں اور بچہ دونوں
ہی سرور کی صورت میں کرتے ہیں۔ میں سوچتی یہی سرور تو زندگی کا حاصل
ہے۔ اگر ماں اور بچے کو ایک دوسرے کی قربت سے سرور محسوس نہ ہو تو نہ
ماں کبھی بچے کو گود میں اٹھائے نہ بچہ لپک لپک کے ماں کی آغوش میں جائے۔
میں سوچتی انسان کا انسان سے رشتہ محسوسات کی انہی بنیادوں پر ہی تو ہے۔
ماں باپ اور اولاد مخصوص ہیں۔ یہ تمام تعلقات جسمانی وجود کی بنیاد پر ہوتے
ہیں۔ جب یہ مٹی کا جسم ختم ہوجائے گا تو اعراف میں ہم ان رشتوں کو کس
طرح محسوس کریں گے۔

ان دنوں دماغ میں اکثر یہی خیال آتا کہ اس دنیا میں ہمارے محسوسات
کے تار کن کن لوگوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کل کو یہ تار ٹوٹ جائیں
گے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا ہم سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے۔
زندگی کی تو دلچسپی اسی لطف و سرور میں ہے۔ یہی تجسس مجھے گاہے بگاہے
اعراف میں دیکھنے پر اکساتا۔ اور میں مرشد کریم کے بتائے ہوئے طریقے پر
مراقبہ کرتی۔ مجھے اپنے شیخ پر ہمیشہ ناز رہا کہ انہوں نے روحانی علوم سکھانے

میں مجھ پر بھرپور توجہ و محنت سے کام لیا۔ باوجود اس کے کہ میں انگلینڈ میں ان سے کوسوں دور رہی مگر روحانی طور پر وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ راہ سلوک میں میری عقل مرشد کے سامنے ہمیشہ سوالیہ نشان بنی رہتی۔ اس قدر سوالات میرے ذہن میں آتے مگر ان سب کے جوابات بھی مرشد کا تفکر میرے ذہن میں انڈیل دیتا۔ یہاں تک کہ میری عقل مطمئن ہوجاتی۔

ان دنوں مسلسل اعراف کے خیالات آنے کی وجہ سے ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اعراف کہاں واقع ہے۔ ایک دفعہ شیخ نے ذکر کیا تھا کہ اعراف صرف دو سو میل دور ہے۔ اب میں نے سوچا کہ دیکھنا تو چاہئے کہ جس عالم میں مرنے کے بعد ہم کو جانا ہے وہ عالم ہے کہاں۔ بلکہ میں نے شیخ سے اس وقت پوچھا بھی تھا کہ اگر صرف دو سو میل دور ہے تو ہم کیوں نہیں دیکھتے جب کہ سورج نو کروڑ میل دور ہونے کے باوجود بھی دیکھ لیتے ہیں تو جواب یہ ملا تھا کہ ہمارا ارادہ اور توجہ "کُن" کا کام کرتی ہے۔ کن سے غیب میں موجود علوم کے خاکے نقش و نگار بن کر نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔ گویا کُن کی قوت سے غیب مظاہر میں تبدیل ہوجاتا ہے اور آنکھ اسے دیکھ لیتی ہے۔ سورج سے ہم واقف ہیں۔ ہماری توجہ ہر وقت اس پر ہے۔ مگر اعراف سے واقف نہیں ہیں جس کی وجہ سے توجہ نہیں ہے۔ جب بھی توجہ اس کی طرف جائے گی اعراف لاشعوری نگاہ کے سامنے آجائے گا۔ اس وقت شیخ نے فرمایا تھا تم اعراف دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھ لو۔ اللہ نے تو اپنے کلام میں سینکڑوں بار

غور فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس دن ایسا ہوا کہ سارا دن شیخ کے الفاظ ذہن دہراتا رہا۔ دن بھر کام کاج کے دوران آپ کی صورت نگاہوں میں بسی رہی۔ میرے دل کو رات کا انتظار ہونے لگا کہ جلدی سے رات آئے تو مراقبہ کروں۔ ویسے بھی شیخ کے دیئے ہوئے اسباق اور مراقبہ میں مجھے بڑا مزا آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دماغ روشن ہوگیا ہے۔ مراقبہ میں جو کچھ دیکھتی سب سے پہلے حبیب کو بتاتی۔ ان کو بتانے میں بھی مجھے بہت مزا آتا۔ جیسے طالب علم اپنا سبق دہراتا ہے۔

اس رات مراقبہ میں اعراف دیکھنے کے ارادے سے آنکھیں بند کیں تو سب سے پہلے خود میرا اپنا جسم سامنے آگیا۔ اس جسم کے اطراف میں تقریباً" نو انچ کے فاصلے کے بعد روشنیوں کے دائرے تھے۔ میں جان گئی کہ یہ روشنیوں کے دائروں سے ترتیب شدہ جسم میرا جسم مثالی ہے۔ چند منٹ تک میری توجہ اس جسم کی جانب رہی توجہ کے ساتھ ساتھ اس کی روشنیاں میرے اندر جذب ہوتی رہیں اور مجھے اپنے دماغ کے سیلز زیادہ سے زیادہ چارج ہوتے محسوس ہوئے۔ خیال آیا کہ یہ روشنیوں کے دائرے وہ انرجی فیلڈ ہے جس سے میرے جسم کو انرجی سپلائی ہوتی ہے۔ یہ روشنیوں کا جسم میرے مادی جسم کو کنٹرول کررہا ہے۔ اس کے فوراً" بعد ہی یہ جسم آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگیا اور دنیا کا پورا گلوب ذہن کے پردے پر آکر ٹھہر گیا۔ ذہن نے پھر سوال کو دہرایا اعراف کہاں ہے۔ اس سوال کے جواب میں

گلوب کے چاروں طرف روشنیوں کے دائرے بن گئے جس طرح جسم کے اطراف میں دیکھے تھے۔ گلوب کے اطراف میں بھی جسم کی طرح کچھ دور تک خلاء تھا اس خلاء کے بعد روشنیوں کے دائرے شروع ہوتے دکھائی دیئے۔ ذہن میں شیخ کی آواز گونجی۔ یوں سمجھو کہ اعراف زمین کا جسم مثالی ہے۔ جس طرح مادی جسم کے اطراف میں نو انچ کا خلاء ہے اسی طرح زمین کے اطراف میں تقریباً" دو سو میل کا خلاء ہے اور پھر روشنیوں کے دائرے یا عالم اعراف ہے۔ پھر سارا وقت میری نگاہ گلوب کے اطراف میں پھیلی ہوئی روشنیوں کو دور دور تک دیکھتی رہی۔ جس سے مجھے عالم اعراف کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مادی جسم کا تعلق اعراف سے ہے۔ اب میرے شوق دید کو مزید ہوا لگی۔ میں نے سوچا دیکھنا چاہئے کہ میں وہاں کیا کررہی ہوں۔ جیسے ہی ذہن میں یہ ارادہ پیدا ہوا ایک دم سے جیسے کیمرے کا شٹر کھل گیا اور نظر اعراف میں کسی جگہ دیکھنے لگی۔ یہ وژن اتنا صاف تھا جیسے خواب میں دیکھتے ہیں۔

میں نے دیکھا میں سمندر کے کنارے ہوں۔ سمندر کا بیچ ہے۔ ساحل سمندر بڑا خوبصورت بنا ہوا ہے۔ سمندر کے اندر جانے کے لئے اونچی نیچی سیڑھیاں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بنی ہیں۔ ساحل پر پانی تک گول گول چکنے چکنے پتھر ہیں یہ بالکل سنگ مرمر کی طرح سفید ہیں۔ میں اور میری بہن سکینہ ہم دونوں اس ساحل پر بچوں کی طرح کھیل رہی ہیں۔ پانی کی فیروزی لہریں ساحل

سے ٹکراتی ہیں۔ شفاف فیروزی رنگ کے پانی کے اندر دودھ کی طرح سفید پتھر اس قدر خوبصورت لگتے ہیں۔ ہم دونوں تتلیوں کی طرح ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے ہیں۔ میری نظر سکینہ کے بالوں کی طرف گئی اس کے لمبے لمبے سنہری بال اس کے شانوں اور پیٹھ پر لہرا رہے تھے۔ دوڑنے سے ہوا کے جھونکے بالوں کو اور زیادہ پریشان کردیتے۔ وہ بار بار انہیں اپنے چہرے سے ہٹاتی۔ میں پاس آگئی اسے بازو سے پکڑ کر ساحل پر ایک بڑے سے پتھر پر بٹھا دیا۔ میں نے کہا ٹھہر جاؤ میں تمہارے بال سنوار دوں۔ اس ارادے کے ساتھ ہی میں نے اپنے ہاتھ میں ایک کنگھا دیکھا۔ میں اس کے بالوں میں کنگھا پھیرنے لگی۔ ہر بار کنگھا پھیرنے سے مجھے ایک لطف آنے لگا اور میرا جی چاہنے لگا کہ میں بار بار کنگھی پھیرے جاؤں۔ میں کبھی پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی۔ ان کی ملائمیت اور سنہری رنگ کی خوبصورتی کی تعریف کرتی۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ سکینہ کے لئے میرے دل میں محبت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے کنگھی کرنے سے وہ بھی لطف محسوس کررہی ہے۔ اس کے چہرے پر سرور و کیف کی جھلکیاں ہیں۔ جیسے وہ میری محبت کی لہروں کو جذب کررہی ہے اور جذب کرنے کے بعد ان لہروں کی عکاسی اس کا چہرہ کررہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر تک اس کے بالوں میں نہایت ہی محبت کے ساتھ کنگھی کرتی رہی۔ اس کے بال سنوارتی رہی۔ ساتھ ساتھ ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اللہ نے سکینہ کے بال اتنے خوبصورت بنائے ہیں

یعنی اس سارے عمل میں اللہ کا تصور میرے ذہن پر چھایا رہا۔ گویا میں تعریف سکینہ کے بالوں کی کرتی رہی مجھے اس کے بالوں کو چھونے میں اسی لئے مزا آتا رہا کہ ذہن میں یہ تصور مستقل طور پر تھا کہ یہ بال اللہ نے بنائے ہیں۔ میرا جی چاہنے لگا میں ساری عمر اسی طرح سکینہ کے بال سنوارتی رہوں اور مزے لیتی رہوں۔

اس کے فوراً" بعد ہی میرا ذہن شیخ کی طرف چلا گیا۔ دل کی نظر کے سامنے ایک خوبصورت باغ آگیا۔ اس کی سجاوٹ جنت کی یاد دلاتی تھی۔ ہر طرف رنگین پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ سبزہ تھا۔ میری نظر باغ کے ایک کونے پر گئی پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک تناور درخت تھا۔ خوبصورت ہرا بھرا درخت۔ اس درخت کے اوپر خوشبودار بیلیں چھائی ہوئی تھیں۔ جن کے پھولوں اور ٹہنیوں سے بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ درخت کے پاس ایک خوبصورت مسند بچھی تھی۔ اس مسند پر شیخ براجمان تھے۔ میں نے دیکھا شیخ مسند پر بیٹھے ہیں اور انہیں دیکھ کر میرے اندر عقیدت و احترام کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے ہوں۔ میں نے ہندو داسی کی طرح ساڑھی پہنی ہوئی ہے۔ میرا حلیہ ایک جوگن کا سا ہے۔ جوگیا رنگ کی ساڑھی اور چولی پہنی ہوئی ہے۔ ہاتھوں میں تھالی ہے۔ شیخ میرے سامنے ہے۔ میں انہیں نہایت ہی عقیدت سے دیکھ رہی ہوں اور تھالی کو ان کے گرد دائروں میں گھماتی جاتی ہوں جیسے آرتی اتارتے ہیں۔ عمل وہی ہے مگر میرے

دل میں یہ تصور ہے کہ شیخ کی صورت میں میری نظر اللہ کے جمال کو دیکھ رہی ہے۔ میرے ہونٹوں سے جمال حسن کی تعریف کے خوبصورت نغمے نکلنے لگتے ہیں اور میں انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ آرتی اتارتی جاتی ہوں۔ مگر ذہن میں یہ خیال رہتا ہے کہ میں شیخ کے جمال حسن کی نذر اتار رہی ہوں۔ پھر میں تھالی رکھتی ہوں اس کے اندر بے شمار ہیرے جواہرات ہوتے ہیں جن سے یہ تھالی بھری ہوتی ہے۔ میں پاس کھڑے لوگوں کو آواز دے کر پکارتی ہوں۔ سب میرے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اب میں مٹھیاں بھر بھر کر تھالی میں سے جواہرات ان پر یہ کہہ کر لٹاتی ہوں لو یہ میرے شیخ کے جمال حسن کا نذرانہ ہے۔ میرے اندر آہستہ آہستہ عقیدت بڑھتی جاتی ہے۔ شیخ کے جمال حسن کی شعاعیں میرے بدن پر پڑنے لگتی ہیں۔ میرا لباس جوگیا رنگ سے بدل کر سرخ رنگ کا ہو جاتا ہے۔ میرے بدن سے شیخ کی روشنیاں جھلکنے لگتی ہیں اور یہ روشنیاں شیخ کی روشنیوں میں جذب ہو جاتی ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں عشق حقیقی کے سمندر میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئی ہوں۔ میرے بدن کا رواں رواں عشق کی لذت کو محسوس کرتا ہے۔ میرے ذہن سے اس وقت شیخ کا تصور ہی نکل جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اللہ تعالیٰ کے سمندر تجلیات میں غوطہ زن ہوں۔ اس کے بحر عشق میں فنا ہو رہی ہوں مگر یہ فنائیت مجھے ابدیت سے روشناس کر رہی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں ابد تک اس بحر بیکراں میں ڈوبی رہوں۔

سکون

سب بچوں کی شادیوں کے بعد میں نے اور حبیب نے پوری شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کیا کہ جیسے ہم نے ایک بہت بھاری ذمہ داری کو خیر خوبی کے ساتھ نبھا دیا ہے۔ بچوں کی شادیاں بغیر کسی پرابلم کے اطمینان سے نمٹ جائیں یہ بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ ورنہ تو آج کل کے زمانے میں شادی کے سلسلے میں ایسے ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ دل پریشان ہوجاتا ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے ہر طرح کی خبریں تو ملتی ہی رہتیں ہیں۔ میں نے ہمیشہ نوٹ کیا کہ بچوں کی شادیوں میں سب سے زیادہ مسئلہ تو وہاں بنتا ہے جب ماں باپ دونوں کی رائے میں اختلاف ہو۔ ماں اولاد کی شادی اپنے عزیزوں میں کرنا چاہتی ہے' باپ اپنے عزیزوں میں۔ دونوں کی رسہ کشی میں اولاد کے تانے بانے بکھرتے ہیں۔ انجام کار گھر دوزخ کا نمونہ بن جاتا ہے۔ آپس میں بول چال بند۔ گھر میں کھانا پینا بند اور پھر طرہ یہ کہ اس زبوں حالی کا سارا الزام ایک دوسرے کے رشتے داروں پر ڈالا جاتا ہے کہ جادو اور تعویذ گنڈے کئے گئے ہیں تاکہ گھر تباہ ہوجائے پھر عاملوں کے چکر

شروع ہوجاتے ہیں جس سے مزید بربادی مزید رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ عموماً" میں نے یہی دیکھا ہے کہ لوگ بھیڑ چال چلتے ہیں۔ اگر ایک نے غلطی کی تو ساری قوم اندھا دھند اسی کی کاپی کئے جا رہی ہے۔ انسان اگر دنیا میں غیرجانبدار رہ کر زندگی بسر کرے تو معاشرے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔

ایسے ایسے واقعات سن سن کے ہم نے پہلے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ ہم اپنے بچوں کی شادیوں کو مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ میں جانتی تھی کہ حبیب کو اپنے بچوں سے بے پناہ محبت ہے۔ حبیب بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ بچے میری جان سے ہم رشتہ ہیں۔ اس وجہ سے اختلاف رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم دونوں کے پیش نظر بچوں کی خوشیاں رہیں۔ جب دو ذہنوں کا ٹارگٹ ایک ہی ہو تو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ دنیاوی فکروں کا دباؤ انسان کے اعضاء کو اس قدر مضمحل کردیتا ہے کہ پھر وہ انہی فکروں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ میری اور حبیب کی ایک سی طبیعت تھی۔ ہم زیادہ دیر کسی بھی فکر کو اپنے اندر ٹھہرا نہیں سکتے۔ جس کی وجہ سے ہر مشکل بادل کی طرح گزر جاتی۔ ذہن جلدی سے دنیاوی فکروں سے خالی ہوکر پھر اللہ پاک کی جانب اور اس کی قدرت کی جانب متوجہ ہوجاتا۔

پرسکون زندگی کی میرے نزدیک ہمیشہ سے بہت اہمیت رہی۔ یہی کوشش رہتی کہ ہر کام اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ انجام پائے تاکہ دل مطمئن ہو اور دل کا مطمئن ہونا ہی خوشی ہے۔ جو لوگ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو

خاطر میں نہیں لاتے، بڑی بڑی خوشیاں ان سے روٹھ جاتی ہیں۔ کسی صوفی کا یہ قول ہمیشہ میرے دل میں رہا کہ "اگر تو نے گھاس کی ایک پتی کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھا تو گویا ساری خدائی کو ٹھکرا دیا۔" ایک دفعہ شیخ نے فرمایا "خوشی ہی جنت ہے۔" رات کو میں نے حبیب کے سامنے یہی بات دہرائی کہ خوشی جنت ہے۔ کہنے لگے پھر تو ہم جنت میں ہیں۔ اس لئے کہ ہم خوش ہیں۔ میں نے کہا وہ تو ٹھیک ہے مگر آؤ اس بات پر غور کریں کہ ہمیں سب سے زیادہ خوشی دنیا کی کس چیز سے مل رہی ہے اور سب سے زیادہ غم دنیا میں کس چیز سے مل رہا ہے۔ فوراً بولے میری زندگی کی خوشی تجھ ہی سے ہے۔ زندگی کا غم بھی تیری جدائی کا سب سے زیادہ ہوگا۔ پہلے تو ہم دونوں اس بات پر خوب ہنسے پھر جب سنجیدگی سے غور کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی اس دنیا میں سب سے زیادہ خوشی بھی انسان ہی سے حاصل ہوتی ہے اور سب سے زیادہ دکھ بھی انسان ہی سے ملتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ جب دنیاوی خوشیوں کا مرکز خود انسان ہے تو انسان نے اپنی توجہ چاندی سونے کے ڈھیر میں کیوں لگا رکھی ہے۔

ہمارے ایک بڑے اچھے جاننے والے تھے۔ شروع شروع میں تو انگلینڈ جو بھی آیا پہننے کے لئے چند جوڑے اور خرچ کے لئے پانچ پونڈ لے کر آیا۔ یہاں محنت مزدوری کر کے سب نے اپنے قدم جمائے۔ ان دنوں سب کی ہی توجہ معاش کی طرف تھی اور ضرورت بھی تھی۔ جن صاحب کا میں ذکر

کر رہی ہوں ہمارے ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک مراسم تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے آپ کو کام میں اس قدر مصروف کر لیا کہ میل جول کا اور سوشل لائف کا ٹائم ہی نہ رہا۔ فیملی بزنس تھا۔ سارا گھر مصروف۔ کئی سالوں بعد ان کی بیماری کی خبر سن کر ہم ملنے گئے تو وہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ ان کی بیوی نے رو رو کے قصہ سنایا کہ دن رات کام کر کے ہم نے پیسہ کمایا۔ دیس میں رشتے داروں کو بھجواتے رہے کہ وہاں پر پراپرٹی اور دکانیں خریدیں تو ہم کچھ عرصے میں وہیں آجائیں گے۔ اب تک اندازاً لاکھوں روپیہ بھجوا چکے ہیں۔ اب ان کو آنے کا لکھا تو کہتے ہیں کہ یہاں آ کے کیا کرو گے وہ پیسہ تو بھائی بہنوں کی شادی میں ہی ختم ہو چکا ہے۔ اب انہیں اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ سالوں سال ہم سب کولھو کے بیل کی طرح جتے رہے اور ہمیں صلہ کیا ملا؟ رشتے داریاں بھی خراب ہوئیں۔

اس واقعہ سے ہمیں بڑی عبرت حاصل ہوئی۔ ہم نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کا اپنے ارادے میں ایک مقام رکھا ہے اور بندے کو اپنے ارادے سے آگاہی عطا کی ہے اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق زندگی میں اس شئے کو وہ مقام نہیں دیتا تو اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ حبیب کو اپنے دوست کی حالت دیکھ کر بڑا ہی افسوس ہوا۔ راستے میں اس کے رشتے داروں کو برا بھلا کہتے رہے کہ کیسے خراب ہیں۔ میں نے کہا وہ تو سو ہیں مگر اصل غلطی انہی کی ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ مال میں فتنہ ہے۔ اب انہوں

نے اس فتنے کو اپنے پیاروں کے گھر میں منتقل کردیا تو اس فتنے کا فتنہ تو انہی کو
دیکھنا پڑے گا۔ دنیا تو ایک درس گاہ ہے جہاں ہر سبق ہم عملی اور مظاہراتی
طرزوں میں سیکھ رہے ہیں۔ اصل علم قرآن ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ یاد آیا۔ میرا بیٹا اور بہو سیر تفریح کو کہیں
گئے وہاں سے آکر انہوں نے اپنی سیر کا حال سنایا۔ کہنے لگے امی سب سے
زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ہم نے سمندر میں گرم پانی کی رو دیکھی۔
ایک طرف کھولتا ہوا پانی بہہ رہا ہے دوسری طرف اس کے برابر میں ہی
سمندر کا پانی ٹھنڈا ہے۔ دونوں میں لہریں اٹھ رہی ہیں مگر پھر بھی کھولتا ہوا پانی
ٹھنڈے پانی میں مل کر ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اپنی اپنی حدود میں بہتا جاتا ہے۔
میں نے کہا بیٹے اسی بات کو تو قرآن میں اللہ پاک نے بیان کیا ہے کہ "اسی
نے رواں کیا ہے دو دریاؤں کو جو آپس میں مل رہے ہیں ان کے درمیان آڑ
ہے، پس وہ اک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔" (سورہ رحمن) اللہ کا ارادہ
ہی ان کے درمیان آڑ یا برزخ بنا ہوا ہے۔ جب اللہ نہیں چاہتا تو نہیں ہوتا۔

اس وقت مجھے اور زیادہ محسوس ہوا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جس
چیز کا ذکر کیا ہے وہ دنیا میں کہیں نہ کہیں ہمیں ضرور مل جاتی ہے۔ مجھے یوں لگا
جیسے ساری دنیا قرآن کی آیات کا مظاہرہ ہے۔ سارا دن میں اس بات پر غور
کرتی رہی کہ جب اللہ کا علم ہمارے سامنے مظاہراتی صورت میں موجود ہے تو
پھر ہمیں اس کے سیکھنے میں اتنی دقت کیوں پیش آتی ہے۔ رات کو جب میں

شیخ کے دیئے ہوئے اسباق کرنے بیٹھی تو مجھے اپنے ذہن کی گرہیں کھلتی نظر
آئیں کہ علم قرآن ہے اور اس علم کا مظاہرہ کائنات ہے۔ اللہ پاک کے علم
کی طرح کائنات بھی بہت وسیع ہے۔ جب تک ہمارے اندر وسعت نہ ہوگی
ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی آدمی اپنی زندگی میں دنیا کے چپے چپے کو نہیں دیکھ
سکتا۔ کوئی نہ کوئی کونہ باقی رہ ہی جاتا ہے۔ پھر ساری کائنات میں جو مظاہرہ ہو
رہا ہے وہ ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ جواب وہی ہے کہ روحانی حواس کے بغیر
کائنات کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہر چیز زمین سے اگ رہی ہے یعنی زمین پر ہی
مظاہرہ ہو رہا ہے۔ ہماری نگاہ ان مظاہرات کے درمیان بہت سے برزخ یا آڑ
کھڑی کردیتی ہے اگر ان کو گرا دیا جائے تو نظر میں وسعت پیدا ہوجائے گی۔

میں نے محسوس کیا کہ ذہن ایک ہی خیال کو وقت کے مختلف لمحات میں
بار بار دہراتا ہے مگر ہر بار دل کی نگاہ اسے ایک نئے زاویئے سے دیکھتی ہے۔
قرآن میں بھی ایک ہی بات کو کئی جگہ دہرایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ
ہر جگہ اس بات کو نئے زاویئے سے معنی پہنانا چاہئے تاکہ مختلف پہلو سامنے
آئیں۔ یعنی ایک ہی چیز کو نگاہ اور ذہن کا ٹارگٹ بنا کر بار بار نئے نئے
زاویوں سے دیکھنے سے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوجاتی
ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے ذہن کی مرکزیت ضروری ہے۔ اللہ کا قرب
حاصل کرنے کے لئے بھی اللہ کی مرکزیت ضروری ہے۔ اگر ہمیں اللہ تک
پہنچنے میں دشواری پیش آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اور اللہ

کے درمیان برزخ کھڑی کردیتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ آیت گونج اٹھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہر چیز اللہ کی طرف سے آرہی ہے اور اللہ کی طرف جا رہی ہے۔

اس سے پہلے کتنی بار یہ آیت سنی، پڑھی، زبان سے دہرائی مگر اس وقت نہ جانے کیا بات تھی اس آیت سے میرے سارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرا دل بار بار یہ کہنے لگا کہ اللہ نے اپنے راستے میں تو بندے کے لئے کوئی رکاوٹ رکھی ہی نہیں ہے۔ بندہ خود ان رکاوٹوں کو کھڑی کرتا ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ چیز اسے اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ اب مجھے دنیا کی ہر چیز اپنے اور اللہ کے درمیان ایک پردہ نظر آنے لگی۔ دل نے کہا حبیب بھی ایک پردہ ہے۔ اس کے ساتھ مرنے جینے کے وعدے بھی اللہ کے ساتھ دوغلا پن ہے کہ ادھر تو اللہ کو جاننے اور پہچاننے کی اور اس کے قریب رہنے کی دعا کرتے ہیں اور ادھر اگلی زندگی کے تخیل کی ہر تصویر میں حبیب کی شبیہہ ہے۔ دل نے کہا۔ یہ درست نہیں ہے۔ اب اس پردے کو ہٹانا ہی ہوگا تاکہ اصل محبوب کا دیدار ہو۔

کہنا تو بہت آسان ہے مگر کرنا بڑا مشکل ہے۔ بھلا ساری زندگی کا بنا ہوا ایک پیٹرن آخری وقت میں کیا بدل سکتا ہے۔ میری زندگی کے تو ہر ورق پر اسکی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ کبھی دل دھک سے رہ جاتا اگر زندگی اکیلی گزارنی

پڑجائے تو پھر کیا ہوگا۔ کتنے دنوں تک مجھے اندیشے گھیرے رہے۔ زندگی کے ہر قدم پر ساتھ چلتے چلتے ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن چکے تھے۔ وہ جذباتی دور تو اب ختم ہوچکا تھا۔ زندگی کے فیصلوں میں اب دل کے ساتھ ساتھ عقل بھی اپنے قدم ملانے لگی تھی۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ ایک تخت پر شیخ بیٹھے ہیں۔ میں نیچے زمین پر بیٹھی ہوں۔ شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا۔ شامہ ادھر دیکھو۔ میں دیکھنے لگی تو میرے سامنے زمین اور آسمان کے درمیان ایک اسکرین آگیا۔ یہ بالکل سیاہ پردہ تھا۔ میں شیخ کے کہنے پر نہایت ہی محویت سے اس پردے کو دیکھنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد اس پردے پر ایک روشنی پھیل گئی۔ شیخ نے فرمایا۔ شامہ یہ روشنی کس نے بنائی؟ میری نظر اس پردے پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسی طرح کہا۔ اللہ نے۔ اب اس روشنی میں سورج، چاند ستارے بن گئے۔ شیخ نے کہا۔ یہ اجرام فلکی کس نے بنائے؟ میں نے کہا اللہ نے۔ اب میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان تمام سیاروں پر بارش برسنے لگی۔ فرمایا بارش کس نے برسائی؟ میں نے کہا اللہ نے۔ اب میں نے دیکھا کہ زمین سے سبزہ پھوٹنے لگا اور شگوفے نکل آئے۔ کہا کھیتی کس نے اگائی؟ میں نے کہا اللہ نے۔ میں نے دیکھا کہ ہوا کے جھونکوں سے کھیتیاں لہرا رہی ہوں۔ کہا ہوائیں کس نے بھیجیں؟ میں نے کہا اللہ نے۔ اب میں نے دیکھا کہ زمین پر انسان اور تمام جاندار موجود ہیں۔ فرمایا انسان کو کس نے بنایا؟ میں نے کہا

الله نے۔ فرمایا جب سارا کام الله کا ہے پھر تم کیا ہو؟ ان کے یہ کہتے ہی پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہوگیا اور اسی وقت آنکھ کھل گئی۔

میرے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس خواب نے میرے سارے ہی اندیشے نکال دیئے تھے۔ میرے اندر کی آواز کہنے لگی شمامہ سب کچھ اللہ ہی کے ارادے سے ہے۔ پھر اپنی خواہش رکھنا کیا معنی۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق حبیب کو خواب سنا کر کہا کہ کتنے دنوں سے میں یہی سوچ رہی تھی کہ آخرت میں اللہ پاک کے قرب کی دعا کرتی ہوں اور ساتھ ساتھ آپ کے بھی خواب دیکھتی ہوں۔ یہ تو دوغلا پن ہوا۔ انسان کو ایک کا ہی رہنا چاہیئے۔ فورا" بولے یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا۔ تم میری چنداں فکر نہ کرو۔ آخرت میں تو اللہ نے ستر حوروں کا وعدہ ہم سے کیا ہے۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا میاں لگتا ہے کہ اب ہماری محبت رنگ لا رہی ہے۔ آپ بھی آخرت کی باتیں کرنے لگے ہو۔ بولے کیا کریں خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آدمی تو اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے اندر رنگ پکڑنے کی صلاحیت خربوزے سے زیادہ تو ہونی چاہیئے۔ میرا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔ میں نے کہا صحیح ہے میاں آپ نے بالآخر اپنے آپ کو خربوزے سے زیادہ افضل ثابت کرہی دیا۔

اب میرا دل میرا دماغ پورے طور پر روحانی علوم کی طرف لگ گیا۔ میں نے اپنی ساری توجہ شیخ کی طرف لگا دی۔ میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ

شیخ باطنی طور پر اپنے مرید کا پورا پورا دھیان رکھتے ہیں اور جہاں کہیں اس کا ذہن اللہ سے ہٹ کر دنیا کی طرف لپکتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح سالک کے ذہن کو وہاں سے نکال لیتا ہے۔ ایسے ہی موقع کے لئے شیخ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ شمامہ روحانیت کے راستے پر سالک کو کئی نازک مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یاد رکھو سالک مسافر ہے مقیم نہیں ہے۔ مسافر کا کام چلنا ہے۔ خواہ راستے میں درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ملے یا صحرا کی تپتی ریت۔ مسافر کا کام چلنا ہے۔ میں نے اپنے شیخ کی یہ نصیحت پلو سے باندھ لی۔ میں نے سوچا کہ خواہشات کو ترک ہی کرنے میں اللہ کی رضا ہے۔ خواہش خواہ دنیا کی ہو یا عقباء کی۔ اللہ کے ارادے کے سامنے اپنے نفس کی ارادے کی بات کرنا سوائے جہالت کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں نے دنیا کی ہر شے جو بھی سامنے آئی اس میں علم و حکمت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جب مجھے پتہ چلا کہ شیخ نے سالک کو مسافر کیوں کہا تھا کیونکہ سالک کا راستہ روحانی علوم کا ہے اور روحانی علوم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ اللہ پاک کی صفات اور ذات کے علوم ہیں۔ سالک کا سفر اللہ پاک کے لامتناہی علوم میں ہے۔ سالک کی منزل نہیں ہے البتہ مرکز ضرور ہے۔ جس کے گرد وہ طواف کررہا ہے۔ یہ مرکز اللہ کی ذات ہے۔ علم وہ راستہ ہے جس پر ابد تک چلتے رہنے سے بھی یہ راستہ ختم نہیں ہوسکتا۔ جب ذہن میں یہ بات آگئی کہ میں مسافر ہوں اور میرا سفر نہ ختم ہونے والے راستے پر ہے۔ ایسی خوشی مجھے اس سے پہلے کبھی نہ ملی تھی۔ مجھے

یوں لگا جیسے میرے اندر کی شامہ ایک روشنی والے راستے پر خوشی خوشی دوڑی چلی جا رہی ہے۔ میں جان گئی روح ہوا کی طرح ہے۔ جس کی فطرت چلنا ہے۔ مجھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول یاد آیا جس میں آپؐ نے فرمایا کہ علم سیکھنے کے لئے ہمیں اگر چین بھی جانا پڑے تو ضرور جاؤ۔ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بات فطرت کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو علم سے دور رکھتے ہیں وہ اپنی روح کی فطرت پر کتنا جبر کرتے ہیں۔ علم میں ذہن لگانے سے عقل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور شئے کے اندر کی حکمتوں پر نظر پڑنے لگتی ہے۔

ایک دفعہ میں پھولوں سے بھری کیاریوں کے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے رنگ برنگے پھولوں کی طرف دیکھا۔ خوبصورت پھولوں پر نظر ٹک گئی۔ اتنے میں ایک شہد کی مکھی کبھی اس پھول کبھی اس پھول پر منڈلانے لگی۔ ذہن میں ایک دم ٹک سا ہوا۔ خیال آیا مکھی ہر پھول سے رس چوستی ہے جس سے شہد بنتا ہے جو ہر بیماری کی دوا ہے۔ اس کا مطلب ہر پھول میں کسی نہ کسی بیماری کی شفا ہے۔ میرا دل چاہا میں ہر پھول سے پوچھوں تمہارے اندر کس بیماری کی شفا ہے۔ مجھے یاد آیا بچپن میں میری ماں جڑی بوٹیوں اور پتھروں سے علاج کرتی تھی۔ ان کے پاس بہت سے مختلف پتھر تھے۔ میں اور مجھ سے چھوٹی بہنیں تھیں۔ جب سخت گرمی پڑتی اور لو چلتی تو صندل کی لکڑی پانی کے ساتھ پتھر پر گھس کر اس کا لیپ ہماری پیشانیوں پر لگا دیتیں۔ اس سے ٹھنڈک

رہتی۔ مجھے تو اب صرف چند پتھروں کے نام یاد ہیں۔ گاروڑی، زہر مہرہ، کھوپر چٹہ اس کے علاوہ کوڑیاں بھی تھیں۔ کبھی کسی پتھر کو چولہے کی بھوبل میں گرم کر کے پانی میں بجھا کر اس کا پانی پلاتیں، کبھی کوئی پتھر گھس کر اس کا لیپ سا چٹا دیتیں۔ بخار، زکام، کھانسی، پھوڑے پھنسیاں غرضیکہ زیادہ تر امراض میں وہ پتھروں سے ہی ہمارا علاج کیا کرتی تھیں۔ ہم ایسے نکمے نکلے کہ جب ہم بڑے ہوئے تو ہم نے کہا ”اماں کیا پرانے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ یہ پتھر وتھر چھوڑیں۔ ڈاکٹر سے دوائی لے آتے ہیں۔“ اب آج افسوس ہوتا ہے۔ پتھروں کے نام ہی یاد کر لیتی۔ چلو خیر۔ اماں کی روح تو خوش ہو ہی جائے گی اس تذکرے سے۔ آج یہ احساس ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں اکثر لوگ چیزوں کی حکمت سے واقف تھے۔ وہ ہر شئے کے خواص جانتے تھے ماڈرن زمانہ ایسا آیا کہ فطرت کی ہر چیز کو بس ظاہر میں ہی دیکھ دیکھ کے خوش ہو لیتے ہیں۔ اگر ریسرچ کرتے بھی ہیں تو ایسی کہ اس کے اندر کی تمام توانائیوں کا استعمال غلط ہی ہو جاتا ہے ورنہ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نوع انسانی کو سکون نہ ملے۔

تجلی

میری ماں کہا کرتی تھیں بیٹا اولاد اللہ کی امانت ہے۔ کسی امانت کی جان سے بھی زیادہ حفاظت کرنی چاہئے۔ میں نے اپنی اولاد کو ماں کی اسی فکر کی روشنی میں پالا۔ جب تک بچے گھر کے اندر رہتے میں دل و جان سے ان کی خبرگیری کرتی اور جب یہ گھر سے باہر قدم نکالتے تو انہیں اللہ کے سپرد کردیتی کہ غیب میں انہیں تیری ہی نظر دیکھ سکتی ہے۔ چاروں بچوں کی شادیوں کے بعد میرے کندھوں سے اس امانت کا بوجھ اترتا محسوس ہوا۔ میں اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرتی۔ بچوں کے لئے بس یہی دعا کرتی کہ اللہ انہیں دنیا و آخرت میں سدا خوش رکھے۔ ایک دن یونہی فارغ بیٹھی تھی کہ ماں کا یہ قول یاد آگیا کہ بیٹا اولاد اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ میں سوچنے لگی۔ امانت سے ماں کی کیا مراد تھی؟ یہ سوال سارا دن دماغ میں گردش کرتا رہا پھر رات کو مراقبہ میں دیکھا کہ شیخ کا نورانی ہیولا سامنے آگیا ہے۔ اس ہیولے نے ہاتھ میرے سامنے کیا۔ ان کی چٹکی میں کوئی چیز تھی۔ میں نے دیکھا کہ انگوٹھے اور انگلی کے درمیان ان کی چٹکی میں ایک بیج ہے۔ انہوں نے یہ بیج میرے

سامنے زمین پر گرا دیا۔ بیج زمین کے اندر مٹی میں دھنس گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس میں سے ننھی سی کونپل پھوٹ نکلی اور دیکھتے دیکھتے ایک تناور درخت سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس دوران شیخ کے ہیولے سے روشنی کی لہریں میرے اندر برابر جذب ہوتی رہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سوال کا جواب مل گیا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی شیخ کی شبیہہ سامنے سے غائب ہوگئی۔ اب میری فکر نے پھر اس تمثیل کو دہرایا۔ میں نے دیکھا میرے رحم کی زمین پر بچے کی تخلیق کا جین بیج کی حیثیت سے بویا گیا۔ ایک مدت معینہ تک میرے رحم نے اس امانت کی پرورش کی۔ جب رحم اس کو اٹھانے سے عاجز آگیا تو سارے جسم کے حواس اس کی حفاظت کے لئے مستعد ہوگئے۔ میرے ہاتھوں نے اس امانت کو اٹھالیا۔ میری نظریں اس پر اس خیال سے جمی رہیں کہ کہیں پھر وہ میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ میرے کان اس کی رسیلی آواز کا رس ٹپکانے کے لئے ہر وقت اس کی راہ میں رہتے میرا دل اپنی تخلیق کی بلائیں لینے کے لئے ہر وقت بے قرار رہتا اور پھر میں نے جب اپنے سارے حواس کے ساتھ اپنی تخلیق کو پہچان لیا تو میں ماں بن گئی۔

ماں! ایک زرخیز زمین۔ جس زمین میں تخلیقی فکر بوئی جاتی ہے۔ یہ فکر ذات کی امانت ہے۔ جس میں اس کی حکمتیں اور اسرار بند ہیں۔ رحم ایک ایک کر کے اس امانت کو حواس کے پردوں میں لپیٹتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سارے اسرار مادیت کے لباس میں چھپ جاتے ہیں۔ اب ماں کی نظر

پھر اس امانت سے ایک ایک کر کے پردے کھولتی جاتی ہے۔ جب بچہ جوان ہوتا ہے تو وہ خود ایسی زمین بن جاتا ہے جس میں تخلیق کے اسرار پلنے لگتے ہیں۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میرے بچے میری تخلیق۔ میرا عکس۔ مجھے یوں لگا جیسے میں چار آئینوں کے روبرو کھڑی ہوں۔ ہر آئینے میں میرے سراپے کا ایک ایک عکس ہے۔ خوشی کی ایک لہر میرے سارے بدن کے روئیں روئیں پر یہ راز کھولتی ہوئی گزر گئی کہ میں ہی تو وہ امانت ہوں جو اللہ کی فکر خالقیت کا عکس ہے۔ جس کے اندر ساری کائنات کی تخلیق کے اسرار بند ہیں۔

اکثر مجھے محسوس ہوتا جیسے میرے جسم سے ایک اور شامہ نکلی اور آزاد پنچھی کی طرح فضاؤں میں اڑنے لگی وہ جہاں جاتی جو کچھ کرتی میں اسے دیکھتی رہتی۔ کبھی آدھی رات میں بستر پر لیٹے ہوئے بدن میں جھٹکا لگتا اور جھٹکے کے ساتھ میرے اندر سے روح کے پرت نکل کر فضا میں اڑ جاتے۔ میں اپنے اندر ہونے والی تبدیلی سے خوب اچھی طرح واقف تھی کیونکہ شیخ روح کے متعلق جو بھی بات کرتے وہ باتیں میرے اندر داخل ہوجاتیں اور آہستہ آہستہ اپنے وقت میں مجھے ان کے کلام کا تجربہ ہوجاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے شیخ کا ہر کلام میرے اندر دل و دماغ سے گزر کر ظاہر ہوتا ہے۔

روح کے پرت کے متعلق ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ روح اللہ کا امر ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادے سے روح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ روح کو

صورت بخشنے کا مقصد روح سے کام لینا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے روح کے دماغ میں روح سے جو کچھ کام لینے تھے ان تمام امور کا ریکارڈ منتقل کردیا۔ اسی ریکارڈ کو لوح محفوظ کہتے ہیں۔ یہ انسان کا ثابتہ کہلاتا ہے۔ جب سالک کے اندر روحانی شعور متحرک ہوتا ہے تو سالک کی روح اپنے ثابتے کے ریکارڈ میں اللہ کے امر پر جو کام کرتی ہے اس امر کی حرکت سے سالک کا شعور بھی واقف ہوجاتا ہے۔ واقف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روح کے کاموں میں انسان کا ارادہ بھی شامل ہوجاتا ہے۔ روح اللہ تعالیٰ کے امر کی تکمیل کے لئے اپنے ایک سے زیادہ اجسام کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ یہی اجسام روح کے پرت ہیں۔

شیخ کے کلام نے میرے اندر تقاضے ابھار دیئے تھے۔ میں اکثر سوچتی کاش میرے بھی بہت سارے جسم ہوں۔ میں اپنے بہت سارے جسموں کے ساتھ اللہ کے کام کروں۔ شیخ کی یہ فکر میرے اندر سے گزر کر روح کے پرت میں ڈھل کر میرے سامنے آگئی تھی۔ انسان تو اللہ تعالیٰ کا شاہکار ہے۔ اپنے شاہکار میں اس نے کیسے کیسے عجائب بھر رکھے ہیں۔

اس کے اگلے سال حج کے دن قریب آگئے۔ میری چند دوستوں نے مجھے بتایا کہ ہم حج پر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمارا سلام وہاں تک پہنچا دینا۔ حج کا دن آیا تو مجھے نیم خوابیدہ حالت میں یوں لگا جیسے میں خود وہاں موجود ہوں۔ موجودگی کا احساس شدید تھا کہ میرے دل میں یقین پیدا ہوگیا کہ میری

روح وہاں ضرور موجود ہو گی اور حاجیوں کے ساتھ طواف کر رہی ہو گی۔ میں نے حبیب سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔ یہ سوچ کر کہ روح تو اللہ پاک کے امر پر نہ جانے کیا کیا کرتی رہتی ہے۔ میری روح کو اللہ کی یاد آ گئی ہو گی تو وہ وہاں پہنچ گئی۔ روح تو اللہ کی ڈور میں پتنگ کی طرح بندھی ہوئی ہے۔ وہ جدھر کو ڈور کھینچتا ہے ادھر ہی کھنچی جاتی ہے۔ دوسرے سال پھر حج پر جانے سے پہلے مجھے بہت سے فون بھی آئے اور کئی سہیلیاں ملنے بھی آئیں کہ کچھ وہاں سے منگوانا ہو کچھ دعا کرانی ہو تو بتائیں۔ میں نے کہا کہ بس سلام پہنچا دینا اور ہم سب کی سلامتی کی دعا کرنا۔

حج کے دن آئے مجھے پھر یوں لگا جیسے ایک دم سے میں وہاں پہنچ گئی ہوں۔ میں نے مراقبے کی کیفیت میں دیکھا کہ میں بہت تیز رفتاری کے ساتھ وہاں پہنچی۔ جیسے ہی حرم شریف میں قدم رکھا۔ اس وقت حرم شریف حاجیوں سے خالی تھا۔ میں مسجد میں دو ستون کے درمیان آ کر ٹھہر گئی۔ یہاں سے بالکل سامنے کعبہ شریف تھا۔ میں نے دیکھا حرم شریف کا غسل دیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر عرب کے بادشاہ اور عرب کی دوسری حکومتوں کے سربراہ وہاں موجود ہیں۔ گلاب اور صندل اور مختلف خوشبوئیں یہ لوگ پانی میں ڈال رہے ہیں۔ سارا حرم شریف گلاب کی خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔ پھر کعبہ شریف کا دروازہ کھولا گیا۔ ایک سونے کے تھال میں سونے کی بڑی سی کنجی تھی جو عرب کے بادشاہ نے اٹھائی اور کعبے کا تالا کھولا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں بھی

اندر جا کر دیکھوں مگر میں جہاں چھپی کھڑی تھی وہاں سے مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ سب لوگ غسل کعبہ میں مصروف تھے۔ میں نے سوچا اگر میں اس وقت گئی تو سب مجھے دیکھ لیں گے شاید مجھے روک لیں۔ خیال آیا میں اس وقت جاؤں گی جب یہ لوگ نہیں ہوں گے۔ غسل کے بعد غلاف کعبہ کو چوم کر اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے خانہ کعبہ پر چڑھایا گیا۔ اس دوران سب لوگ اکٹھے مل کر قرآنی آیات کی تلاوت باآواز بلند کرتے رہے۔ میں نہایت ہی اشتیاق و عقیدت کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر آب زمزم پی کر واپس آئی۔ اگلے ہی لمحے حاجیوں کے ساتھ تھی جو مزدلفہ اور عرفات میں تھے۔ وہاں سے پھر کچھ دیر بعد میں واپس خانہ کعبہ آئی۔ اب وہاں پر غسل کا کام ہو چکا تھا اور کعبہ کا دروازہ بند تھا۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ طواف کر رہے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہو گئی اور جیسے ہی میں ملتزم کے پاس پہنچی میں نے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر تالے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ چند حاجیوں نے طواف کرتے ہوئے مجھے دیکھا کہ یہ یہاں طواف کرتے کرتے رک کیوں گئی۔ ایک لمحے کو انہوں نے مجھے اس خیال سے دیکھا پھر اپنے ہی خیال کو رد کر کے آگے بڑھ گئے۔ میں ان کے خیال سے آگاہ ہو گئی تھی۔ چند لمحے بعد خانہ کعبہ کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ قفل کھل گیا میں تیزی سے آگے بڑھ کر تھوڑا سا دروازہ کھول کر کہ کوئی دیکھ نہ لے جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا مگر داخل ہوتے ہی

اوپر سے ایک تجلی بیچوں بیچ آکر بیم لائٹ کی طرح ٹھہر گئی۔ اس وقت مجھ پر یہی تاثر غالب تھا کہ مجھے یہاں پر اللہ نے بلایا ہے۔ میں نے تجلی کی روشنی میں کعبہ کے اندر چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک کمرہ دکھائی دیا۔ اتنے میں اس کے اندر تجلیاں چمکنے لگیں اور مجھے اللہ تعالیٰ کی آواز سنائی دی جو مجھے خاص ہدایتیں دے رہی تھی۔ اب میرے ذہن میں صرف اللہ کا تصور باقی تھا اور مجھے اللہ تعالیٰ کی قربت کا احساس ہوا۔ مجھے مشاہدہ ہوا کہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی جنتوں میں سیر کررہی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں تین دن تک خانہ کعبہ کے اندر اپنے رب کے ساتھ رہی۔ اس کے بعد میں اسی طرح دروازے سے باہر نکلی اور تیزی سے مسجد سے گزر کر حرم شریف کے ایک دروازے سے باہر جانے لگی تو دیکھا کہ اب حرم شریف میں حاجی آگئے ہیں اور عرفات سے واپس آتے جا رہے ہیں۔ دروازے سے جب میں باہر جانے لگی تو باہر سے اندر میری ایک جاننے والی آرہی تھی اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے بھی اسے دیکھا ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔ اس کے بعد حاجیوں کا ایک ریلہ آیا اور وہ گم ہوگئیں اور میں جلدی سے باہر نکل گئی۔ باہر نکلتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال تھا کہ حج تو محبوب کے ساتھ قربت اور مشغولیت ہے۔ میرا حج ہوچکا ہے اور میں مراقبہ کی کیفیت سے شعوری کیفیت میں لوٹ آئی۔

کچھ دنوں بعد وہی عورت جب مجھے کعبہ شریف کے دروازے پر ملی

تھی وہ میرے گھر آئی اس وقت حبیب بھی موجود تھے وہ حبیب کے سامنے ہی کہنے لگیں۔ شمامہ بہن حج پر جس طرح آپ سے ایک مرتبہ ملاقات ہوئی پھر آپ ملی ہی نہیں۔ میں مسکرائی حبیب میری طرف دیکھنے لگے کہ شاید میں ہی کچھ بولوں میں نے اپنا راز راز ہی رکھنے میں عافیت جانی۔

اب میری دلچسپی خود اپنی ذات میں بڑھنے لگی۔ میں سوچتی انسان اللہ تعالیٰ کا شاہکار ہے۔ اللہ کی تو ہر تخلیق ہی لاجواب ہے مگر جس کو خدا نے بہترین تخلیق کہا ہے اس میں اس نے کیا کچھ گن نہیں بھر دیئے ہوں گے۔ ساری زندگی ہم خود اپنے آپ کو سمجھنے میں گزار دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے یہ ساری کائنات خود میری روح کا پھیلاؤ ہے۔

ایک دن حبیب سے روح کے حواس کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ میں نے کہا سارے حواس تو روح ہی کے ہیں۔ روح اللہ کے عشق میں سارے جہانوں کی خاک چھانتی رہتی ہے۔ ہنسے کہنے لگے مگر عشق مجازی میں جو مزہ ہے وہ اللہ کے عشق میں کہاں۔ میں نے کہا جس نے آم کبھی چکھا ہی نہ ہو وہ آم کا مزہ کیا جانے پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میاں روح کی تو ساری زندگی الف لیلی کی داستان کی طرح عشق حقیقی کی داستانوں سے رنگین ہے۔ کہنے لگے روح اور اللہ کے متعلق تو تصور ہی نہیں بنتا کہ روح اللہ سے عشق کرسکتی ہے۔ میں تو جب بھی تصور کرتا ہوں تو تم ہی سامنے آجاتی ہو۔ اب کے مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ ہم دونوں کی مرنے

کے بعد کیا حیثیت ہوگی۔ بولے ہم روح بن کر زندہ رہیں گے میں نے کہا ہم تو اب بھی روح بن کر ہی زندہ ہیں۔ مردہ جسم میں حواس کہاں۔ کہنے لگے تو پھر یہ ساری زندگی۔ میں نے کہا روح کی داستان الف لیلی ہی تو ہے۔ میاں یہ کائنات روح کا ایک مے خانہ ہے جس میں جسموں کے ساغر رکھے ہیں۔ ان ساغروں میں شراب اللہ کا نور ہے۔ روح مے خانے کی رونق ہے کہ خود پیتی بھی ہے اور پلاتی بھی ہے۔ جب جام سے جام ٹکراتے ہیں تو رنگین کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ کہنے لگے اس میں اللہ کا عشق کہاں سے ہوا یہ تو روحوں کا آپس میں میل جول ہوگیا۔ میں نے کہا خالی گلاس سے ہونٹوں کی پیاس بجھی ہے کبھی۔ وہ نور جو روحیں اپنے حلق میں ٹپکاتی ہیں وہ اللہ کا نور ہے جو انہیں حیات جاودانی بخش رہا ہے ہر ساغر اپنے اندر ایک رنگین داستان ہے دنیا کے مے خانے کا ایک ساغر تم ہو ایک میں ہوں۔ اس کے اندر پینے والی تو روح ہی ہے اور جس چیز کے پینے سے سرور و لذت حاصل ہو رہی ہے وہ اللہ کا نور ہی تو ہے۔ کہنے لگے تو پھر مذہب نے اتنی پابندیاں کیوں لگائی ہیں۔ میں نے کہا نہ پینے پر لگائی ہیں نہ پلانے پر لگائی ہیں البتہ اصل میں نقل کی ملاوٹ کرنے پر ضرور لگائی ہیں کہ حق کو باطل سے نہ ملاؤ۔ دودھ میں مٹی ڈالو گے تو دودھ کب صاف رہے گا۔ اللہ کی معرفت دودھ کی طرح پاک اور شفاف ہے۔ اس میں نفس کی گندگی ملانے سے پاکی کہاں نظر آئے گی۔ حبیب حیرانی سے مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ ارے بھئی کمال ہوگیا تم تو اب اچھی خاصی

روحانی فلاسفر بنتی جا رہی ہو۔ میں نے بھی فخر سے اپنی گردن مٹکاتے ہوئے کہا میاں یہ سب ہمارے مرشد کریم کا کمال ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ کہنے لگے مجھے ساتھ لے کر چلنا۔ تو ہی تو میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔ میری بھی رگ ظرافت پھڑک اٹھی میں نے کہا۔ میاں ذرا فکر نہ کرو اگر میں آگے بڑھ بھی گئی تو لاٹھی یہیں چھوڑ جاؤں گی اور پھر ہم دونوں کے قہقہوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔

انتظار

سکون دل کی بات چل نکلی تو ایک واقعہ یاد آگیا۔ حبیب کے ایک کزن تھے جن کا نام سلیم تھا۔ جن دنوں ہم انگلینڈ آئے تھے وہ بھی یہاں آئے تھے۔ شروع میں کچھ عرصہ کالج میں تعلیم حاصل کی پھر اس کے بعد کہیں ملازمت کرلی۔ اس دوران کسی یہودی لڑکی سے ان کا معاشقہ چل پڑا۔ یہ آزاد ملک ہے یہاں روکنے والا کون ہے۔ ویسے بھی سلیم کے ماں باپ بہن بھائی سب پاکستان میں تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں دونوں کافی سیریس ہوگئے۔ انہوں نے اپنے والدین سے شادی کی اجازت طلب کی۔ خاندان کے لئے تو یہ خبر بم کا گولا ثابت ہوئی۔ خالہ نے حبیب کو لکھا کہ ان کے بیٹے کو اس شادی سے روکیں۔ ورنہ میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ ہم نے سلیم کو گھر بلایا۔ اسے سمجھایا کہ یہودی لڑکی تمہارے خاندان میں مکس اپ نہیں ہوسکے گی۔ مشکل پڑ جائے گی تم سارے خاندان سے کٹ کر رہ جاؤ گے مگر عشق اور وہ بھی جوانی کا عشق بھلا ذات پات کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ پڑھے لکھے تھے بولے اہل کتاب سے شادی جائز ہے ہم نے کہا بالکل جائز ہے۔ اللہ کے حکم سے کون

انکاری ہو سکتا ہے۔ مگر ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہاں سب کے ذہن اتنے کھلے ہوئے نہیں ہیں۔ جب اپنے ہی رشتے دار مخالف ہو جائیں تو دل کو سکون نہیں ملتا۔ بہرحال شادی تو انہوں نے کرنی تھی شادی ہوگئی۔ بعد میں سلیم کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار بھی یہاں آکر سیٹ ہوگئے مگر مذہبی فرق نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مکس اپ نہ ہونے دیا اور سلیم کے اپنے خاندان والوں کے ساتھ فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ ہمارا بھی ان کے یہاں کچھ اتنا آنا جانا نہ تھا۔ ویسے وہ اپنے گھر میں ٹھیک ٹھاک تھے۔ ان کا یہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی۔ لڑکا بڑا تھا۔ بیٹی چھوٹی تھی۔ جب تک ہمارے بچوں کی پرورش کی ذمہ داریاں ہم پر تھیں ہماری تمام تر توجہ اپنے ہی بچوں پر تھی۔ ہمیں دوسروں کے متعلق جاننے کی فرصت ہی نہ ملی۔ سلیم کے دونوں بچے جوان ہوگئے اور کبھی کبھار کسی موقع پر ان بچوں سے ملاقات ہوجاتی جس کی وجہ سے ہمیں ان کے نظریات کا پتہ چلا۔ لڑکا خوش باش طبیعت کا مالک تھا۔ ایک دن اس سے بات ہوئی تو کہنے لگا میری اسٹڈی میں تو دونوں ہی مذہب رہے ہیں مگر مجھے اپنی ماں کا مذہب پسند ہے۔ میں نے جیوش مذہب اختیار کرلیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے یہودی کہیں۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں اور حبیب اس کی بات سن کر مسکرا دیئے۔ میں نے اس کے مذہبی جوش کو کچھ ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کے کندھے پیار سے تھپتھپائے اور بولی۔ بیٹے دین میں جبر نہیں ہے۔ تم یہودی یا مسلمان ہونے

سے پہلے ایک انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں سب سے پہلے اسی پہچان کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اپنی اس پہچان کو کبھی نہ بھولنا۔ تاکہ اللہ بھی تمہیں اس پہچان کے ساتھ یاد رکھے جو انسان آدم کی حیثیت سے اپنی پہچان بھول جاتا ہے اللہ اس کا شمار جانوروں میں کردیتا ہے۔ تم کو یاد ہوگا جب یہودیوں کے ایک گروہ نے اللہ تعالیٰ کے احکام سبت کی خلاف ورزی کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر بنا دیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنا بندہ بنایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کو بھول کر اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ اللہ اس کا نام آدم کی فہرست سے نکال دیتے ہیں۔ وہ مسکرایا۔ آنٹی آپ کی نصیحت میں ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے خوشی ہوئی میں نے اسے بہت سی دعائیں دی۔

سلیم کی بیٹی ۲۶ سال کی ہوچکی تھی۔ وہ سخت ناخوش قسم کی لڑکی تھی۔ زیادہ لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتی تھی۔ ہر وقت اپنے ہی خول میں بند رہنے والی لڑکی تھی۔ شدید احساس کمتری کا شکار تھی۔ ہم نے سنا کہ اس نے شادی سے انکار کردیا ہے۔ ایک مرتبہ اس سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے ڈیڈی تمہارے لئے فکرمند ہیں تم شادی کیوں نہیں کرلیتی۔ کہنے لگی آنٹی مجھے آج تک یہی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ یہودی ہوں یا مسلم ہوں۔ میں سخت کنفیوژن میں ہوں۔ وقتاً ”فوقتاً“ جب بھی کبھی ملاقات ہوتی میں اسے سمجھاتی مگر وہ بڑی مایوسی کی باتیں کرتی۔ اس کی ایک

وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے دو تین جگہ اپنی پسند سے جاب کرنی چاہی جو اسے نہیں ملی۔ میں نے کئی بار اسے سمجھایا کہ دو مذہبوں میں پھنس کر اپنی شخصیت کو یوں مسخ مت کرو۔ اصل مذہب تو توحید ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے مگر حق تو یہ ہے کہ ہم اپنے مذہبی عقائد کو کلچر میں سمو کر معاشرتی رسم و رواج کو مذہبی درجہ دے دیتے ہیں۔ جن کو اپنائے بغیر ہم اپنی شناخت کا تصور نہیں کرتے۔

ایک دن اس کی میری ملاقات ہوئی۔ اس کے چہرے پر پہلی بار خوشی کے آثار دیکھ کر میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی کہ آج اتنی خوش کیوں ہو۔ مسکرا کر بولی۔ آنٹی بالآخر میں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے بھی مسکرا کے کہا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کون ہے وہ خوش قسمت۔ کہنے لگی ابھی تو کوئی نہیں ہے بس میں نے سوچ لیا ہے کہ نہ میں یہودی سے شادی کروں گی نہ میں مسلمان سے۔ میں انگریز سے شادی کروں گی۔ انگلینڈ میرا پیدائشی مقام ہے۔ اس اعتبار سے میں انگریز ہوں اور انگریز ہی رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا چلو شکر ہے تم اس کشمکش سے نکلیں تو سہی۔ دو کشتیوں میں ایک ایک پاؤں رکھ کر تو کوئی بھی سفر نہیں کرسکتا۔ کچھ عرصہ یوں ہی نکل گیا۔ سننے میں آیا کہ ریگا نے شرط رکھی ہے کہ اسی آدمی سے شادی کروں گی جو بچوں کا خواہاں نہ ہو۔ وہ شادی کے بعد بچے پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ کوئی چھ سات ماہ بعد اسے اس کی پسند کا ایک انگریز نوجوان مل گیا۔ دونوں نے منگنی کی اور پھر دونوں رہنے کے لئے مکان وغیرہ سیٹ کرنے لگ

گئے۔ جس میں تقریباً" چھ سات ماہ اور لگ گئے شادی ہوگئی ہم بھی شریک ہوئے۔ اس کے ماں باپ خوش تھے کہ بیٹی کو اب اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا موقع مل جائے گا۔ ابھی ان کی شادی کو تقریباً" تین ماہ ہوئے تھے کہ ایک دن خبر ملی کہ اس کا شوہر ہارٹ اٹیک میں مرگیا۔ اللہ کے کھیل نرالے ہیں۔ ہر کام اس کے ارادے سے ہی ہو رہا ہے مگر اس کے ارادے کے سمندر میں انسان بھی اپنے ارادے کا جال ڈالے بیٹھا ہے جال مچھلیاں پکڑنے کے لئے سمندر میں ڈالا جاتا ہے بندہ اللہ کے ارادے کے سمندر میں اپنی خواہشات کا جال بچھا کر اللہ کی رضا تلاش کرتا ہے جو بندے اللہ کی رضا کو فراموش کردیتے ہیں وہ اپنی خواہشات کے جال میں نادانستگی میں خود اپنے نفس کا شکار کر بیٹھتے ہیں۔ شاید اس نادان لڑکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور پھر شوہر کی وفات کے بعد وہ دوبارہ مایوسی کے بھنور میں جا پڑی۔ یہ ساری دنیا ایک مکتب ہے۔ انسان سیکھنا چاہے تو ہر شے سے ایک سبق سیکھ سکتا ہے۔

شادی کے تو یہاں بے شمار مسائل ہیں کہیں لڑکا لڑکی کی برادری نہیں ملتی کہیں لڑکے کی تعلیم کم اور لڑکی زیادہ پڑھی لکھی ہوتی ہے۔ کہیں لڑکا لڑکی کی پسند پر ان کے خاندان مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پہلے زمانے کی بہ نسبت شادی میں ناکامی بھی بہت ہو رہی ہے۔ ایک دن حبیب آئے کہنے لگے ابھی ابھی اخبار میں ایک سنسنی خیز خبر پڑھ کر آیا ہوں۔ میں نے کہا وہ کیا۔ بولے پاکستان جاتے ہوئے ایک لڑکی ایئرپورٹ سے غائب ہوگئی۔ ماں باپ

شادی کرنے کے لئے وطن لے کر جا رہے تھے۔ لڑکی ایئرپو، ہوگئی۔ یہ سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ آخر کو میں ماں ہوں ۔ ایک دم نکلا لڑکی کے ماں باپ تو بہت پریشان ہوں گے۔ نہ جانے ایسی مصیبت میں وہ بے چارے کیونکر پھنسے۔ اس خیال کے ساتھ ہی ذہن میں قرآن کی آیت ابھری "خدا تم لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔"

مجھے یاد آیا۔ ایک فیملی کو ہم کافی عرصے سے جانتے تھے نہایت ہی خوش باش فیملی تھی۔ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کا گھر جنت کا نمونہ تھا۔ مگر نجانے کیا ہوا تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ آہستہ آہستہ ان کی بنیادوں کو ہلاتے رہے اور پھر ایک دن باوجود کوشش بسیار کے گھروندے کے تنکے بکھر کر رہ گئے۔ میں نے ان کے تمام حالات شیخ کے گوش گزار کئے کیونکہ مجھے بڑا ہی دکھ تھا کہ آخر ان پر ایسی افتاد کیوں آن پڑی۔ اس وقت شیخ نے فرمایا۔ شمامہ خدا تو لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا۔ لیکن لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا ہر تفکر اس کا ایک قانون و سنت ہے۔ جس کے دائرے سے باہر مخلوق نہیں جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کے تفکر اور قدرت کے دائرے میں کامیابی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے فطرت کے اصولوں کو اپنانا ضروری ہے۔ میں نے کہا مگر بعض اوقات نادانستگی میں کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہیں اور آدمی کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ تو

سراسر ظلم ہے۔ شیخ نے مسکرا کر فرمایا۔ یوں سمجھو کہ تمہیں سخت پیاس لگی
ہے۔ تمہارے سامنے پانی سے بھرا ہوا گلاس دھرا ہے۔ تم بغیر سوچے سمجھے
فوراً" پانی پی لیتی ہو۔ پانی زہریلا تھا۔ معدے میں جا کر زہر اپنا کام دکھاتا ہے۔
اب تم ہی بتاؤ کیا تمہاری لاعلمی کی وجہ سے زہریلا پانی بے ضرر ہو سکتا ہے۔
پانی کی جو خاصیت ہے وہ خاصیت تو ضرور رنگ لائے گی۔ قصور تو تمہارا ہے
کہ تم نے اپنے تقاضوں کی تکمیل میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔
انسان تقاضوں کا مجموعہ ہے۔ ان تقاضوں کی تکمیل کا عرصہ زندگی ہے۔
تقاضوں کی تکمیل فطرت کے بنائے ہوئے اصولوں پر ہے۔ ان اصولوں سے
ہٹ کر تقاضے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ فطرت کا سب سے پہلا اصول جس پر
انسانی زندگی کی بنیاد ہے وہ علم و حکمت ہے۔ اپنی دانست میں انسان کتنا ہی
اپنے آپ کو بے قصور جانے مگر قدرت اسے بے قصور نہیں گردانتی۔ قدرت
کے فیصلے اس کے قانون و سنت کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ جن کے علوم جاننا
خالق نے ہر بنی نوع آدم پر لازمی قرار دیا ہے۔

ان یادوں کے ساتھ ہی دل میں اللہ پاک کے عدل و انصاف پر اور
زیادہ یقین محسوس ہوا۔ میں نے وہی آیت دہرائی اور حبیب سے مخاطب
ہوئی۔ حبیب! اللہ تو لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم
کرتے ہیں۔ حبیب کہنے لگے مگر شامہ خود اپنے نفسوں پر آپ ظلم کرنے سے
بچانے والا بھی اللہ ہی ہے۔

زندگی کی ریل گاڑی اپنی پٹڑی پر رواں دواں تھی اب جب کہ میں نانی
دادی بن گئی تو مجھے ہر وقت یہ خیال گھیرے رہتا کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ جب
میں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتی تو بچپن سے لے کر اب تک زندگی صرف چند
لمحوں سے زیادہ نہ لگتی۔ میں سوچ میں پڑ جاتی کہ عمر کے ساتھ ساتھ ہمارے
سوچنے کے انداز بھی کیسے بدل جاتے ہیں۔ جب تک میں ان لمحوں کی گرفت
میں رہی۔ میرے احساس نے انہیں طویل جانا۔ میں وقت کے شکنجے سے آزاد
ہونے کے لئے پھڑپھڑاتی رہی۔ اسیری کے جان لیوا احساس نے آزادی کے
انتظار کا ہر وقفہ طویل کر دیا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں صدیوں سے جئے جا رہی
ہوں۔ میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کون جانتا ہے وہ دن کب آئے گا جب میں مر کے
حقیقت کی دنیا میں داخل ہو جاؤں گی۔ میں روح کی پکار سے مجبور ہو کر اپنی
بہنوں سے کہہ اٹھتی جب میں مر جاؤں گی وہ دن میری زندگی کا سب سے زیادہ
خوشی کا دن ہو گا۔ تم لوگ مجھے نہلا دھلا کے اچھے سا سنگار کرنا۔ میرے
جنازے کو باجے گاجے کے ساتھ قبرستان لے جانا۔ ہنسی خوشی مجھے سپرد خاک
کرنا تم نہیں جانتی مجھے اس دن کا کتنا انتظار ہے۔ سب کہتیں تم تو پاگل ہو گئی
ہو مگر کچھ عرصے بعد ایک دن ایسی ہی بات جب میں نے کی تو میری چھوٹی بہن
تھوڑی دیر چپ چاپ مجھے گھورتی رہی پھر بولی بی آپا! واقعی اب تو میرا بھی یہی
خیال ہے۔ اعمال کے نیک و بد کے چکروں سے تو رہائی ملے گی۔
میں سوچتی۔ عمر کا یہ دور کیسا ہے۔ جس نے مجھے ایک ایسے پلیٹ فارم

پر کھڑا کردیا ہے جس پر کھڑے ہوکر گذشتہ زندگی بھی ایک لمحے سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی اور موت تک آنے والی زندگی بھی مستقبل کی ایک ساخت لگتی ہے۔ اس مختصر زندگی میں ڈھیر سارے کام یاد آئے۔ اب جی چاہتا جلدی جلدی سارے کام سمیٹ لوں۔ کون جانتا ہے اگلی سانس آئے نہ آئے۔ جو کچھ کرنا ہے ابھی کرلوں۔ وقت کی کمی کے احساس نے پوری توجہ تخلیقی و تعمیری سمت میں لگا دی۔ ہر دم یوں لگتا جیسے زندگی بڑی ہی قیمتی ہے اگر یونہی گنوا دی تو پھر کف افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اس احساس کی شدت ہر وقت یہ سوچنے پر مجبور کردیتی کہ اگلی زندگی کے لئے کیا کرنا ہے۔ یوں لگتا جیسے روح کا اگلا قدم ایک محل کے اندر ہے مگر اس محل کی تعمیر روح اس دنیا میں کررہی ہے۔ ابھی ڈھیروں کام باقی ہیں۔ عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ سوچیں کس قدر بدل جاتی ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب موت کی دہلیز دور بہت دور دکھائی دیتی تھی۔ زندگی کا راستہ لمبا نظر آتا تھا۔ روح کی نظر اپنے سپنوں کے محل پر ہوتی۔ روح کے تقاضے دل کو مضطرب کردیتے۔ زندگی کی وقعت ایک تنکے سے زیادہ نہ لگتی۔ جی چاہتا۔ ایک پھونک میں اس تنکے کو اڑا کے نیست و نابود کردوں تاکہ روح اپنی مراد پاجائے۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے منزل کا نشان تو تھا مگر راستے کا تعین نہ تھا۔ مرشد کریم نے میرے آگے ایسا راستہ کھول دیا جو منزل تک پہنچتا ہے۔ میری منزل میرا اللہ۔ میرا رب میرا اجالا، میری شب۔ روح اپنی نگاہ کے ہر اجالے اور اندھیرے میں

اپنے رب کو دیکھنا چاہتی ہے۔ روح کی نگاہ کا ہر اندھیرا دنیا ہے۔ میرا جی چاہتا میں روح کی نگاہ کے سامنے سے دنیا کی ایک ایک تصویر ہٹا دوں۔ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتادوں۔ کام کٹھن ہے وقت مختصر ہے۔ وقت کی قدر کرو۔

ہمارے پڑوس میں ایک نئی فیملی رہنے کو آئی۔ چند مرتبہ کی ملاقات میں ان خاتون سے میری اچھی دوستی ہوگئی۔ ایک دن شام کو میرے گھر آئیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی، بال الجھے ہوئے بغیر میک اپ کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ انہیں اس حلیے میں اکیلے دیکھ کر میں فکرمند ہوگئی۔ تشویشناک لہجے میں پوچھا۔ اے بہن کیا ہوا۔ کیا افتاد آن پڑی جو ایسی صورت بنالی۔ اس کے گالوں پر موٹے موٹے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں۔ سسکتی ہوئی بولیں۔ مجھے لگتا ہے میں پاگل ہورہی ہوں۔ میں نے فورا" کہا۔ ہائیں یہ مالیخولیا تمہیں کیسے ہوگیا۔ تم پاگل ہو رہی ہو۔ اماں یار، تم تو اچھی بھلی ہو۔ کہنے لگی آج صبح سے میں اپنے میاں سے لڑی جا رہی ہوں۔ میں ہنسی۔ چلو کوئی بات نہیں بیکاری کا کچھ تو مشغلہ چاہئے۔ اس کی سسکیاں اور تیز ہوگئیں۔ آپا تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ میں نے کہا۔ اے بہن یہ بھی تمہارے سمجھانے کا قصور ہے۔ تم سمجھاؤ گی تو سمجھ ہی لیں گے۔ اب ایسے بھی کوڑھ مغز نہیں ہیں۔ یہ سن کر وہ روتے روتے ایک دم مسکرا پڑی۔ میں نے بھی مسکرا کے کہا۔ ہاں اب کہو کیا بات ہے۔ اس نے آنسو پونچھے اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ تقریبا" دو مہینے سے میرا عجیب حال ہے۔ اللہ کا دیا

سب کچھ ہے۔ میاں بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ مگر میرا دل اندر سے بے چین رہتا ہے۔ بات بات پر شوہر سے جھگڑا کرتی ہوں۔ بچے چوں بھی کرتے ہیں تو انہیں دھنک دیتی ہوں۔ میرے اندر غیظ و غضب کا لاوا پکتا رہتا ہے۔ جب یہ اگل دیتی ہوں تو تھوڑا سا چین ملتا ہے۔ پھر اپنے کئے پر شرمسار ہوتی ہوں اور خاوند سے معافی تلافی کرتی ہوں۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا۔ دیکھو بہن یہ بالکل غلط ہے کہ تم اس کی وجہ نہیں جانتیں اپنے اندر کے تقاضے ہم خود ہی سب سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ غور کرو کہ تم کیوں بے چین ہو۔ تمہارے اندر کی بے چینی کس چیز کی طلب گار ہے۔ کہنے لگی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں بے حد گنہگار ہوں۔ میں نے کہا۔ وہ تو ہم سب ہی ہیں۔ آدم کی مٹی کا خمیر ہی نافرمانی کا گناہ ہے۔ جو ہمارے جسموں کے خلاؤں کی تخلیق کر رہا ہے اور انہی خلاؤں کو روح اپنی روشنیوں سے پر کرنے کی پیہم سعی کر رہی ہے۔ اپنے اندر کے خلاء کو غور سے دیکھو تم پر تمہاری بے چینی کا راز منکشف ہو جائے گا۔ اس نے بڑے غور سے میری بات سنی۔ کہنے لگی دو تین دن سے میں برابر یہی غور کر رہی ہوں۔ اصل میں مجھے ہر وقت یوں لگتا ہے جیسے میں بہت زیادہ گناہ گار ہوں اور اللہ میاں مجھے نہیں بخشیں گے۔ جب میں اپنی گزشتہ زندگی میں دیکھتی ہوں کہ میں نے اللہ میاں کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ سے بہت ہی خوف آتا ہے اور پھر میں پاگل سی ہونے لگتی

ہوں۔ میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو نعوذ باللہ کمتر سمجھ رہی ہو۔ تم ہی بتاؤ کیا اللہ پاک کے پاس تمہارے گناہ مٹا دینے کی قدرت نہیں ہے۔ کہنے لگی۔ وہ تو میں جانتی ہوں کہ وہ قدرت رکھتا ہے۔ میں نے کہا پھر تم یقین کیوں نہیں کرتی۔ کہنے لگی میں سارا دن اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی رہتی ہوں۔ لاحول پڑھتی رہتی ہوں کہ شیطان مجھے بہکا رہا ہے۔ میں نے کہا میری بہن تم تو سارا دن شیطان کو یاد کرتی ہو پھر اللہ سے دوری تو اپنے آپ ہوگی۔ خوف دوری کی علامت ہے۔ وہ چونکی۔ کہنے لگی میں شیطان کو کب یاد کرتی ہوں میں تو ہر وقت لاحول پڑھتی رہتی ہوں۔ میں نے کہا آدمی سب سے زیادہ جس کو یاد کرتا ہے اور جس کا ذکر کرتا ہے وہی تو اس کے دل و دماغ سے قریب ہوتا ہے۔ تم اپنے دل و دماغ میں اللہ کو بسالو۔ اللہ کا ذکر کرو تو شیطان کا خیال بھی نہیں آئے گا۔ تم رحمٰن کے تصور اور محبت میں مشغول رہو گی تو رحمٰن خود ہی تمہارے دشمن کو تمہارے قریب نہیں آنے دے گا۔ کہنے لگی گزشتہ زندگی کا کیا کروں اس کا افسوس دل میں بیٹھ گیا ہے۔ میں نے کہا سانپ نکل گیا اب لکیر پیٹنے سے فائدہ۔ تم اپنے تلملاہٹ کا بدلہ بال بچوں سے لے رہی ہو۔ ایک چیز کو بنانے کے لئے جو چیز بنی ہوئی ہے اسے بھی بگاڑ رہی ہو کہنے لگی پھر کیا کروں۔ میں نے کہا میری بہن تم انسان ہو آدم کی اولاد ہو اس آدم کی جس کے لئے اللہ پاک نے قرآن میں فرمایا ہے کہ آدم غلطی کا پتلا ہے۔ آدم کمزور ہے آدم جلد

باز ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ قرآن میں آدم کی بے شمار کمزوریاں بیان کی گئی ہیں مگر ان سب کمزوریوں کے ساتھ اللہ پاک نے آدم کو اپنی بارگاہ میں قبول کر کے اسے فرشتوں سے افضل قرار دیا ہے۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں اور ان سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ اگر اس کے باوجود بھی اللہ نے آدم کو پسند کیا تو تم فرشتہ بن کر اپنے رتبے کو کیوں گھٹانا چاہتی ہو۔ تم اس فکر میں ہر وقت کیوں غلطاں ہو کہ تم اللہ کے سامنے یہ دعویٰ کر سکو کہ تم سے دنیا میں کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا۔ اس کی بجائے تم عملی زندگی کیوں نہیں گزارتیں۔ اپنے بال بچوں کی خدمت کرو۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھو اور ہر دم ان کے لئے خیروعافیت اللہ سے چاہتی رہو۔ خدمت میں عاجزی ہے انکساری ہے جو غیظ و غضب کو دور کرتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کو سمجھ کر پڑھو اور روحانی لٹریچر پڑھو۔ بزرگوں کے واقعات پڑھو جن سے تمہیں سکون و تقویت ملے۔ کہنے لگی بزرگوں کے واقعات پڑھتی ہوں تو اور زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی ضائع کر دی۔ میں ان جیسے کام کیوں نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا تم کو اس لئے افسوس ہوتا ہے کہ تم ان سے اپنا مقابلہ کرتی ہو۔ سیکھنے کے لئے مقابلے کی نہیں بلکہ پیروی کی ضرورت ہے۔ پیروی بندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ بندگی تو کولھو کے بیل سے سیکھنی چاہئے کہ جو آنکھوں پر پٹی باندھے اپنے مالک کے حکم پر کولھو کے چکر لگاتا رہتا ہے۔

میری باتوں سے اس کو بڑی راحت ملی۔ وہ تقریباً روز ہی فرصت کے

وقت میرے پاس آجاتی۔ میرے سامنے اپنے اندر کی آگ اگلتی۔ میں اس پر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ڈالتی رہتی۔ اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ ایک دن وہ بڑی خوش خوش میرے پاس آئی کہنے لگی۔ آپا آج تو میرے میاں کہہ رہے تھے۔ کیا بات ہے خیریت تو ہے۔ دو ہفتوں سے نہ تو تم نے بچوں کی پٹائی کی ہے اور نہ ہی مجھ سے جھگڑا کیا ہے۔ یہ تم پر کس نے جادو کر دیا ہے۔ اس کی بات سن کر میں زور سے ہنسی۔ میں نے کہا اپنے میاں سے کہنا کہو تو جادو الٹا کر دیں۔ وہ گھبرا کر بولی نہ نہ نہ نہ ایسا مت کرنا اور ہم دونوں ہنسنے لگیں۔

اپنی جنت ۔ اپنی دوزخ

عمر کا گھوڑا پر لگا کر وقت کی راہ پر اڑا چلا جاتا ہے کب ٹھہرے گا کون جانتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے روح کی ساری زندگی کہانی در کہانی ہے۔ ایک کہانی کا اختتام دوسری کہانی کے آغاز کی پیش رفت ہے۔ کاتب تقدیر نے ہر روح کی لوح پر اس کی زندگی کی کہانی لکھ دی ہے۔ روح بھی اس دنیا کے پردے پر اپنی لوح کا عکس دیکھتی ہے اور کبھی غیب کے پردے پر اپنی روح کی تحریر کو متحرک دیکھتی ہے۔ تحریر کیا ہے؟ روح کی حرکات کی لمحہ بہ لمحہ تصاویر ہیں۔ وقت کی ڈور جب ہلتی ہے تو تصویریں متحرک ہوجاتی ہیں۔ روح کی نگاہ ان تصاویر میں اس حد تک غرق ہوجاتی ہے کہ ہر تصویر احساس کا لباس پہن کر محسوساتی دنیا میں جلوہ افروز ہوجاتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب حیاتی دباؤ کے بوجھ تلے محسوسات کے خول میں لپٹا ہوا انسان کہہ اٹھتا ہے زندگی میں نے تجھے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ عمر کے اس حصے میں دنیا کی بے ثباتی پر بار بار نظر جاتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا کمہار کا آنگن ہے۔ جس نے قسم قسم کی مٹی کے ظروف بنا کر آنگن میں پھیلا دیئے ہیں۔

مٹی کے کھلونوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ذرا سی چوٹ پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔ کمہار پھر انہیں ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے پھر انہیں کوٹ چھان کر دوبارہ سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ پرانی مٹی سے پھر ایک نیا ظرف تیار ہوجاتا ہے۔ یہ نیا ظرف بھی تو پرانی صورت کا عکس ہے پھر نیا پن کیا ہے؟ میں سوچ میں پڑگئی۔ مٹی بھی پرانی، نقوش بھی پرانے، وہی آدم، وہی جانور، وہی پیڑ پودے۔ جب سے دنیا بنی آدم کو آدم ہی کہا جاتا ہے جو ایک مخصوص صورت کا حامل ہے۔ کبھی شیر آدمی نہیں کہلایا۔ نہ ہی کبھی پیڑ پودے جانور کہلائے۔ پھر قرن ہا قرن پرانی صورتوں میں نظر نیا پن کہاں دیکھتی ہے۔ مجھے یاد آیا ابھی پرسوں کی ہی تو بات ہے ہم اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر گئے۔ گرمی کی وجہ سے کھانا صحن میں لگایا گیا۔ بہو نے بڑا سا پیالہ سامنے رکھا۔ اس میں جوس تھا اور ہر قسم کے پھلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس پر تیر رہے تھے۔ بہو نے سب کو اس میں سے پیالے بھر بھر کے دیئے۔ کہنے لگی امی یہ پنچ ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون سے پھل کا جوس ہے؟ یہ تو بڑے مزے کا ہے۔ کہنے لگی امی میں نے جتنے بھی پھلوں کے جوس بازار میں سے ملے سب اکٹھے ملا دیئے اور کئی قسم کے پھلوں کے ٹکڑ کاٹ کر ڈال دیئے۔ Punch بن گیا۔

اس یاد کے ساتھ ہی میرا دل اندر سے مسکرا اٹھا کہ نیا نام نئی مقداریں ہی نیا پن ہے۔ ذہن کھلا ہوا ہو، دل میں وسعت ہو تو نظر ہر شئے میں اللہ کی حکمت کا مشاہدہ کرلیتی ہے۔ میں سوچنے لگی زندگی کے سفر میں کتنے

لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کتنوں کے نام یاد رہتے ہیں کتنوں کی صورتیں بھی بھول جاتی ہیں۔ جن کے نام جن کی صورتیں ہمارے حافظے میں نقش ہوجاتی ہیں وہ اگلی زندگی میں بھی تو ملیں گے ضرور۔

ایک مرتبہ اسی سوال کے جواب میں مرشد کریم نے فرمایا تھا محبت کشتی کا نام ہے جو دو افراد کو ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔ اس دنیا میں بھی دوستی کی شرط محبت ہے۔ اور اگلی دنیا میں بھی دوستی کا یہی قانون ہے۔ ملاپ اسی وقت ہوتا ہے جب دونوں کے دلوں میں محبت ہوتی ہے۔ یکطرفہ محبت ملاپ کا باعث نہیں بنتی۔ میں نے پوچھا وہ کس طرح؟ فرمایا جیسے ہمارے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے حامل ہیں۔ آپؐ کو اپنی امت کے ہر فرد سے محبت ہے۔ آپؐ کی زندگی میں بھی باوجود آپؐ کی بے پناہ محبت اور رحمت کے جو لوگ آپؐ کو سمجھ نہ پائے وہ آپؐ سے دور رہے اور جن کے دلوں میں آپؐ کی محبت و عشق رہا وہ آپؐ سے قریب رہے اور آپؐ کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ فرمانے لگے۔ کشش روشنیوں کا ایک دوسرے میں جذب ہونے کا نام ہے۔ جب ایک فرد کی روشنیاں دوسرے فرد کی روشنیوں میں جذب ہوجاتی ہیں تو ان روشنیوں کے حوالے سے دونوں افراد ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور یہی پہچان ان کی دوستی کا باعث بنتی ہے۔ روشنیاں کثیف بھی ہوتی ہیں۔ روشنیاں لطیف بھی ہوتی ہیں۔ کثیف روشنی کثیف روشنی میں ہی جذب ہوتی ہے اور لطیف

روشنی لطیف میں ہی جذب ہوتی ہے۔ یہی وہ ہے کہ ایک شرابی کا پکا دوست نمازی نہیں ہوتا۔ انسان کی مثال ایک بوتل کی سی ہے۔ اس بوتل میں یا تو وہ لطیف روشنیاں بھرلیتا ہے یا کثیف۔ جو بھی روشنی ہوگی اسی کا مظاہرہ ہوگا اور اپنے ہی ہم جنس کی کشش باہم ایک دوسرے کی قریب کردے گی جس طرح پانی میں تیل جذب نہیں ہوتا اسی طرح کثافت میں لطافت جذب نہیں ہوسکتی۔

میں سوچنے لگی زندگی اس قدر قیمتی ہے۔ اس کی قیمت کو پہچاننے کے لئے صحیح رہنمائی بھی ضروری ہے اور پھر اس رہنمائی پر عمل بھی لازمی ہے۔ عمل ہی انسان کی بوتل میں لطیف یا کثیف روشنیاں جمع کرتا ہے۔ آسمانی کتابوں میں واضح طور پر اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق آپؐ نے فرمایا ”جب کوئی مومن تیسرا کلمہ پڑھتا ہے تو جنت میں اس کے لئے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔“ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بندے کا ہر عمل ایک صورت رکھتا ہے۔ خواہ یہ صورت اسے دنیا میں دکھائی دے یا نہ دے مگر آخرت میں وہ انہیں دیکھے گا اور اپنے اعمال و افعال کے حوالے سے انہیں پہچان بھی لے گا۔ عمل اچھا ہوگا تو جنت کی کوئی نہ کوئی شے حاصل ہوجائے گی اور اگر عمل برا ہوگا تو دوزخ کی کوئی نہ کوئی شے حاصل ہوگی۔ انسان اپنی جنت اور اپنی دوزخ ہر وقت ساتھ لئے پھرتا ہے۔

زندگی کا ہر دور نئے تقاضے لے کر آتا ہے ان تقاضوں کی بنیاد بھی علم پر ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپے میں علم ہی اس دور کا شعور بنتا ہے اور اسی مناسبت سے تقاضے بھی ابھرتے ہیں مگر ہر دور میں مستقبل کا خیال آدمی کو آنے والے وقت کے ساتھ منسلک رکھتا ہے تاکہ آنے والے وقت میں اپنے آپ کو فٹ کرنے کے لئے احتیاطی تدابیر کرلی جائے۔ لڑکپن کے تانے بانے پر جوانی کے نقوش ابھرتے رہے۔ جوانی کے تانے بانے بڑھاپے کے نقش و نگار بنتے رہے اور اب بڑھاپا پھر ایک نئے مستقبل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ نیا مستقبل، نیا عالم، نیا دور میرا سارا انہماک اس نئے عالم کی جانب ہوگیا جو موت کی دہلیز کے اس پار ہے۔ مجھے یاد آیا میرے شیخ نے کن خوبصورت الفاظ میں زندگی اور موت کا فلسفہ کس حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا تھا۔ فرمایا۔

"زندگی اور موت گویا روح کے دو لباس ہیں۔ زندگی کا لباس پہن کر روح دنیاوی زندگی کا لطف اٹھاتی ہے اور موت کا لباس پہن کر غیب کے عالم میں موجودگی کا لطف اٹھائے گی۔ جس طرح آدمی ایک لباس اتار کر دوسرا لباس پہنتا ہے۔ روح بھی زندگی کا لباس اتار کر موت کا لباس پہنتی ہے مگر کوئی بھی ذی عقل سربازار کپڑے نہیں بدلتا۔ اس کام کے لئے موزوں جگہ تلاش کی جاتی ہے جو لباس بدلنے کی تیاری ہے اسی طرح موت کی تیاری بھی ضروری ہے۔"

میری موٹی عقل میں شیخ کی باریک بات سوئی میں دھاگے کی طرح سما

گئی۔ میں نے ایک نئے عزم کے ساتھ پوچھا۔ "اس تیاری کے لئے انسان کو کیا کرنا چاہئے۔" فرمایا "اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال میں لانا چاہئے۔ آدمی اس صلاحیت کو زیادہ وسعت دے سکتا ہے جس سے پہلے ہی واقف ہو۔ مثلاً کوئی شخص اگر آرٹسٹ ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ تصویریں بنا کر اس لائن میں اپنا نام پیدا کر سکتا ہے مگر یاد رکھو جس کام میں اللہ کے لئے کرنے کی نیت کی جائے، وسعت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ نفسانی اور دنیاوی اغراض سے کیا گیا ہر کام محدودیت میں قید ہوجاتا ہے۔" شیخ کی اس نصیحت کو حبیب بھی اچھی طرح سمجھ گئے۔ اب ان کا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا کام کریں جو عمر کی تمام کوتاہیوں کی تلافی کرسکے۔

ایک دن ہم اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سردی کا موسم تھا برف پڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشوں سے نظر دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ پیڑ پودے، مکانات، زمین ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی جیسے کسی نے ہر شے پر سفید چادر پھیلا دی ہو کچھ دیر تک ہم دونوں برفباری کے اس خوبصورت منظر کو دیکھتے رہے۔ برف کی سفیدی ہمارے اندر کے تقدس کو ابھارتی رہی۔ خیالات بھی برف کی طرح صاف صاف آنے لگے۔ میں نے کہا حبیب دیکھو فطرت کا ہر کام وسعت ہی ہے۔ برفباری، بارش، ہوا، سبزہ، آسمان، زمین غرضیکہ ہر وہ شے جس میں فطرت کا براہ راست عمل دخل ہے ان کا مظاہرہ اجتماعیت میں ہو رہا ہے۔ چاند سورج کی روشنی بھی سارے جہاں کو منور کرتی

ہے جو شے بھی فطرت کے ارادے پر کام کرتی ہے وہ مخلوق کو اجتماعی طور پر فائدہ پہنچاتی ہے۔

حبیب بولے۔ سوائے انسان کے۔ میں نے کہا۔ جب تک انسان اپنا ذاتی ارادہ استعمال کرتا ہے اس کا عمل کرتا ہے اس کے اعمال و افعال میں وسعت آجاتی ہے۔ حبیب کہنے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ عمل جس کا فائدہ و اثر اجتماعیت میں ہو رہا ہے وہ اللہ کی رضا کے عین مطابق ہے۔ کہنے لگے۔ شامہ اب میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ ہم سے بہت خوش ہو جائیں۔ میں نے کہا۔ چلو دونوں مل کر اس بات پر سوچتے ہیں کہ ایسا کون سا کام ہم کریں کہ اللہ ہم سے خوش ہو جائے۔

جانتے ہو حبیب میں بھی دو تین دن سے یہی سوچ رہی تھی کہ ہم نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے مگر اس کے باوجود بھی ہم اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش ہیں۔ کامیاب زندگی کے تجربوں میں دوسروں کو بھی تو شامل کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم نے اپنی ازدواجی زندگی کا تجربہ کیا تو جو بنیادی بات ہمیں اس میں دکھائی دی وہ یہ تھی کہ ہم نے اپنی گھریلو زندگی میں کسی بھی رشتے دار کے عمل دخل کو اپنے اوپر مسلط نہیں کیا۔ گھر کے ہر معاملے میں فیصلہ ہم دونوں کے ہی مشورے سے ہوتا رہا۔ جو میں نے کہا وہ حبیب نے مان لیا جو حبیب نے کہا وہ میں نے مان لیا۔ اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے کام میں بھی ہم نے دوسروں سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں

کی۔ جیسے حبیب کا انگلینڈ آنے کا پروگرام۔ مکان بنوانے کی ارادہ۔ بچوں کی شادیوں کے فیصلے۔ ان تمام کاموں میں ہم نے کسی رشتے داروں سے نہیں پوچھا۔ البتہ اگر کسی نے کوئی مشورہ دیا بھی تو وہ اگر ہمارے من کو بھایا اور ہمارے لئے سودمند ہوا تب ہم نے مانا۔ بچے جب جوان ہوئے تو انہیں بھی اپنے کاموں اور مشوروں میں شامل کرتے رہے۔ تمام بچوں کی شادیاں ان کی مرضی کے مطابق کیں اور شادی کے بعد ان کی زندگی میں دخل انداز نہیں ہوئے۔ البتہ جب بھی انہیں کسی مدد کی ضرورت ہوئی ضروری کردی۔ ہم نے اپنے بچوں کے اندر شروع سے ہی یہی فکر منتقل کرنے کی کوشش کی کہ گھر کی مثال ایک ملک کی سی ہے۔ اس ملک کا بادشاہ اور رانی میاں بیوی ہوتے ہیں۔ لہٰذا گھریلو معاملات میاں بیوی کے ہی ارادے اور فیصلوں کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ سب کے اندر قوت ارادی و قوت فیصلہ بڑھ گئی اور سب آزادی کے ساتھ اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ اس سے ان کے اندر اپنی غلطیوں کو اور اپنی ناکامیوں کو درست کرنے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کے ارادوں میں آزاد بنایا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ بڑوں کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کے اندر صحیح قوت فیصلہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ صحیح قوت فیصلہ ہمیشہ فرمانبرداری کے ذہن سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے لئے ادب بنیادی ضرورت ہے۔ ہر مذہب اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔ اخلاقیات ہی وہ راستہ ہے جس راستے پر چل کر نوع انسانی کی

طرز زندگی دوسری انواع سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

آج کے دور میں نسل انسانی مشکلات و مصائب میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ خواہ وہ انسان یورپ کا باشندہ ہو' ایشیا کا یا افریقہ کا ہر جگہ بے سکونی کا دور دورہ ہے۔ زندگی بھر کا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس کی وجہ اخلاقیات کا فقدان ہے۔ اخلاقی طرز میں بشری فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر شے کو اس کی فطرت پر پیدا کیا ہے اور فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ مذہب میں اخلاقیات کا درس دراصل بشر کو اس کی فطرت اور طبعی حالت سے آگاہ کرنا ہے۔ وہ طبعی فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے بشر کو پیدا کیا ہے۔ ان کی حدود میں رہ کر ہی انسان اپنی شناخت کو قائم و برقرار رکھ سکتا ہے۔ بصورت دیگر جب وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پاسداری نہیں کرتا تو وہ انسانیت کے درجے سے نیچے جا پڑتا ہے۔ نچلا درجہ جانوروں کا درجہ ہے۔ بشر کے اندر حیوانی تقاضے موجود ہیں مگر ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے انسان اور حیوان کے راستے جدا جدا ہیں۔ ایک جنسی تقاضے کو ہی لے لیجئے جو آج کل بشری شناخت کے مٹانے میں اپنا پورا پورا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ انسان اپنے جنسی تقاضوں کو انسانی سطح کے بجائے حیوانی سطح پر پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس تقاضے کی اہمیت اور حکمت سے واقف نہیں ہیں۔ نہ ہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ دھیان صرف جسمانی آسودگی کی جانب لگا ہوا ہے جو جانوروں

کا تقاضہ اور طرز زندگی ہے۔ انسان کے لئے اللہ نے اپنے اندر موجود ہر تقاضے کو جاننے' سمجھنے اور ان کی تکمیل کی حدیں مقرر کی ہیں۔ انسان کی فضیلت علم میں ہے۔ آج کی دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ جنسی قوت تخلیقی قوت ہے۔ اس قوت کو بیدردی سے پامال کرنے سے آدمی کے اندر دماغی اور جسمانی قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا ذہن تعمیری خیالات و فکر سے خالی ہونے لگتا ہے۔

ہم نے سوچا کہ آج کے دور میں جگہ جگہ ایسے اسکول قائم ہونے چاہئیں جہاں نوجوان نسل کو اس کے اندر اٹھنے والے تقاضوں کی نشاندہی کی جائے۔ ان کو حکمتوں سے آگاہ کیا جائے۔ ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے اللہ کی مقرر کردہ حدود کی تعلیم دی جائے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں ان کی Guidance اور مدد کی جائے تاکہ انسان کی شخصیت کا تعفن ختم ہو کر اس کی طبعی خوشبو زمین اور آسمانوں میں پھیل جائے۔

اللہ ھو

حبیب بستر میں بیٹھے مطالعہ کررہے تھے۔ اتنے میں چار سالہ نوید آکر لحاف میں گھس گیا اور بضد ہوگیا۔ دادا کہانی سناؤ۔ کچھ دیر تک تو دادا نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ ان کے انہماک میں ذرا کمی نہ آئی۔ بچے بھی اپنی بات منوانے کے تمام حربے جانتے ہیں۔ اب اس نے ہلا ہلا کر کہنا شروع کردیا۔ دادا کہانی سناؤ۔ میں پاس ہی تھی میں نے کہا۔ اے ہے اتنی دیر سے بچہ ضد کررہا ہے چھوڑو کتاب کل پڑھ لینا۔ آج میرے بچے کو کہانی سنادو۔ حبیب کتاب کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔ ہاں بھئی کون سی کہانی سناؤں۔ نوید بولا۔ دادا جن والی کہانی سناؤ۔ وہ بولے۔

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسولؐ بادشاہ۔ اس بادشاہ کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا تمہارے جتنا۔ ایک دن وہ شہزادہ کھیلتے کھیلتے دور جنگل میں نکل گیا۔ وہاں بہت سارے درخت تھے سوائے درختوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ درختوں میں ایسا گم ہوا کہ اس کے ساتھ آئے ہوئے گارڈ بھی ان کی نظر سے چھپ گئے۔ وہ انہیں ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے

لگا کہ ایک درخت کے نیچے ایک بند بوتل دکھائی دی۔ اسے اٹھالیا۔ بوتل شیشے کی تھی۔ اس کے اندر دیکھا تو اسے صرف دھواں نظر آیا۔ اس نے بوتل کا ڈھکنا کھول دیا۔ ڈھکنا کھلتے ہی نہایت تیزی کے ساتھ دھواں باہر نکلا اور اس دھوئیں میں ایک بہت بڑا جن سامنے آگیا۔ اس نے ادب کے ساتھ شہزادے کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ میرے ماسٹر کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟ شہزادے نے اپنے خوف پر کچھ قابو پاتے ہوئے کہا ہاں ہم نے تمہیں بلایا ہے۔ تم ہمارے لئے کیا کرسکتے ہو؟ جن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی میرے ماسٹر میں آپ کا ہر حکم پورا کرسکتا ہوں۔ شہزادے نے کہا دیکھو ہمارے گارڈ ہمیں تلاش کررہے ہوں گے۔ تم ہمیں ان کے پاس لے چلو۔ جن نے کہا ماسٹر یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ابھی لیجئے۔ یہ کہہ کر جن نے اپنا بڑا سا ہاتھ شہزادے کی جانب بڑھایا اور اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھالیا۔ شہزادے نے جن کے لمبے لمبے بال جو رسیوں کی طرح تھے، پکڑ لئے اور پھر جن شہزادے کو لے کر اڑنے لگا۔ ساتھ میں وہ بار بار شہزادے کو تسلی دیتا جاتا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو ہم گرنے نہیں دیں گے۔

چند ہی منٹوں میں نیچے زمین پر شہزادے کے گارڈ شہزادے کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے دکھائی دیئے۔ شہزادہ انہیں دیکھتے ہی خوشی سے چلایا وہ دیکھو وہ ہیں میرے ساتھی۔ جن یہ سنتے ہی فوراً" زمین پر اتر آیا جیسے ہی گارڈ کے سپاہیوں نے جن کو دیکھا وہ سب خوف زدہ ہوگئے لیکن شہزادے کو دیکھ کر

سب کی جان میں جان آئی۔ شہزادے نے مسکرا کر کہا یہ جن ہمارا دوست ہے۔ تم لوگ اس سے بالکل نہ ڈرو پھر اس نے تمام سپاہیوں سے کہا کہ تم سب بادشاہ کے پاس محل میں جاؤ اور ہم جن کے ساتھ وہیں پہنچتے ہیں۔ تمام محافظ شہزادے کو سلام کر کے محل کی جانب لوٹ گئے۔ شہزادے نے جن کی رسیوں جیسے مضبوط بال پکڑ کر ہلائے اور کہا اے جن اب ہمیں محل میں پہنچادو۔ جن شہزادے کو لے کر بہت تیزی سے اوپر اٹھا اور فضا میں پرندوں کی طرح اڑنے لگا۔ شہزادے کو اب اڑنے میں مزا آرہا تھا۔ وہ مزے سے نیچے دور دور تک دیکھنے لگا۔

چند ہی منٹ میں وہ اپنے محل کے اندر پہنچ گیا ابھی اس کے گارڈ پہنچے بھی نہیں تھے۔ شہزادے کے ماں باپ اتنے بڑے جن کو دیکھ کر سخت حیران ہوئے۔ شہزادے نے بوتل کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے شہزادے سے کہا کہ بیٹے جن کے ساتھ دوستی اچھی نہیں ہے۔ تم اس کو فارغ کردو کہ یہ اپنے گھر چلا جائے۔ شہزادہ تو بچہ تھا۔ وہ ضد پر اتر آیا کہ ابا جان یہ جن تو میرا دوست ہے میں تو اس کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ یہ مجھے آسمان کی سیر کراتا ہے۔ بادشاہ نے کہا بیٹے ابھی تم بہت چھوٹے ہو ابھی تم کو اس سے صحیح کام لینا بھی نہیں آتا تم ہرگز اس سے کوئی ایسا کام نہ لینا جس سے کسی کو نقصان پہنچے ورنہ اللہ میاں تم سے ناراض ہوجائیں گے۔

ننھا نوید اپنی پوری توجہ سے کہانی سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری

طرح کھلی ہوئی تھیں اور نظروں سے کہانی کی پسندیدگی کا اظہار جھلک رہا تھا میری نظریں نوید پر لگی ہوئی تھیں۔ حبیب نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ دوسرے دن شہزادے کو پڑھانے کے لئے اس کا ٹیچر آیا۔ خادموں نے سارا محل چھان مارا شہزادہ کہیں نظر نہ آیا۔ بادشاہ اور ملکہ کو خبر دی گئی کہ شہزادہ محل میں نہیں ہے۔ بادشاہ نے شہزادے کے خادم خاص سے پوچھا کہ شہزادہ کہاں ہے؟ اس نے ڈرتے ہوئے بتایا کہ شہزادہ جن کے ساتھ سیر کو گیا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔ وہ آج پڑھائی نہیں کریں گے۔ بادشاہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ جب شہزادہ واپس لوٹا تو اس وقت بادشاہ نے اسے طلب کیا اور شہزادے کو اس کے ٹیچر کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔ شہزادہ سمجھ گیا کہ اس کے خادم نے بادشاہ سے شکایت کی ہے۔ اس نے خادم کو بلایا اور جن سے کہا کہ اس کی خوب پٹائی کرے۔ جن نے دو ہاتھ ہی مارے تھے کہ وہ بے دم ہوکر زمین پر گر پڑا۔ بادشاہ کے پاس خبر پہنچی۔ اب تو بادشاہ اور ملکہ دونوں بہت پریشان ہوئے کہ کیا تدبیر کی جائے کیونکہ جن تو صرف اپنے ماسٹر کا کہنا ہی مانتا تھا اور اس کا ماسٹر شہزادہ تھا جو اتنا کمسن تھا کہ اسے کسی بات کے اچھے برے کی تمیز بھی نہ تھی۔ ملکہ ماں تھی وہ اپنے بچے کی طبیعت سے خوب واقف تھی اس نے بادشاہ سے کہا کہ آپ ذرا بھی فکر نہ کریں ابھی جن کو قابو کرتے ہیں یہ کہہ کر وہ اپنے بیٹے کی جانب مڑی اور اسے پیار سے گلے لگایا۔ کہنے لگی بیٹے تمہارا یہ جن تو بڑا ہی طاقت ور ہے۔

واہ واہ اتنا بڑا جن تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ واہ واہ یہ تو ہوا میں بھی چڑیا کی طرح اڑتا ہے۔ اس کی تو خوبیاں ایسی ہیں کہ تعریف کرنا بھی ناممکن ہے۔ اپنی تعریف سن کر جن بھی ملکہ کی طرف متوجہ ہوا اور خوشی سے منہ سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالنے لگا۔ ملکہ نے اس کی خوب تعریفیں کیں جن کی وجہ سے شہزادہ بھی بہت خوش ہوا۔ ملکہ نے جب دونوں کو بہت خوش دیکھا تو کہنے لگی مگر ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی آج تک کہ اتنا بڑا جن اس چھوٹی سی بوتل میں کیسے سما سکتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ جن فوراً بول اٹھا۔ یہ میرے لئے کیا مشکل ہے۔ میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں کہ آپ کو یقین آجائے۔ آن کی آن میں وہ دھواں بن کر بوتل میں داخل ہوگیا۔ بادشاہ بوتل کی جانب لپکا اور جلدی سے اس کا ڈھکنا بند کردیا اور خادم سے کہا کہ ہمارا گھوڑا تیار کرو۔ ہم اسی وقت اس بوتل کو سمندر میں ڈال کے آئیں گے۔ پھر ملکہ نے شہزادے کو سمجھایا کہ دیکھو بیٹا جن کے اندر قوت تو بہت تھی وہ جسمانی طور پر بہت طاقتور تھا مگر یہ جن پڑھا لکھا نہیں تھا تعلیم حاصل کرنے سے عقل بڑھتی ہے اگر وہ تعلیم یافتہ ہوتا تو ہرگز بھی دوبارہ بوتل میں داخل نہ ہوتا اور اس بات کی احتیاط رکھتا کہ کہیں کوئی دوبارہ بوتل کا ڈھکنا بند نہ کردے اور وہ پھر سے قید ہوکر رہ جائے۔ تم بھی خوب خوب تعلیم حاصل کرو تاکہ صحیح عقل و ارادہ پیدا ہو اور جن کی طرح احمق اور بے وقوف نہ بن جاؤ۔

پھر حبیب نے نوید کو نصیحت بھی کی کہ "تم پڑھ لکھ کر خوب عقل مند

بننا پھر اللہ میاں بھی تم سے خوش ہوں گے۔" میری نگاہ مسلسل نوید پر تھی۔ نوید کے چہرے میں میری نگاہیں اپنے بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔ حافظہ تیس سال پہلے کی فلم دہرا رہا تھا۔ جب نوید کی جگہ میرے اپنے بچے حبیب سے کہانی سنتے تھے۔ میں سوچنے لگی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وقت بدل جاتا ہے لمحات میں تبدیلی آتی ہے مگر تجربہ تو یہ کہہ رہا ہے کہ لمحات نہیں بدلتے، وقت نہیں بدلتا۔ البتہ لمحات کے اندر کی تصویروں کے چہرے بدل جاتے ہیں۔ وقت کا ہر لمحہ اللہ کے علم کی روشنی کی ایک شعاع ہے۔ اس شعاع کو جو بھی جذب کرتا ہے اس کے اندر کے علوم کا ڈسپلے اس کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ یہ لمحات یہ شعاعیں خود ہمارے اپنے اندر سے گزر رہی ہیں جس کی وجہ سے زندگی میں ایک سے زائد مرتبہ ہم ان کے ڈسپلے کو دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے مرشد کی بات یاد آئی، انسان ایک ایسی مشین ہے جو اللہ تعالیٰ کی کائناتی فلم کو اپنے ارادے سے جہاں سے چاہے وہاں سے دیکھ سکتا ہے کیونکہ یہ فلم انسان کے دماغ کے اندر چل رہی ہے مگر اس دماغ کا شعور حاصل کرنا ہی انسانیت کا کمال و معراج ہے۔ یہی وہ شعور ہے جس کی پیغمبروں نے نشاندہی کی ہے اور اس کو روحانی شعور کہا گیا ہے۔ کتنی عظیم المرتبت ہیں وہ ہستیاں جو لوگوں کو اس شعور سے متعارف کراتی ہیں۔ میرا دل مرشد کی عظمت پر سرنگوں ہوگیا۔ مرشد کی آواز میرے اندر گونجنے لگی۔ شمامہ، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انسان کو دو طرح سے مخاطب کیا ہے۔ ایک رخ میں تو وہ کہتے ہیں کہ یاایھا الناس

یعنی اے لوگو، یہاں مخاطب تمام لوگ ہیں یعنی یہ حکم عوام الناس کے لئے ہے مگر دوسرے رخ میں فرماتے ہیں یاایھا الذین امنوا یہاں مخاطب خواص ہیں۔ یہی وہ خاص لوگ ہیں جو روحانی شعور رکھتے ہیں اور اس شعور کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور تخلیق کے اسرار اور کائنات کے اندر کام کرنے والے فطرت کے نظاموں کو سمجھتے ہیں۔ ان ہی مخصوص ہستیوں میں تمام پیغمبران علیہ السلام کا شمار ہے۔ عوام الناس وہ ہیں جو وقت کی گرفت میں ہیں اور خواص یا مومنین وہ ہیں جو وقت کی گرفت سے آزاد ہیں یعنی وہ اس بات سے واقف ہیں کہ وقت کا دھارا خود ان کے اپنے اندر سے گزر رہا ہے۔ اس آگہی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اس دھارے کی قوت بہاؤ کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ ان کے لئے زندگی کے تمام حالات سازگار بن جاتے ہیں۔

میرے اندر ایک عزم ابھرا میں بوتل کا ایسا جن نہیں بنوں گی جس کا ڈھکنا غیر کے ہاتھ میں ہو۔ مجھے میری ماں کی بات یاد آ گئی۔ شامہ، تو خوشبو ہے اور خوشبو تو ہوا کی طرح پھیلنے والی ہے۔ بوتل میں بند رکھنے کے لئے نہیں ہوتی۔ ماں نے کہا تھا بیٹی، یہ خوشبو سے بھری بوتل اللہ نے بنائی ہے۔ مگر اس بوتل کا ڈھکنا انسان کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ وہ جب چاہے اپنی بوتل کھول لے جب چاہے اس پر کارک لگا دے مگر بیٹی یاد رکھو، باغ میں بند کلیوں کو کوئی بھی نہیں سونگھتا۔ باغ کی سیر کرنے والے بند کلیوں سے نہیں، کھلے ہوئے پھولوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ کلی کا کھلنا ہی کلی کا مقصد حیات ہے۔ انسان کا

مقصد حیات بھی اپنے اندر کی ان خوشبوؤں کو پھیلانا ہے جن خوشبوؤں کے ساتھ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ کلی جب کھل کر پھول بنتی ہے تو اس کی خوشبو دور دور تک پہنچ کر صفحہ ہستی پر اپنے وجود کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق کی پہچان کا باعث بھی بنتی ہے۔ آدمی کا اپنی صلاحیتوں کا استعمال بھی خلق میں خالق کی پہچان کا باعث بنتا ہے کیونکہ ہر شے کے اندر اللہ کے نور کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

ننھا نوید اب گہری نیند سو چکا تھا۔ اس کے نرم ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ حبیب بولے کیا معصومیت ہے۔ کہانی سنتے ہی فوراً سو گیا۔ میں نے کہا نہ جانے خواب میں اپنے گلشن ہستی کی کون کون سی خوشبوئیں سونگھتا ہوگا۔ حبیب مسکرا کے بولے کیا بات ہے کس عالم میں کھوئی ہوئی ہو۔ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا پتہ ہے حبیب آج میرا جی چاہتا ہے میں بھی ننھے نوید کی طرح گہری نیند سو جاؤں۔ حبیب ایک دم زور سے ہنس پڑے تو تم روز کب کچی نیند سوتی ہو۔ میں نے کہا۔ سنو تو میرا جی چاہتا ہے میں خوب گہری نیند سو جاؤں۔ خواب کے عالم میں داخل ہو کر اس دنیا کی ہر خوشبو اپنے اندر بسالوں۔ خود اپنے گلشن ہستی کے ہر پھول کی خوشبو سے واقف ہو جاؤں۔ میری ہر خوشبو اللہ کے نور کی خوشبو بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بس جاؤں۔ نور کے عالم میں جب رحمت کی ہوائیں چلیں گی تو شوخ ہوا کے جھونکے ان خوشبوؤں کو عالمین میں اڑا کر لے جائیں گے جہاں تتلیوں اور

جگنوؤں کی طرح یہ خوشبوئیں حسین گلستانوں میں اڑتی پھریں گی اور فطرت کے معصوم بچے ان کے تعاقب میں اس گل سے اس گل تک بھاگتے پھریں گے اور میں اللہ کی آغوش میں اس کے نور کی سیج پر ابد کی نیند سوتی رہوں گی۔ پھر اس نیند سے مجھے سوائے رحمٰن کے اور کون جگا سکتا ہے۔

حبیب چپ چاپ سنتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں میری فکر کی گہرائیاں اتر آئیں۔ میری آنکھیں خلاء میں عالم تخیل کو تلاش کرتے کرتے بوجھل ہوگئیں۔ میں نے بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آج ماں بہت یاد آرہی تھی۔ میرا دل اس پر رشک کرنے لگا۔ جانے وہ جگنوؤں کے تتلیوں کے نور کے کس عالم میں ہوگی۔ وہاں میری یاد اسے آتی بھی ہوگی یا نہیں۔ جانے میری یاد اسے کیسے محسوس ہوتی ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے میں جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بہت ہی خوبصورت جگہ ہے ہر طرف سبزہ ہے۔ سبزے سے روشنیاں نکل رہی ہیں۔ میں کچھ دیر کھڑی دلچسپی کے ساتھ فضا میں ادھر ادھر دیکھتی ہوں۔ پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے ایک شفاف راستے پر چل کھڑی ہوتی ہوں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک خوبصورت باغ آجاتا ہے۔ ابھی میں اس باغ کے قریب ہی ہوں کہ بہت سے لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آتی ہیں جیسے باغ میں ہنس کھیل رہے ہیں۔ یہ آوازیں میرے شوق کو اور بڑھا دیتی ہیں۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس باغ میں داخل ہوجاتی ہوں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بہت سے نوجوان

مرد اور عورتیں باغ میں پکنک منا رہے ہیں۔ میں غور سے ان کی جانب دیکھتی ہوں کہ شاید ان میں کوئی شناسا مل جائے کہ میری نظر اپنی امی پر پڑتی ہے۔ یہ سب لوگ مجھ سے بہت دور ہوتے ہیں مگر پھر بھی میں اپنی ماں کو پہچان لیتی ہوں۔

اس گلشن میں بے شمار رنگ برنگے پھول کھلے ہیں۔ یہ تمام نوجوان لڑکے لڑکیاں تتلیوں کی طرح کبھی اس پھول پر کبھی اس پھول پر جاتے ہیں اور نئی نئی خوشبوئیں سونگھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میری ماں بھی انہی میں شامل ہے۔ اتنے میں اچانک میری ماں سب کچھ چھوڑ کر کھڑی ہوجاتی ہے اور کھڑی ہوکر کبھی ادھر دیکھتی ہے اور کبھی ادھر دیکھتی ہے۔ جیسے کچھ تلاش کررہی ہو۔ اس کے تمام ساتھی اسے دیکھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا تلاش کررہی ہو۔ وہ کہتی ہے مجھے شامہ کی خوشبو آرہی ہے۔ پھر وہ اس خوشبو کی جانب دیکھتی ہے یہ خوشبو چنبیلی کے رنگ کی نہایت ہی لطیف روشنی کی ایک ہلکی سی کرن ہے۔ میری ماں بے ساختہ اس خوشبو کی جانب کھنچی چلی جاتی ہے وہ نہایت سبک رفتاری سے اس لطیف روشنی کی جانب بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نظر میں یاسمین کا ایک نہایت ہی خوبصورت پھول آجاتا ہے جس کے اندر سے یہ روشنی نکل رہی ہے۔ اب وہ اس پھول تک پہنچ جاتی ہے اور نہایت ہی بے قراری کے ساتھ میری شامہ، میری شامہ کہے جاتی ہے۔ اس کی نظریں پھول پر گڑی ہیں اور وہ اس پھول سے نکلنے والی

خوشبوؤں کو گہری گہری سانسوں کے ساتھ سونگھتی جاتی ہے اور میری شامہ' میری شامہ کہے جاتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ہر طرف سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ وہ پھول کے اندر بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں اس کی نظر مجھ پر پڑتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اس پھول کی گہرائی میں ہوں۔ وہ ایک دم خوشی سے کھل اٹھتی ہے۔ شامہ میری بیٹی' میری خوشبو۔ پھول سے بہت تیزی کے ساتھ نہایت ہی لطیف روشنیاں نکلنے لگتی ہیں۔ ان روشنیوں میں بے شمار رنگ جھلکتے ہیں۔ ماں ان روشنیوں کو تیز تیز اور گہری گہری سانسوں کے ساتھ اپنے اندر جذب کرتی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی بے قراری کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر سکون اور خوشی جھلکنے لگتی ہے۔ پھر وہ واپس اپنے دوستوں میں لوٹ جاتی ہے اور خوشی خوشی ان سے میرا ذکر کرتی ہے اور پھر وہ سب دوبارہ پھر تتلیوں کی طرح باغ میں ادھر سے ادھر گھومنے لگتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں باغ کے دروازے سے واپس لوٹ آتی ہوں اور آنکھ کھل جاتی ہے۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میرا سر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے نام کے ساتھ ہی میری ماں کا رشتہ مجھ سے قائم ہے۔ جب تک میری ماں کے دل میں میرا نام ہوگا اس کا رشتہ بھی میرے ساتھ قائم رہے گا۔ میرے نام کی خوشبو اس تک پہنچتی رہے گی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ حبیب نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ بس سب کچھ نام ہی تو

ہے۔ سارے بندھن نام کے ساتھ ہی بندھے ہیں۔ جب تک نام دل پر نقش رہتا ہے کسی نہ کسی زاویئے سے نگاہ دیکھ ہی لیتی ہے۔ جب دل سے مٹ گیا تو سب بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ سب ناموں میں بس ایک نام ایسا ہے جس کے اندر تمام نام سمائے ہوئے ہیں۔ بس وہی نام دل پر نقش ہو جائے۔ وہی ایک نام جس کے اندر گلشن ہستی کے ہر پھول کی خوشبو ہے۔ وہی ایک نام جو سب سے حسین ہے۔ سب سے لطیف ہے۔ سب سے زیادہ روشن ہے۔ وہی ایک نام جو سب ناموں کا خالق ہے۔ میرے دل سے اللہ ھو کی صدا بلند ہوئی اور سارا گھر خوشبو سے مہک اٹھا۔

اندر کا مسافر

مصنفہ

سعیدہ خاتون عظیمی

سعیدہ خاتون عظیمی ایک معروف مصنفہ ہیں جو اب تک روحانی موضوعات پر کئی کتابیں، کئی مضامین اور کئی سلسلہ وار کہانیاں لکھ چکی ہیں۔

کتاب **اندر کا مسافر** میں

بتایا گیا ہے کہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ یہ زمین بھی حضرت ادھم کے دربار کی طرح ایک بہت بڑا دربار ہے جہاں ازل سے اب تک نہیں معلوم کہ کتنے بادشاہ مسافروں کی طرح آئے.......... مسافروں کی طرح رہے.......... اور مسافروں کی طرح چلے گئے۔

دنیا کی عمر خواہ کتنی ہی ہو اس میں رہنے والے بالآخر ایک دن دنیا چھوڑ دیں گے اور ایک دن .... یہ مسافر خانہ بھی ختم ہوجائے گا۔

کتاب اندر کا مسافر پڑھ کر مادی حواس اور روحانی حواس کی درجہ بندی کا علم حاصل ہوتا ہے .... ذہن میں لاشعوری دریچے کھل جاتے ہیں.......... اندر اور باہر کی دنیا کا ادراک ہوتا ہے۔

معروف روحانی اسکالر اور روحانی سائنس کے مختلف موضوعات پر کئی کتابوں کے مصنف

خواجہ شمس الدین عظیمی

نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں سیرت طیبہ پر ایک خوبصورت کتاب تالیف کی ہے جو کہ دو جلدوں پر مشتمل ہے ۔

محمد رسول اللہ (جلد اول): کتاب کے اس حصہ میں بتایا گیا ہے کہ

☆شرک کو ختم کرنے...... توحید کو عام کرنے اور روحانیت کو متعارف کرانے کے لئے حضور ﷺ نے کس طرح پریشانیوں کا سامنا کیا۔

☆مادیت کا فسوں توڑنے اور الہٰی مشن کو پھیلانے میں حضور نے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کیں۔

☆یہ کتاب پڑھ کر ایک مرکز توحید پر قائم رہنے کا جرات مندانہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

☆یہ کتاب اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر اپنی روح کا عرفان حاصل کرنے اور راہ حق کے متلاشیوں کے لئے مینارہ نور وہدایت ہے۔

قیمت -/65 روپے

محمد رسول اللہ (جلد دوئم): کتاب کے اس حصہ میں بتایا گیا ہے کہ

☆چاند کے دو ٹکڑے ہونیوالے معجزے کی سائنسی توجیہہ کیا ہے۔

☆کنکریوں نے کس فامولے کے تحت کلمہ پڑھا۔

☆منبر رسولؐ کے قریب کھجور کے درخت کے رونے کی آواز صحابہ کرام نے کس قانون کے تحت سنی۔

اس کے علاوہ اللہ کے محبوب رسول کریم کی روحانی زندگی...... کہکشانی دنیاؤں سے خاتم النبیین کا براہ راست تعلق...... اور معجزات کی سائنسی تشریح وغیرہ کے بارے میں بھی کتاب میں وضاحت کی گئی ہے۔

قیمت -/95 روپے

کتاب محمد رسول اللہ تسخیر کائنات کے فارمولوں کی دستاویز ہے اور بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے نشان منزل ہے۔

الکتاب پبلی کیشنز ناظم آباد۔ کراچی فون: 6622784-626433

شرح لوح و قلم

شارح: خواجہ شمس الدین عظیمی

کتاب لوح و قلم کے بارے میں حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ "میں یہ کتاب پیغمبر اسلام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ حکم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بطریق اویسیہ ملا ہے۔"

کتاب لوح و قلم روحانی سائنس پر پہلی کتاب ہے۔ جس کے اندر کائناتی نظام اور تخلیق کے فارمولے بیان کئے گئے ہیں۔ ان فارمولوں کی تشریح کے لئے حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے جو لیکچرز دیئے ہیں ان کو کتاب شرح لوح و قلم میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

کتاب شرح لوح و قلم کا بغور مطالعہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ کائناتی نظام سمجھ میں آجاتا ہے۔ مثلاً عالم اعراف، عالم حشر نشر، عالم برزخ اور عالم ارواح کا علم حاصل ہوتا ہے۔ بیت المعمور، سدرۃ المنتہا اور لوح محفوظ کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔

کتاب شرح لوح و قلم میں تکوینی نظام سے متعلق وہ مخفی علم بیان کئے گئے ہیں جو اس سے پہلے آج تک کسی کتاب میں بیان نہیں کئے گئے ہیں۔ قیمت: -/175 روپے

الکتاب پبلی کیشنز

1-k-5 ناظم آباد۔ کراچی، فون: 6622784-636433

رنگ اور روشنی سے علاج
ترمیم واضافہ شدہ
جناب خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے خط و کتابت کے
ذریعہ ایک لاکھ سے زائد افراد کے ذہنی اور جسمانی مسائل کا روحانی، نفسیاتی
اور طبی حل پیش کر کے عوام کی گراں مایہ خدمت انجام دی ہے۔
خواجہ صاحب نے اپنے اس تجربہ کی روشنی میں ایک کتاب
"رنگ اور روشنی سے علاج" تحریر کی ہے۔ علاج میں خرچہ
صرف پانی کا ہے، گھر کا ہر فرد اس کتاب سے اپنا علاج خود
کر سکتا ہے، اس کتاب میں تقریباً ہر مرض کا آسان علاج پیش کیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ بیماریوں اور پریشانیوں سے متعلق نگینے، پتھر اور
جواہرات کے خواص بھی بیان کئے گئے ہیں۔
قیمت: 40روپے
ناشر مکتبہ تاج الدین بابا ۔ 1-ڈی 1/2 ناظم آباد کراچی 18

روحانیت کے موضوع پر لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں ایک نام سعیدہ خاتون عظیمی کا بھی ہے۔ وہ اب تک اندر کا مسافر، روحیں بولتی ہیں اور روحانی ڈائری کے علاوہ اور بہت سی کتابیں لکھ چکی ہیں جو اپنے خاص موضوع اور منفرد طرز تحریر کی وجہ سے قارئین میں بہت پسند کی گئی ہیں۔ "خوشبو" ان کی نئی کتاب ہے جو عشق حقیقی کی داستان بھی ہے اور عشق مجازی کی کہانی بھی۔ یہ ایک ایسی خاتون کی روئیداد ہے جس کے دل میں عالم غیب کا مشاہدہ کرنے اور اللہ کو دیکھنے کا شوق دیوانگی کی حد تک ہے۔ اس نے اپنے اندر روحانی تحریکات اور بشری تقاضوں میں اس طرح توازن قائم کیا کہ اس نے اپنے محبوب کو پانے کے ساتھ ساتھ اپنے اللہ کے عرفان کی سعادت بھی حاصل کرلی۔

سعیدہ خاتون عظیمی اللہ کی دوست ہیں۔ ان کی تحریروں میں ان کی اپنی کیفیات اور مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔ خوشبو بھی ایک روحانی تحریر ہے جسے پڑھ کر قاری کے دل میں روحانی علوم حاصل کرنے اور عالم غیب کا مشاہدہ کرنے کا شوق موجزن ہوجاتا ہے اور اس کتاب سے روحانیت کی راہ پر چلنے والوں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

حکیم سلام عارف عظیمی
نگراں الکتاب پبلی کیشنز